آج

۷۱

جاوید صدیقی
ژولیاں
صدیق عالم

ساؤ پی
شنگ جوشی
یانگ شن

شوکے
لیو اپچنگ
گی ہونگ

ترتیب

اجمل کمال

Scanned with CamScanner

آج

ادبی کتابی سلسلہ شمارہ 71

ستمبر 2011

سالانہ خریداری:

پاکستان: ایک سال (چار شمارے) 700 روپے (بشمول ڈاک خرچ)

بیرون ملک: ایک سال (چار شمارے) 70 امریکی ڈالر (بشمول ڈاک خرچ)

بینک: میزان بینک، صدر برانچ، کراچی

اکاؤنٹ: City Press Bookshop

اکاؤنٹ نمبر: 0100513669

رابطہ:

پاکستان: آج کی کتابیں، 316 مدینہ سٹی مال، عبداللہ ہارون روڈ، صدر، کراچی 74400

فون: 35213916 35650623

ای میل: ajmalkamal@gmail.com

دیگر ممالک:

Dr. Baidar Bakht, 21 White Leaf Crescent, Scarborough,
Ontario M1V 3G1, Canada.
Phone: (416) 292 4391Fax: (416) 292 7374
E-mail: bbakht@rogers.com

Scanned with CamScanner

افتخار نسیم
کی یاد میں

Scanned with CamScanner

ترتیب

جاوید صدیقی
گیارہ خاکے

9
اک بنجارہ
30
جیانی
40
موگرے کی بالیوں والی
63
بڑے پاپا
72
گروجی
97
ممّا اور بجیا
109
ہارے ہوئے لشکر کا سپاہی
136
کرسی خالی ہے!

Scanned with CamScanner

144

ایک تھے بھائی

161

اپنے کامریڈ حبیب

169

اکبری بوا

۞

ژولیاں

191

میراجی کے لیے

(ناول)

۞

صدیق عالم

265

بے ٹکی کہانیاں

(پانچ سلسلہ وار کہانیاں)

Scanned with CamScanner

337

سات چینی حکایات

(انتخاب اور ترجمہ: افضال احمد سید)

ساؤپی

339

زونگ دنگ بو بھوت کو بیچ دیتا ہے

ژنگ جوشی

341

بدخط تحریر

یانگ شن

342

قحط کی خبر

شوکے

343

یہ سب آپ کے وفادار ہیں

لیو ایچنگ

345

وانگ رونگ: ایک ذہین لڑکا

گی ہونگ

346

صوبیدار ما اور عطائی

347

ایک حسینہ کا المیہ

Scanned with CamScanner

جاوید صدیقی

گیارہ خاکے

Scanned with CamScanner

اس شمارے کی ابتدا جاوید صدیقی کے تحریر کردہ گیارہ شخصی خاکوں سے کی جا رہی ہے۔ ممبئی میں مقیم جاوید صدیقی فلمی منظر نامے اور مکالمے اور اسٹیج ڈرامے لکھنے کے لیے شہرت رکھتے ہیں، لیکن پچھلے چند برسوں میں انھوں نے ایسے انسانی کرداروں پر خاکے تحریر کرنے کا سلسلہ جاری رکھا ہے جن سے ان کا زندگی کے مختلف مرحلوں میں مختلف نوعیتوں کا ساتھ رہا۔ ان میں سے چند خاکے ممبئی شہر کے اس ماحول کو سامنے لاتے ہیں جو ترقی پسند ادیبوں کے وہاں جمع ہونے سے قائم ہوا تھا اور جس میں وہ نئی اقدار جاری و ساری تھیں جن کے باعث ان کی تحریروں کو نیا ادب اور ترقی پسند ادب کہا جاتا ہے۔ چند دیگر خاکے ان غیر معروف ہستیوں کے بارے میں ہیں جن سے ان کا ممبئی آنے سے پہلے یوپی کے شہر رامپور میں تعلق رہا تھا جہاں وہ 1942 میں پیدا ہوئے تھے۔ 1959 میں ممبئی آنے کے بعد ان کا تعلق ادب، صحافت، فلم اور تھیٹر سے وابستہ مختلف شخصیات سے رہا جن میں سے چند کے خاکے یہاں شامل ہیں۔ جاوید صدیقی کے خاکے نیا ورق میں شائع ہوتے رہے ہیں اور ان خاکوں پر مشتمل مجموعہ روشن دان ہندوستان میں زیر طبع ہے۔ اس کتاب کا پاکستانی ایڈیشن بھی جلد شائع کیا جائے گا۔

Scanned with CamScanner

اک بنجارا

اگر سوٹ پہنے ہوئے ہوتے اور ذرا سے گورے ہوتے تو کوئی بھی قسم کھا لیتا کہ کارل مارکس زندہ ہو گئے ہیں۔

وہی جھاڑ جھنکار داڑھی، وہی بڑا سا سر، آگے سے اڑے بال اور سر کے پچھلے حصے میں کھچڑی بالوں کی موٹی جھالر جو کانوں کے اوپر سے لٹک کر داڑھی میں شامل ہو گئی تھی۔ بدن بھی کچھ ویسا ہی تھا، یعنی چھوٹے بھی تھے اور موٹے بھی... خدا جانے نیاز حیدر نے اپنا یہ حلیہ خود بنایا تھا یا بن گیا تھا، اصلیت جو بھی ہو وہ دیکھنے میں ہی نہایت مارکسسٹ (Marxist) لگتے تھے۔

میں نے نیاز حیدر کو پہلی دفعہ مظفر علی کے گھر پر دیکھا تھا۔

میں اور شمع زیدی مظفر کے جوہو والے بنگلے کے خوب صورت لاؤنج میں بیٹھے تھے جس میں گدے اور گاؤ تکیے لگے تھے۔ گدوں پر چاندنیاں بچھی تھیں اور رنگین شیشوں والے دروازوں پر باریک کام کی چقیں پڑی ہوئی تھیں۔ مظفر ہمیشہ اس بات کی کوشش کرتے ہیں کہ ان کے گھر میں داخل ہونے والا ہر شخص فوراً سمجھ جائے کہ مظفر اپنا لکھنؤ ہر جگہ اپنے ساتھ لے کر چلتے ہیں۔ ہماری یہ ملاقاتیں تقریباً روز ہی ہوتی تھیں کیونکہ امراؤ جان کی شوٹنگ سر پہ تھی اور اسکرپٹ کی نوک پلک درست کی جا رہی تھی۔ اچانک سبھاشنی نے دروازے میں سے منھ نکالا اور اعلان کیا: "بابا آ رہے ہیں۔" بابا کا نام سنتے ہی مظفر سنبھل کر بیٹھ گئے، آنکھوں میں ایک شریر سی چمک آئی اور ہونٹوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔ شمع نے سر ٹیڑھا کر کے دروازے کی طرف دیکھا اور اپنا قلم بند کر کے تھیلے میں ڈال دیا۔

بڑی اہم اور گرما گرم بحث چل رہی تھی، اس میں اس طرح بریک لگنا مجھے اچھا نہیں لگا۔ غصے میں جس طرح آدھا لیٹا تھا اسی طرح لیٹا رہا۔ آئے جس کو بھی آنا ہے، مجھے کیا؟

چق کے پیچھے سے پہلے ایک نہایت موٹا سا ڈنڈا آیا اور پھر بابا۔ کھادی کا ڈھیلا ڈھالا، گھٹنوں تک لمبا کرتا، جو پہلے کبھی نیلا رہا ہوگا مگر دھلتے دھلتے بادامی ہو گیا۔ بڑے پائنچوں کا میلا سا پاجامہ، کندھے پر کھادی کا جھولا اور معمولی سی دو پٹی والی چپل۔ حلیہ وہی تھا جو اوپر بیان کر چکا ہوں۔ بابا نے چھوٹی چھوٹی چمکتی ہوئی آنکھوں سے سب کو دیکھا، گلے سے خرخر جیسی ایک آواز نکالی اور بولے:

"آہا! شمع بی بی بھی ہیں!"

شمع نے آداب کیا اور کہا "یہ جاوید ہیں۔"

مظفر نے ڈنڈا لے کر کونے میں رکھا اور جہاں خود بیٹھے تھے وہاں بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے ادب سے کہا "بیٹھیے۔۔۔"

بابا نے ایک نگاہ، جو بظاہر نگاہ سے کم تھی، میری طرف ڈالی۔ پلنگ سے سر ملا، اور گاؤ تکیے سے اس طرح ٹک کر بیٹھ گئے جیسے مجلس پڑھنے والے ہوں۔ پھر شمع اندر آ گئیں۔ "کیا لیں گے بابا؟"

"ابھی ہماری ماچس ختم ہوئی ہے!"

"ارے ماچس لاؤ!" مظفر نے آواز لگائی۔

ماچس آ گئی۔ بابا نے کرتے کی جیب سے بیڑی کا بنڈل نکالا، ایک بیڑی منتخب کی اور ماچس جلا کر پہلے بیڑی کو سینکا اور پھر سلگا کر ایک لمبا کش لگایا۔ پھر بیڑی کو انگلیوں میں اس طرح پکڑ لیا جیسے بسم اللہ خاں شہنائی پکڑتے ہیں، اور فرمایا:

"کہاں تک پہنچی کہانی؟"

"اسکرپٹ تو پورا ہو گیا ہے۔ شہریار کا انتظار ہے، آ جائیں تو گانے بھی فائنل ہو جائیں۔"

"اچھا! کسی دن سنانا۔"

"جاوید نے ڈائیلاگ بہت اچھے لکھے ہیں بابا،" مظفر نے کہا

"اچھا! آپ نے پہلے کیا لکھا ہے میاں؟"

"شطرنج کے کھلاڑی کے ڈائیلاگ بھی ہم دونوں نے لکھے تھے،" شمع نے بتایا۔

"ہاں... وہ فلم تھی، پریم چند کی کہانی کا ستیاناس کر کے رکھ دیا... جانے دو... ہاں ڈائیلاگ ٹھیک ٹھاک تھے۔ ان میں زبان کی کوئی غلطی نہیں تھی۔"

غصے میں میرے ہونٹوں تک یک لفظ آیا: ''ایڈیٹ'' مگر منھ سے نکلا: ''شکریہ۔''

بابا اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے اور میں انھیں گھورتا رہا۔ ''یہ ہے کون؟... باتیں تو ایسی کر رہا ہے جیسے سارا ادب ابھی پی کر آ رہا ہو... ڈھونگی!''

بیچ میں تھوڑی سی توجہ بٹ گئی تھی، شاید مظفر کا بیٹا شاد آ گیا تھا اور بابا اس سے باتیں کرنے لگے تھے۔ میں نے موقع پا کر شمع سے پوچھا، ''یہ کون ہیں شمع؟''

''ارے!... تم نہیں جانتے؟ یہ نیاز بابا ہیں... نیاز حیدر...''

''نیاز حیدر؟'' میں دل ہی دل میں اپنا سر پکڑ کے بیٹھ گیا۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ ایسے ہوتے ہیں نیاز حیدر۔

یہ تھی بابا سے میری پہلی ملاقات۔

اس کے بعد بابا سے مسلسل ملاقاتیں ہوتی رہیں، کبھی مظفر علی کے گھر پہ، کبھی شمع کے گھر پر، کبھی کیفی صاحب کے ہاں، اور کبھی پرتھوی تھیٹر پر۔ اور جیسے جیسے نیاز بابا کے ساتھ ملاقاتیں بڑھیں، میری نیاز مندی بھی بڑھتی گئی۔ جیسے جیسے میں ان کے قریب آتا گیا، یا یوں کہنا چاہیے، جیسے جیسے وہ میرے قریب آتے گئے، مجھ پر راز کھلتا گیا کہ بابا تو بڑے باکمال آدمی ہیں؛ اور اس بات پہ حیرت اور افسوس بھی ہوا کہ دنیا ان کے بارے میں کتنا کم جانتی ہے۔ بابا اچھائیوں اور برائیوں کا عجیب و غریب مجموعہ تھے۔ ان کی باتیں سن کر کبھی ڈر لگتا تھا اور کبھی عقیدت سے سر جھکا لینے کو جی چاہتا تھا۔

اللہ جانے کہاں تک پڑھا تھا، کوئی ڈگری وگری بھی تھی یا نہیں مگر بہت کم subjects ایسے تھے جن پر وہ نہیں بول سکتے تھے۔ زبانیں بھی بہت ساری جانتے تھے۔ اردو، فارسی، عربی اور انگلش تو جانتے ہی تھے، تھوڑی بہت سنسکرت، کچھ لیٹن اور تلگو بھی جانتے تھے؛ اور بولیوں ٹھوییوں کا تو ذکر ہی کیا، اودھی سے لے کر بھوجپوری تک اچھی طرح سمجھتے تھے، بلکہ سمجھا بھی سکتے تھے۔ حافظہ اس غضب کا تھا کہ خوف آنے لگتا تھا۔ شاعر کا نام لیجیے اور کلام کا نمونہ حاضر ہے۔ اقبال ان کے پسندیدہ شاعر تھے۔ میرا خیال ہے انھیں اقبال کا سارا فارسی اور اردو کلام یاد تھا۔ بانگ درا سے ضرب کلیم تک یوں مزے لے لے کے سنایا کرتے تھے جیسے ابھی رٹ کے آئے ہوں۔ بابا کے اپنے کلام میں بھی لفظوں کا جو آہنگ ملتا تھا، ان میں اقبال کی گونج سنائی دیتی تھی۔ یہ کمزوری تھی یا خوبی، دانستہ ایسا

Scanned with CamScanner

کرتے تھے یا اُن کا شعور اپنا عمل دکھاتا تھا، کچھ کہا نہیں جا سکتا۔ میں اکثر انھیں چھیڑنے کے لیے اقبال کے خلاف کچھ نہ کچھ کہہ دیا کرتا تھا۔ ایک دفعہ میں نے کہا: ''اقبال تو شاعرِ اسلام ہیں، میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ اور سردار جعفری جیسے کٹر مارکسسٹ ان کی پوجا کیوں کرتے ہیں؟'' بابا غصے میں لال پیلے ہوگئے اور پورے دو گھنٹے کا ایک عظیم الشان لیکچر دیا جس میں ثابت کیا کہ اقبال نہایت ترقی پسند شاعر تھے۔

ان کی فارسی کا بھی یہی عالم تھا۔ ایک دن میں نے قاآنی کے قصیدے کا ذکر کیا جو میں نے منشی کامل کے کورس میں پڑھا تھا، اور جس کا ایک ہی شعر یاد رہ گیا تھا:

بگردوں تیرہ ابرے بامداداں بر شد از دریا
جواہر خیز و گوہر بیز و گوہر ریز و گوہر زا

سنتے ہی بابا کی آنکھوں میں چمک آ گئی۔ سنبھل کر بیٹھے، ایک ہاتھ سے زلفوں کو سنوارا، دوسرے ہاتھ سے ہوا میں چھڑی ہلائی اور قاآنی کا قریب سو اشعار کا قصیدہ فرفر سنا دیا۔ یہی نہیں بلکہ اس زمین میں عرفی اور نظیری نے بھی جو کچھ کہا تھا وہ بھی سنا دیا۔ آپ سوچ سکتے ہیں میری کیا حالت ہوئی ہوگی۔ کبیر کے دوہے، تلسی داس کی چوپائیاں اور غالب کے شعر تو باتوں کے بیچ میں پکے ہوئے آموں کی طرح ٹپکتے ہی رہتے تھے۔ بابا کے غیر معمولی حافظے اور مطالعے کا اثر ان کی تحریروں میں صاف جھلکتا ہے۔ انھوں نے بہت کم لکھا، مگر جو کچھ بھی لکھا خوب لکھا۔

جب قدسیہ زیدی نے برتول بریخت کے ناٹک Caucasian Chalk Circle کا ترجمہ سفید کنڈلی کے نام سے کیا تو گیت نیاز بابا سے لکھوائے۔ اس ناٹک میں ان کے لکھے ہوئے کئی گیت، ''سن میرا افسانہ رے بھائی''..... ''چار سورما، چار جرنیل، چلے ایران'' اور ''سپاہی جلدی آنا'' ایک زمانے میں فلمی گانوں کی طرح مشہور ہو گئے تھے۔ بابا کی تحریر میں بھی بڑا دم خم تھا۔ مظفر علی کی سیریل جانِ عالم اور شیام بینیگل کی فلم آروہن میں زبان اور بیان پر بابا کی قدرت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

بابا کو قصے کہانیاں سنانے کا بڑا شوق تھا۔ خاص بات یہ تھی کہ سنی سنائی نہیں سناتے تھے؛ زیادہ تر قصے ان کے اوپر گزرے ہوئے حادثات یا ان کے سامنے ہونے والے واقعات ہوتے تھے۔

Scanned with CamScanner

ایک بار انھوں نے ایک کم عمر طوائف کی کہانی سنائی تھی، اور اس طرح سنائی تھی کہ آج تک مجھے یاد ہے اور دل پر اس کا اثر بھی ہے۔

بابا نے بتایا تھا کہ: حیدرآباد میں ناچنے گانے اور جسم فروشی کرنے والوں کے بازار کا نام ''محبوب کی مہندی'' ہے۔ اور یہاں ایک بڑی مزے دار رسم ہوتی ہے، جسے ''دریچے کی سلامی'' کہا جاتا ہے۔ جب کوئی کم سن طوائف اس عمر کو پہنچتی ہے جب جسم کے خدوخال نمایاں ہونے لگتے ہیں، ہونٹ مسکرانے لگتے ہیں اور آنکھوں میں ایک شرارت بھری چمک آجاتی ہے، تو اسے ''دریچے کی سلامی'' کے لیے تیار کیا جاتا ہے۔ کئی دن پہلے سے جشن شروع ہوتا ہے۔ صاحب ذوق اور صاحب نظر سرپرستوں کو خبر بھجوائی جاتی ہے۔ دور دور تک نیوتے جاتے ہیں۔ عزیز، رشتے دار، پڑوسی اور ہم پیشہ خواتین جمع ہونا شروع ہوجاتی ہیں۔ رتجگے ہوتے ہیں، پکوان پکتے ہیں۔ مسلمان طوائفوں کے کوٹھوں پر مجلسیں اور میلاد شریف بھی ہوتے ہیں۔ جس لڑکی کی رسم ہونے والی ہوتی ہے اس کی ناک میں ایک بڑی سی نتھ پہنا کر سات درگاہوں پر لے جایا جاتا ہے۔ اور پھر اسے دلہن بنایا جاتا ہے، حیثیت کے مطابق زیور، کپڑے پہنائے جاتے ہیں، پھولوں کے زیوروں سے سجایا جاتا ہے۔ اور جب سورج کے جانے اور شمعوں کے آنکھیں کھولنے کا وقت ہوتا ہے تو کم سن طوائف کی آرتی اتاری جاتی ہے، نظر کا ٹیکہ لگایا جاتا ہے۔ اور وہ اس دریچے کو جو آئندہ زندگی میں اسے روزی روٹی اور خوشی دینے والا ہے، جھک کر سات سلام کرتی ہے اور جھروکے میں بیٹھ کر ایک نئی روشنی میں ان لاتعداد تماش بینوں کو دیکھتی ہے جن میں سے بہت سے وہ ہوتے ہیں جن کی آنکھوں میں دل ہوتے ہیں، اور بہت سے وہ بھی ہوتے ہیں جن کے پاس دل نہیں ہوتے مگر جیب میں مال بہت ہوتا ہے۔ اور پھر نتھ اتارنے والوں کی بولی لگتی ہے۔

بابا نے جس لڑکی کی کہانی سنائی تھی اس کا کلائمکس یہ نہیں تھا۔ انھوں نے کہا تھا کہ جب اس لڑکی کو دریچے پر لا کے بٹھایا گیا تو وہ بہت دیر تک چپ چاپ بیٹھی رہی۔ اچانک وہ کھڑی ہوئی اس نے دریچے کی جالی کو ہاتھ لگا کر اپنے ماتھے کو چھوا اور ایک دم سے نیچے چھلانگ لگا دی۔ اس بازار میں پہلے کبھی ایسا نہیں ہوا تھا، اس لیے چاروں طرف سنسنی پھیل گئی۔ جس نے سنا وہ دوڑا آیا تاکہ اس پاگل لڑکی کو دیکھ سکے جس نے شہرت اور دولت کی بلندی سے کود کر خودکشی کرنے کی کوشش کی تھی۔ وہ لڑکی

Scanned with CamScanner

مری نہیں، بچ گئی۔ مگر اس کی ٹانگیں ٹوٹ گئی تھیں۔ بعد میں وہ لڑکی ننھی خورشید کے نام سے مشہور ہوئی اور اپنے زمانے میں "محبوب کی مہندی" کی بے حد مقبول گانے والیوں میں شمار ہوتی تھی۔

مجھے بابا کا سنایا ہوا ایک اور قصہ یاد آرہا ہے۔

ہوا یوں کہ بابا دلی میں تھے۔ ایک دن ان کا فون آیا اور انھوں نے بتایا کہ وہ بمبئی آرہے ہیں۔ انھوں نے اپنی روانگی کا دن اور تاریخ بتلائی اور طے کیا کہ دو دن بعد مجھ سے ملاقات کریں گے۔ دو دن گزر گئے... چار دن گزر گئے... ہفتہ ہونے کو آیا مگر بابا کا کوئی پتا نہیں تھا۔ میں نے ادھر ادھر معلوم کیا تو بتایا گیا کہ بابا تو آئے ہی نہیں ہیں۔ میں نے دلی فون کیا تو خبر ملی کہ وہ وہاں سے روانہ ہو چکے ہیں۔ اب ہم سب ذرا پریشان ہوئے۔ معاملہ پریشانی کی کوئی بات نہیں تھی کیونکہ وہ اکثر ایسی حرکتیں کیا کرتے تھے۔ نکلتے تھے کہیں جانے کے لیے اور پہنچ جاتے تھے کہیں اور۔ مگر ڈر یہ بھی تھا کہ وہ ٹرین میں اکیلے تھے۔ انھیں سانس کی بیماری تھی، اور بلڈ پریشر بھی۔ اگر راستے میں کچھ ہو گیا ہوگا تو کیا ہوگا۔ مگر سوائے صبر کرنے اور پریشان ہونے کے راستہ بھی کیا تھا۔ چنانچہ چپ چاپ بیٹھے رہے اور دعائیں کرتے رہے کہ بڑے میاں خیریت سے پہنچ جائیں۔

کئی دن بعد اچانک شریف کے گھر پر نمودار ہوئے۔ میں اور شریف تو ان پر برس ہی پڑے۔ "یہ کوئی طریقہ ہے؟ اگر بمبئی نہیں آنا تھا تو فون کیوں کیا تھا؟... اور اگر ارادہ بدل گیا تھا تو دوسرا فون کرکے کیوں نہیں بتایا؟"

بابا پر ہماری ڈانٹ ڈپٹ کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ وہ بڑے پیار سے مسکرائے۔ "ارے چھوڑو یار، ایک اچھی والی چائے پلاؤ تو ایک ایسا قصہ سناتا ہوں کہ اس پر فلم بن سکتی ہے۔"

بابا نے سنایا کہ: "میرٹھ کے پاس گرانڈ ٹرنک روڈ کے دونوں طرف آمنے سامنے دو گاؤں ہیں۔ گاؤں کا نام تو اب مجھے یاد نہیں رہا، مگر نام ایک ہی تھا، ایک گاؤں خورد (چھوٹا) کہلاتا تھا، دوسرا کلاں (بڑا)۔ جو گاؤں بڑا تھا وہ ہندوؤں کا تھا اور چھوٹے گاؤں میں مسلمانوں کی آبادی زیادہ تھی۔ وہاں کوئی سوا سو سال سے ایک عجیب و غریب رسم ادا کی جاتی ہے۔ ہر بقر عید پر ہندو گاؤں سے ایک گائے قربانی کے لیے مسلم گاؤں میں بھیجی جاتی ہے۔ بقر عید کے دن سویرے سویرے ہندو گاؤں میں گائے کو سجایا سنوارا جاتا ہے، اس کی پیٹھ پر نئی جھول ڈالی جاتی ہے، گلے میں ہار ہوتے ہیں، سینگ

Scanned with CamScanner

اور دم پر رنگین ربن اور گوٹے سے سجاوٹ کی جاتی ہے، اس کی آرتی اتاری جاتی ہے، اور پھر یہ گائے بینڈ باجے اور سیکڑوں گاؤں والوں کے ساتھ کسی دلہن کی طرح مسلمانوں کے گاؤں میں لائی جاتی ہے۔ گاؤں کے مسلمان گائے کا ہار پھول سے خیر مقدم کرتے ہیں۔ ساتھ میں آنے والوں کو مٹھائیاں بانٹی جاتی ہیں۔ پھر گائے کو ایک چبوترے پر کھڑا کر دیا جاتا ہے، جس کے چاروں طرف سارے گاؤں والے جمع ہو جاتے ہیں۔ گاؤں کا قصائی، گائے کی گردن پر چھری رکھتا ہے اور کلمہ پڑھ کے ہٹا لیتا ہے۔ پھولوں سے لدی پھندی گائے اور اس کے ساتھ آنے والے تحفے اور مٹھائیاں لے کر اپنے گاؤں واپس آجاتے ہیں۔''

بابا نے بتایا کہ: ''جب انگریز ہندو اور مسلمانوں کو لڑانے کے لیے گائے کے ذبیحے کا مسئلہ چھیڑ رہے تھے اور جگہ جگہ ہندو مسلم فساد ہو رہے تھے، اس وقت اس چھوٹے سے گاؤں کے زمیندار نے کہا کہ ہم اپنی گائے قربانی کے لیے دے سکتے ہیں مگر اپنی ایکتا کی قربانی نہیں دے سکتے اور تب سے یہ خوبصورت رسم ہر سال اسی طرح نبھائی جاتی ہے۔'' (کسی قاری کو جی ٹی روڈ پر بسے ہوئے ان دو گاؤوں کے بارے میں علم ہو تو مجھے ضرور اطلاع دے، ممنون ہوں گا۔) بابا کو یہ کہانی کسی نے ٹرین میں سنائی تھی اور موصوف روایت کی تحقیق کرنے اس گاؤں میں جا پہنچے تھے۔

بابا مزاج کے اعتبار سے کافی بوہیمین (Bohemian) تھے۔ انھوں نے زندگی بھر گھر بنانے یا گھر بسانے کی کوئی کوشش نہیں کی۔ وہ زندگی کی تیز رو ندی میں ایک تنکے کی طرح تھے جو خود کو لہروں کے سہارے چھوڑ دیتا ہے اور ہمیشہ ایک بے منزل سفر میں مبتلا رہتا ہے۔ غالب نے شاید نیاز بابا کے لیے ہی کہا تھا:

رو میں ہے رخشِ عمر کہاں دیکھیے تھمے
نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں

وہ اکثر کہا کرتے تھے، ''میں تو بنجارا ہوں، بنجارا، خانہ بدوش...''

میری سمجھ میں آج تک نہیں آیا کہ بابا میں کیا خاص بات تھی جس کی وجہ سے جو بھی ان سے ملتا تھا، انھی کا ہو جاتا تھا۔ بابا کے چاہنے والے ہزاروں تھے اور بھانت بھانت کے تھے: سجاد ظہیر سے لے کر قدسیہ زیدی تک، مظفر علی سے لے کر شیام بینیگل تک، اور ششی کپور سے لے کر شمع زیدی تک۔

Scanned with CamScanner

کبھی کبھی ایک آدھ جھلک بابا کی شخصیت میں چھپی ہوئی مقناطیس کی کہانی بھی دے جاتی تھی۔

ایک شام میں کوئی ناٹک دیکھ کر رکسوی تھیٹر سے باہر نکلا تو دیکھا کہ پتھر کی سیڑھیوں پر بابا بیٹھے ہوئے ہیں اور ہاتھوں میں بیڑی سلگ رہی ہے۔ دیکھتے ہی کھڑے ہو گئے، بڑے پیار سے گلے لگایا اور کہنے لگے: "ارے یار جاوید! بہت اچھا ہوا جو تم مل گئے، میں تمھیں کو یاد کر رہا تھا۔ دلہن کہاں ہے؟" (میری بیوی فریدہ۔)

میں نے عرض کیا: "وہ تو آج نہیں آئیں۔"

ہنسنے لگے: "ارے یہ تو بڑا نقصان ہو گیا۔" میرے پوچھنے پر بولے: "بس دلہن تو ہے وہ ہماری خزانچی ہے۔ جب بھی پیسوں کی ضرورت ہوتی ہے اس سے لے لیتے ہیں۔ تمھارے پاس تو ہوں گے نہیں۔"

میں نے کہا: "تھوڑے سے بہت ہیں۔ آپ کو کتنے چاہییں؟"

ہنسنے لگے: "ہمیں تو ایک پیسہ بھی نہیں چاہیے۔ بس شراب پینی ہے، اگر پلا سکو تو پلا دو، اللہ بھلا کرے گا۔"

میں اور بابا جلدی جلدی تھیٹر سے باہر نکلے۔ وہیں قریب میں ایک بار تھا، اس میں گھس گئے۔ بار کا بنگالی مالک لپکتا ہوا آیا، بابا کی خیریت پوچھی، پھر دریافت کیا: "کیا پییں گے؟"

بابا نے بڑی ادا سے کہا: "وہسکی!"

بنگالی کچھ پریشان ہو گیا۔ "وہسکی؟"

بابا مسکرائے اور بولے: "آج جاوید میاں پلا رہے ہیں، اس لیے ہم انھیں پییں گے۔"

بنگالی پریشانی سے ادھر ادھر دیکھتا رہا، پھر دھیرے سے بولا: "بابا، آج وہسکی تو آپ کو نہیں مل سکتا۔"

"کیوں نہیں مل سکتا؟"

"آج ڈرائی ڈے ہے بابا!"

بابا پریشان ہو گئے۔ "اب اس سرکاری کمینے پن کو کیا کہا جائے کہ جس لیڈر کی یاد میں 'ڈرائی ڈے' منایا گیا ہے، وہ بہت بڑا انسان تھا، اس کی موت کا غم دور کرنے کے لیے شراب سے بڑھ کر کوئی

Scanned with CamScanner

چیز نہیں ہو سکتی۔ مگر ان گدھوں کو کون سمجھائے کہ جنھیں پیا سا مار رہے ہیں وہ مرنے والے کو یاد نہیں کریں گے فریاد کریں گے۔۔۔"

بنگالی سر کھجاتا ہوا چلا گیا۔ میں نے پوچھا: "اب؟"

تھوڑی دیر سوچتے رہے، پھر پوچھا: "کیا بجا ہے؟"

میں نے کہا: "دس بج رہے ہیں۔"

کہنے لگے: "چلو کیفی کے گھر چلتے ہیں، وہ پی رہا ہوگا۔"

ہم دونوں پیدل چلتے ہوئے واپس جانکی کٹیر پہنچے اور کیفی صاحب کے دروازے پر لگے ہوئے جہانگیری گھنٹے کی رسی کھینچی۔ گھنٹہ دیر تک بجتا رہا مگر کوئی گیٹ کھولنے نہیں آیا۔

میں نے کہا: "بابا، اندر اندھیرا ہے۔ لگتا ہے، کیفی صاحب باہر گئے ہیں۔"

بابا نے اچک کر اندر جھانکا، اپنے موٹے سے ڈنڈے سے لکڑی کے گیٹ کو ٹھونکا اور فرمایا، "کمرہ بند کرکے بیٹھا ہوگا۔ آج ذرا سردی ہے نا!"

دیر تک گھنٹہ بجانے کے بعد ایک نوکر آنکھیں ملتا ہوا نمودار ہوا اور گیٹ کھولے بغیر ہی کہنے لگا: "صاحب اور آپا بمبئی گئے ہوئے ہیں۔"

"کب آئیں گے؟"

"یہ تو معلوم نہیں۔"

بابا کچھ جھنجھلا سے گئے۔ دھیرے دھیرے آگے بڑھے، اچانک آنکھوں میں چمک آئی۔ کہنے لگے: "عادل۔"

وشوامتر عادل کا گھر سامنے ہی تھا، مگر ان کے برآمدے میں بھی ایک ننھا سا بلب جل رہا تھا جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ لوگ بھی نہیں ہیں۔

بابا نے سر ہلایا۔ "یہ بھی نہیں ہے لگتا ہے کیفی کے ساتھ گیا ہوگا۔"

میں نے گھڑی دیکھی۔ گیارہ بجنے والے تھے۔ پرتھوی کا کراؤڈ بھی جا چکا تھا۔ میں نے بابا کی طرف دیکھا۔ اچانک رکے۔ کہنے لگے: "رکشا پکڑ لو، مجروح صاحب کے گھر چلتے ہیں۔ ذرا سے کنجوس ضرور ہیں مگر اتنے کنجوس بھی نہیں ہیں کہ گھر آئے مہمانوں کو دو پیگ نہ پلا سکیں۔۔۔ چلو چلو، جلدی

Scanned with CamScanner

کرو۔"

مجروح صاحب کا بنگلہ جوہو کے جنوبی کنارے پر تقریباً آخری بنگلہ تھا، لیکن زیادہ دور نہیں تھا اس لیے جلدی سے پہنچ گئے۔ گھنٹی بجائی، دروازہ کھلا۔ فردوس بھابھی نے بڑے تپاک سے بابا کا استقبال کیا اور ڈرائنگ روم میں بٹھایا۔ بابا کے چہرے کی مسکراہٹ کہہ رہی تھی: "دیکھا، آخر کامیابی نے قدم چوم ہی لیے!"

فردوس بھابھی نے پوچھا: "کیا چاہیں گے نیار بھائی؟"

"مجروح کہاں ہیں؟" بابا نے پوچھا۔

"صبح سے بخار ہے، سو گئے ہیں۔"

بابا کا چہرہ دیکھنے لائق تھا۔ وہ کبھی مجھے دیکھتے تھے، کبھی سامنے کھڑی فردوس بھابھی کو۔ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ دل کی بات زبان پر لائیں یا نہ لائیں۔ اچانک وہ کھڑے ہو گئے۔ "آداب کہہ دینا،" اور جواب کا انتظار کیے بغیر باہر نکل آئے۔

تب تک رات کے بارہ بج رہے تھے اور ہم دونوں جوہو تارا کی سڑک پر ان لٹے ہوئے مسافروں کی طرح چل رہے تھے جن کے پاس نہ سر چھپانے کا ٹھکانا ہوتا ہے اور نہ کوئی امید!

بڑی ہمت کر کے میں نے کہا: "بابا، میں نکل جاؤں؟ کرلا پہنچنا ہے۔ سانتا کروز سے آخری بس مل جائے گی۔"

بابا وہیں بیچ سڑک پر رک گئے اور گرج کر بولے: "بالکل نہیں! اب تو ضد آ گئی ہے، جب تک پی نہیں لیں گے تب تک نہ آپ کہیں جائیں گے اور نہ ہم۔"

میں بول بھی کیا سکتا تھا! ایک تو عقیدت، اوپر سے یہ خوف کہ بڑے میاں کو اکیلا چھوڑ دیا تو خدا جانے کہاں جائیں، کیا کریں، اس لیے چپ چاپ چلتا رہا۔ چلتے چلتے ہم لوگ جوہو بیچ کے پاس آ گئے۔ تب تک بابا کی ساری بیڑیاں ختم ہو چکی تھیں، اور ساری گالیاں بھی! اچانک ان کے چہرے سے ایسی روشنی پھوٹی جیسے ساٹھ واٹ کا بلب جل گیا ہو۔ بہت زور سے میری کمر پر ہاتھ مارا اور کہا، "واپس!"

جوہو کولی واڑہ اور اس کے آس پاس بہت سی چھوٹی موٹی گلیاں ہیں۔ بابا ایسی ایک گلی میں

Scanned with CamScanner

گھس گئے۔ دور دور تک اندھیرا تھا، دو چار بلب جل رہے تھے مگر وہ روشنی دینے کے بجائے تنہائی اور سناٹے کے احساس کو بڑھا رہے تھے۔ بابا تھوڑی دور چلتے، پھر رک جاتے، گھروں کو غور سے دیکھتے اور آگے بڑھ جاتے۔ اچانک وہ رک گئے۔ سامنے ایک کمپاؤنڈ تھا جس کے اندر دس بارہ گھر دکھائی دے رہے تھے۔ ان میں سے کوئی بھی گھر ایک منزل سے زیادہ نہیں تھا، اور بیچ میں چھوٹا سا میدان پڑا ہوا تھا جس میں ایک کنواں بھی دکھائی دے رہا تھا۔ بابا نے کہا، ''یہی ہے۔'' اور گیٹ کے اندر گھس گئے۔ میں بھی پیچھے پیچھے تھا مگر ڈر رہا تھا کہ آج یہ حضرت ضرور پٹوائیں گے۔ بابا کمپاؤنڈ کے بیچ میں کھڑے ہو گئے۔ چاروں طرف سناٹا تھا۔ کسی گھر میں روشنی نہیں تھی۔ بابا نے زور سے آواز لگائی:
''لارنس...''

کہیں سے کوئی جواب نہیں آیا۔ میرا خوف اور بڑھنے لگا کولیوں کی بستی ہے، وہ لوگ ویسے ہی سر پھرے ہوتے ہیں، آج تو پٹائی یقینی ہے۔

بابا زور زور سے پکار رہے تھے: ''لارنس... لارنس!...''

اچانک ایک جھونپڑے نما گھر میں روشنی ہوئی، دروازہ کھلا اور ایک لمبا چوڑا، بڑی سی توند والا آدمی باہر آیا، جس نے ایک گندا سا نیکر اور ایک دھاری دار بنیان پہن رکھا تھا۔ جیسے ہی اس نے بابا کو دیکھا، ایک عجیب سی مسکراہٹ اس کے چہرے پر پھیل گئی۔ ''ارے بابا، کدھر ہے تم؟ کتنا ٹائم کے بعد آیا ہے؟'' یہ کہتے کہتے اس نے بابا کو دبوچ لیا اور پھر زور زور سے گوانی زبان میں چیخنے لگا۔ اس نے بابا کا ہاتھ پکڑا اور اندر کی طرف کھینچنے لگا۔ ''آؤ آؤ، اندر بیٹھو... چلو چلو۔'' پھر وہ میری طرف مڑا۔ ''آپ بھی آؤ ساب! آجاؤ، آجاؤ، اپنا ہی گھر ہے۔''

ہم تینوں ایک کمرے میں داخل ہوئے جہاں دو تین میزیں تھیں، کچھ کرسیاں اور ایک صوفہ۔ اندر ایک دروازہ تھا جس پر پردہ پڑا ہوا تھا۔ بابا پوچھ رہے تھے، ''کیسا ہے تو، لارنس؟... ماں کیسی ہے؟... بچہ لوگ کیسا ہے؟'' اتنی دیر میں اندر کا پردہ کھلا اور بہت سے چہرے دکھائی دینے لگے۔ ایک بوڑھی عورت ایک میلی سی میکسی پہنے باہر آئی اور بابا کے پیروں پر جھک گئی۔ بابا نے اس کی خیر خیریت پوچھی، بچوں کے سر پہ ہاتھ پھیرا، اور جب یہ ہنگامہ ختم ہوا تو لارنس نے پوچھا، ''کیا پییں گے بابا؟''

''وِسکی۔'' بابا نے کہا۔

لارنس اندر گیا اور وسکی کی ایک بوتل ٹیبل پہ لا کے رکھ دی۔ اس کے ساتھ دو گلاس تھے، کچھ چنے، کچھ نمک، سوڈے اور پانی کی بوتلیں۔ بابا نے پیگ بنایا۔ لارنس الہ دین کے جن کی طرح ہاتھ باندھ کر سامنے کھڑا ہو گیا۔ "اور کیا کھانے کا ہے بابا؟... ماں مچھی بناتی، اور کچھ چاہیے تو بولو... کومڑی (مرغی) کھانے کا موڈ ہے؟"

بابا نے مجھ سے پوچھا: "بولو بولو بھئی، کیا کھاؤ گے؟"

میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ بابا کی اتنی آؤ بھگت کیوں ہو رہی ہے۔ اگر ایسا ہی ہوتا کہ وہ لارنس کے مستقل گراہکوں میں سے ایک ہوتے تو بھی رات کے دو بجے ایسی خاطر تو کہیں نہیں ہوتی۔ یہاں تو ایسا لگ رہا تھا جیسے بابا اپنی سسرال میں آ گئے ہوں۔

تھوڑی دیر میں تلی ہوئی مچھلی بھی آ گئی، ابلے ہوئے انڈے بھی، اور پاؤ بھی۔ بہر حال مجھ سے برداشت نہیں ہوا، کھانا کھاتے ہوئے میں نے بابا سے پوچھا: "بابا، اب اس راز پر سے پردہ اٹھا ہی دیجیے کہ اس لارنس اور اس کی ماں سے آپ کا کیا رشتہ ہے؟"

کہانی یہ سامنے آئی کہ برسوں پہلے جب بابا اپنی ہر شام لارنس کے اڈے پر گزارا کرتے تھے تو ایک دن، جب لارنس کہیں باہر گیا ہوا تھا، اس کی ماں کے پیٹ میں درد اٹھا تھا۔ درد اتنا شدید تھا کہ وہ بیہوش ہو گئی تھی۔ اس وقت بابا اسے اپنے ساتھ لے کر اسپتال پہنچے۔ پتا لگا کہ اپنڈکس پھٹ گیا ہے۔ کیس بہت سیریس تھا، آپریشن اسی وقت ہوتا تھا ورنہ موت یقینی تھی۔ بابا نے ڈاکٹر سے کہا، "آپ آپریشن کی تیاری کیجیے۔" اور نہ جانے کہاں سے اور کن دوستوں سے پیسے جمع کر کے لائے، بڑھیا کا آپریشن کرایا اور جب لارنس اسپتال پہنچا تو اسے خوش خبری ملی کہ اس کی ماں موت کے دروازے پہ دستک دے کے واپس آ چکی ہے۔ تھینکس ٹو نیاز بابا۔

اس کہانی میں ایک خاص بات یہ ہے کہ لارنس اور اس کی ماں کے بار بار خوشامد کرنے کے باوجود بابا نے وہ پیسے کبھی واپس نہیں لیے جو انھوں نے اسپتال میں بھرے تھے۔

صبح تین بجے کے قریب جب میں بابا کو لے کر باہر نکل رہا تھا تو میں نے پلٹ کر دیکھا تھا۔ لارنس کی ماں اپنی آنکھیں پونچھ رہی تھی اور لارنس اپنے ہاتھ جوڑے سر جھکائے اس طرح کھڑا تھا جیسے کسی چرچ میں کھڑا ہو۔

Scanned with CamScanner

بابا کا ایک مزے دار قصہ ہری بھائی (سنجیو کمار) نے مجھے سنایا تھا۔

جب تک وشوامتر عادل بمبئی میں رہے، ہر سال اپٹا (IPTA) کی 'دعوتِ شیراز' ان کے گھر پر ہوتی رہی۔ ہر نیا اور پرانا اپٹا والا اپنا کھانا اور اپنی شراب لے کر آتا تھا اور اس محفل میں شریک ہوتا تھا۔ ساری شراب اور سارے کھانے ایک بڑی سی میز پر چن دیے جاتے۔ جس کا جو جی چاہتا کھالیتا اور جو پسند آتا وہ پی لیتا۔ یہ ایک عجیب وغریب محفل ہوتی تھی جس میں گانا بجانا، ناچنا، لطیفے، ڈرامے، سبھی کچھ ہوتا تھا، اور بہت کم ایسے اپٹا والے تھے جو اس میں شریک نہ ہوتے ہوں۔ ایسی ہی ایک 'دعوتِ شیراز' میں ہری بھائی نیاز بابا سے ٹکرا گئے۔ اور جب پارٹی ختم ہوئی تو اپنے ساتھ اپنے گھر لے گئے۔ ہری بھائی دیر سے سوتے تھے اور دیر سے جاگتے تھے، اس لیے وہاں بھی صبح تک محفل جمی رہی۔ پتا نہیں کس وقت ہری بھائی اٹھ کے سونے کے لیے چلے گئے اور بابا وہیں قالین پہ دراز ہو گئے۔

دوسرے دن دوپہر میں ہری بھائی سو کر اٹھے اور حسبِ معمول تیار ہونے کے لیے اپنے باتھ روم میں گئے۔ مگر جب انھوں نے پہننے کے لیے اپنے کپڑے اٹھانے چاہے تو حیران ہو گئے، کیونکہ وہاں بابا کا میلا کرتا پاجامہ رکھا ہوا تھا اور ہری بھائی کا سلک کا کرتا اور لنگی غائب تھے۔ ہری بھائی نے نوکر سے پوچھا تو تصدیق ہو گئی کہ وہ مہمان جو رات کو آئے تھے، صبح سویرے نہا دھو کر، سلک کا لنگی کرتا پہن کے رخصت ہو چکے ہیں۔

کہانی یہاں ختم نہیں ہوتی ہے۔

اس کہانی کا دوسرا حصہ یہ ہے کہ کچھ دو مہینے بعد ایک دن اچانک نیاز بابا ہری بھائی کے گھر جا دھمکے اور چھوٹتے ہی پوچھا، ''ارے یار ہری! پچھلی دفعہ جب ہم آئے تھے تو اپنا ایک جوڑ کپڑا چھوڑ گئے تھے، وہ کہاں ہے؟''

ہری بھائی نے کہا، ''آپ کے کپڑے تو میں نے دھلوا کے رکھ لیے ہیں مگر آپ جو میرا لنگی کرتا پہن کے چلے گئے تھے وہ کہاں ہے؟''

بابا نے بڑی معصومیت سے اپنی داڑھی پر ہاتھ پھیرا، سر کھجایا اور بولے، ''ہمیں کیا معلوم تمھارا لنگی کرتا کہاں ہے! ہم کوئی ایک جگہ کپڑے تھوڑی بدلتے ہیں۔''

Scanned with CamScanner

ہری بھائی جب بھی یہ قصہ سناتے تھے، بابا کا جملہ یاد کر کے بے تحاشا ہنسنے لگتے تھے۔

بابا کے چھوٹے موٹے چٹکلے تو واقعے ہیں کہ ایک کتابچہ تیار ہو سکتا ہے، مگر چلتے چلتے ایک ایسا قصہ سن لیجیے جس سے ان کی شخصیت کے ایک اور گوشے پر روشنی پڑ جاتی ہے۔

ایک دن بابا ملے تو بہت کھلے کھلے سے تھے، کچھ دھلے دھلائے بھی لگ رہے تھے۔ میں نے وجہ پوچھی۔ کہنے لگے، ''ارے تمھیں نہیں معلوم؟ شیام ہم سے اپنی فلم لکھوا رہا ہے۔''

پوچھا، ''شیام کون؟''

کہنے لگے، ''اُفوہ، شیام بینیگل، اور کون؟... بھئی بہت اچھا آدمی ہے۔ جتنا اچھا ڈائریکٹر ہے اس سے بھی زیادہ اچھا انسان ہے۔ اس نے ہمیں اپنی آفس میں ایک میز دے دی ہے اور ہوٹل میں کھانے کا بندوبست کر دیا ہے۔ صبح جاتے ہیں تو میز پر بیڑی کے دو بنڈل اور ایک ماچس بھی رکھی ہے۔ اور چائے تو دن بھر آفس میں بنتی ہی رہتی ہے۔ بالفاظِ دیگر، ہم آج کل عیش کر رہے ہیں۔''

میں نے بابا کو مبارک باد دی اور دبی زبان سے کہا، ''آپ کو اپنی صلاحیت دکھانے کا بہترین موقع ملا ہے۔ اسے بیچ میں چھوڑ کے مت بھاگ جانا، جیسا کہ آپ کی عادت ہے۔''

کچھ دن بعد کی بات ہے۔ میں شمع کے گھر بیٹھا ہوا تھا، ہم دونوں کسی اسکرپٹ پر کام کر رہے تھے کہ اچانک آدھمکے۔ نہ جانے کہاں سے آ رہے تھے، بری طرح ہانپ رہے تھے اور کافی اجڑے اجڑے سے لگ رہے تھے۔ جب پانی وانی پی چکے تو ہم نے خیریت پوچھی۔ فرمایا، ''عجیب آدمی ہے، بات کو سمجھتا ہی نہیں ہے۔ ارے، دو وقت کھانے اور دو بنڈل بیڑی سے زندگی تھوڑی گزر سکتی ہے۔''

شمع نے پوچھا، ''کیا شیام نے کچھ کہہ دیا بابا؟''

''ارے کہے تو تب جب سنے۔ وہ سنتا ہی نہیں۔''

''کیا نہیں سنتا؟'' میں نے پوچھا۔

''ارے بھئی، ہمیں پیسے کی ضرورت پڑتی ہے۔ اور بھی تو بچاس ضرورتیں ہیں کہ نہیں؟''

شمع نے کہا، ''مگر۔ بات تو میرے سامنے طے ہوئی تھی کہ آپ کو کیش نہیں دیا جائے گا، کیونکہ آپ اس کی شراب پی ڈالیں گے اور کام ادھورا چھوڑ کے چلے جائیں گے۔''

بابا غصے میں لال ہو گئے۔ بیڑی جو ابھی ابھی سلگائی تھی، اسے چائے کی پیالی میں بجھا دیا اور

گرج کر بولے، ''کیسی باتیں کرتی ہو شمع بی بی! ہماری شراب سے ہمارے کام کا کیا تعلق ہے؟ تم نے تو دیکھا تھا، بیگم صاحبہ [بیگم قدسیہ زیدی، شمع زیدی کی والدہ] کے لیے ہم نے کتنا کام کیا۔ کیا انھوں نے ہماری شراب بند کروائی تھی؟''

شمع اچانک بہت زور سے ہنسیں اور میری طرف مڑ کے بولیں، ''تم کو معلوم ہے، جاوید، ہماری اماں ان سے کیسے کام کرواتی تھیں؟ انھیں کمرے میں بند کر دیتی تھیں اور کھڑکی کے باہر ان کی پہنچ سے دور ایک بوتل رکھ دیا کرتی تھیں اور کہتی تھیں کہ کام ختم کرو گے تبھی یہ بوتل تمھارے پاس آئے گی۔ یہ بہت چیختے چلاتے تھے مگر ہماری اماں پر ان کی کسی بات کا کوئی اثر نہیں ہوتا تھا۔''

بابا کو بھی پرانے دن یاد آ گئے۔ بہت زور سے قہقہہ لگایا اور فرمایا، ''تو ہم کہاں کہتے ہیں کہ کام کے بیچ میں پئیں گے؟ مگر شام کے لیے تو پیسے ملنے ہی چاہییں۔ پیسوں پر ہمیں یاد آیا، ارے بھائی، باہر ایک ٹیکسی کھڑی ہے، اس کا کرایہ بھجوا دینا۔''

میں باہر نکلا۔ ٹیکسی والے سے پوچھا، ''کرایہ کتنا ہوا؟''

کہنے لگا، ''ایک سو ستر روپے۔''

''ایک سو ستر روپے؟'' میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

ٹیکسی والا باہر نکل آیا۔ ''آپ خود دیکھ لو ساب! میٹر ابھی تک چل رہا ہے۔''

مجھے معلوم تھا کہ بابا ورلی پر ایک گیسٹ ہاؤس میں رہتے ہیں۔ مگر یہ وہ زمانہ تھا جب ورلی سے جوہو تک کا ٹیکسی کا کرایہ پچیس تیس روپے ہوتا تھا، اس لیے ایک سو ستر سن کے میری حیرت صحیح تھی۔ میٹر بھی جھوٹ نہیں بول رہا تھا، مگر یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ میں نے کہا، ''مگر میرے بھائی، ورلی سے یہاں تک اتنے بہت سے پیسے کیسے ہو سکتے ہیں؟''

ٹیکسی والا چڑ گیا۔ ''کیا بات کرتے ہیں ساب؟... سویرے نو بجے گاڑی پکڑی تھی، کدھر کدھر جا کے آئے ہیں ساب... بھگاؤں، ماہم، باندرہ، اور سب جگہ پہ میرے کو روک کے رکھا۔''

میں سمجھ گیا اور میں نے چپ چاپ ایک سو ستر روپے ادا کر دیے، مگر غصہ بہت آیا۔ یہ کیا طریقہ ہے! جیب میں پیسے نہیں تو ٹیکسی میں گھومنے کی کیا ضرورت ہے؟... مگر وہ ایسی چھوٹی چھوٹی باتوں کی پروا کرتے تو نیاز حیدر کاہے کو ہوتے۔

Scanned with CamScanner

شیام بابو کو برا بھلا کہنے کا جو سلسلہ شروع ہوا، وہ کئی مہینے جاری رہا۔ جب بھی ملتے، شیام بینیگل کی شان میں ایسے ایسے قصیدے پڑھتے کہ لکھے نہیں جا سکتے۔ شکایت ایک ہی تھی کہ بابا کے چیخنے چلّانے، ڈرانے دھمکانے اور خوشامد کے باوجود شیام بینیگل نے انھیں پیسے نہیں دیے تھے۔

پھر ایک دن یوں ہوا کہ میں حسبِ معمول شمع کے گھر بیٹھا ہوا تھا، جو ایک طریقے سے ہماری آفس بن چکا تھا۔ ایم ایس ستھیو بھی بنگلور سے آئے ہوئے تھے اور کچھ بہت مزے دار باتیں ہو رہی تھیں کہ بابا نمودار ہو گئے۔ اس دن بھی وہ ہانپ رہے تھے اور پسینے میں تر تھے۔ آتے ہی انھوں نے اپنی پھولی ہوئی سانسوں میں شیام کو برا بھلا کہنا شروع کر دیا۔ ''مجھے آج تک کسی نے اتنا پریشان نہیں کیا جتنا اس آدمی نے کیا ہے۔ میری سمجھ میں اس کی کوئی بھی بات نہیں آتی۔''

''اب کیا کر دیا شیام نے؟'' شمع کچھ اکھڑی سی گئیں۔

بابا بیٹھے سے کھڑے ہو گئے، جیب میں ہاتھ ڈالا اور دس ہزار روپے نکال کر بولے: ''یہ دیکھو، اس نالائق آدمی نے یہ روپے مجھے تھما دیے۔ اب تم بتاؤ، میں ان کا کیا کروں؟''

ہم تینوں ایک دوسرے کا منھ دیکھنے لگے۔ کیا آدمی ہے بھئی!... نہیں ملا تھا تو بھی ناراض اور اب ملے پر بھی ناراض۔ شمع نے کہا: ''یہ آپ کے کام کا معاوضہ ہے۔ خرچ کیجیے!...''

''وہی تو پوچھ رہا ہوں، کہاں خرچ کروں؟'' بابا نے پوچھا۔

ستھیو نے اپنی داڑھی کھجائی اور کچھ سوچتے ہوئے بولے: ''آپ کو کسی چیز کی ضرورت نہیں ہے کیا؟''

بابا نے کہا: ''ایسی کوئی ضرورت نہیں ہے کہ اتنے بہت سے پیسوں کی ضرورت پڑے۔''

شمع نے رائے دی۔ ''سب سے پہلے تو آپ اپنے لیے کچھ کپڑے بنوا لیجیے۔''

بابا خوش ہو گئے۔ کہنے لگے: ''ہاں، یہ بہت اچھی بات ہے۔ ہمارے پاس دو ہی کرتے رہ گئے ہیں۔''

''اور کچھ؟'' ستھیو نے پوچھا۔

وہ کچھ دیر سوچتے رہے، پھر بولے: ''حیدرآباد میں میری ایک بہن رہتی ہیں، اگر کسی صورت سے اس کا پتا معلوم ہو سکے تو ایک ہزار روپے ان کو بھجوا دیں۔''

Scanned with CamScanner

"اور کچھ؟"

"اور کچھ نہیں۔"

"تو ایک کام کرتے ہیں،" ستھیو نے کہا۔ "ہزار بن کے، پندرہ سو کپڑے کے، اور یہ باقی کے ساڑھے سات ہزار روپے بینک میں جمع کرا دیتے ہیں۔"

"مگر بینک میں تو ہمارا کھاتہ نہیں ہے۔"

"یہ کون سی بڑی بات ہے؟" ستھیو نے کہا۔ "چلیے اٹھیے۔"

ستھیو بابا کو لے کر اپنے بینک میں گئے اور مبلغ ساڑھے سات ہزار روپے جمع کرا کے بابا کو بھی سرمایہ داروں کی فہرست میں کھڑا کر دیا۔

آپ کو لگ رہا ہوگا کہ یہ دلچسپ کہانی یہاں ختم ہوگئی... جی نہیں! اس کا آخری حصہ باقی ہے۔

اس واقعے کے کوئی تین مہینے بعد ایک دن سہ پہر نیاز بابا شمع کے گھر میں اس طرح وارد ہوئے کہ ان کے آگے آگے ایک دس گیارہ برس کا لڑکا ان کا جھولا اور ڈنڈا اٹھائے ہوئے چل رہا تھا۔ اور پیچھے ایک پتلی دبلی کھادی کی سفید ساڑی میں لپٹی ہوئی سانولی سی لڑکی تھی جس کی عمر ستائیس اٹھائیس سے زیادہ نہیں ہوگی۔

یہ بات تو فوراً سمجھ میں آگئی کہ اپنا وزن اٹھانے کے لیے بابا نے ایک چھوکرا رکھ لیا ہے، مگر یہ لڑکی کون ہے جو کھادی کی سفید ساڑی میں کانگریس سیوادل کی رضاکار معلوم ہوتی ہے؟ وہ لڑکا تو بابا کا سامان رکھ کے کچن کی طرف کھسک گیا، بابا خود دیوان پر پھیل کر بیٹھ گئے اور لڑکی سے کہنے لگے: "جاؤ جاؤ، تم اندر چلی جاؤ اور آرام کرو، بہت تھک گئی ہو۔"

وہ لڑکی بھی بغیر ایک لفظ کہے ہوئے شمع کے بیڈروم میں گئی اور بستر پر جا کے لیٹ گئی۔

دل میں طرح طرح کے خیالات آ رہے تھے۔ کہیں انہونی تو نہیں ہوگئی، بڑے میاں نے اس عمر میں کسی کا ہاتھ تو نہیں تھام لیا؟ مجھے بابا کی حالت بھی بہتر لگ رہی تھی، کپڑے صاف ستھرے تھے اور استری کیے ہوئے تھے، داڑھی اور بالوں پر قینچی چلنے کے آثار دکھائی دے رہے تھے۔ چہرے پر ویسی ہی چمک تھی جیسی پرانے پیتل پہ پالش کرنے کے بعد آتی ہے۔ حد تو یہ تھی کہ ان کے گندے میلے ناخن بھی کٹے ہوئے تھے۔

Scanned with CamScanner

بابا تھے کہ لہک لہک کر اِدھر اُدھر کی باتیں کر رہے تھے مگر میرے دماغ میں وہی لڑکی گھوم رہی تھی جو اندر سو رہی تھی۔ جب سسپنس بہت زیادہ بڑھ گیا تو شمع نے مجھے اشارہ کیا اور میں نے پوچھ ہی لیا: ''بابا، یہ صاحبزادی کون ہیں؟''

''یہ ۔۔۔ یہ میرا ہے۔ بہت پڑھی لکھی لڑکی ہے۔ اس نے ہندی، انگلش اور سنسکرت میں ایم اے کیا ہے۔ ٹرپل ایم اے ہے۔''

''مگر آپ کے ساتھ؟''

بابا نے شمع کو اس طرح گھورا جیسے انھوں نے کوئی بہت ہی بیہودہ سوال کیا ہو۔

بولے: ''سیکرٹری ہے میری۔''

''سیکرٹری؟'' ہم دونوں کو حیرت کا ایسا جھٹکا لگا کہ کچھ بولا ہی نہ گیا۔

بابا بڑے پیار سے بتا رہے تھے: ''دلّی میں ملی تھی۔ میں اپنے ساتھ لے آیا۔ سارا ڈکٹیشن لیتی ہے، نوٹس بھی بناتی ہے۔ اس کی وجہ سے کام بہت آسان ہو گیا ہے۔''

پتا چلا کہ بات صرف سیکرٹری تک ہی محدود نہیں ہے، بابا نے ایک مراٹھی فیملی کو بھی اپنے ساتھ رکھ لیا ہے، جس کا بیٹا بابا کا جھولا ڈنڈا اٹھا کے چلتا ہے اور بچے کے ماں باپ بابا کے کھانے کپڑے اور دوسری ضروریات کے انچارج بنے ہوئے ہیں۔ بالفاظِ دیگر، ان دنوں بابا نہایت ہی بورژوا قسم کی زندگی گزار رہے تھے۔

اس ملاقات کو عرصہ تین ماہ کا گزرا کہ ایک دن بابا پھر اپنے پرانے حلیے میں دکھائی دیے۔ وہی جھاڑ جھنکاڑ داڑھی، الجھے ہوئے بال اور میلے کپڑے۔ آتے ہی فرمایا: ''ذرا ٹیکسی کا کرایہ بھجوا دینا۔''

کرایہ زیادہ نہیں تھا اس لیے چپ چاپ دے دیا گیا۔ پھر بابا سے پوچھا گیا کہ گردشِ ایام پیچھے کی طرف کیسے دوڑ گئی؟ وہ آپ کے نوکر چاکر اور وہ سیکرٹری کہاں ہیں؟ کچھ ناراض سے ہو گئے، کہنے لگے: ''چلے گئی۔''

پوچھا: ''کہاں چلے گئی؟''

کہنے لگے: ''مجھے کیا معلوم؟ ۔۔۔ دو مہینے تنخواہ نہیں ملی تو میرا بھی چلی گئی۔''

شمع نے کہا: ''پیسے تو تھے آپ کے پاس بینک میں!''

Scanned with CamScanner

بابا کچھ زیادہ ہی ناراض ہو گئے۔ ”کیسی باتیں کرتی ہو بی بی؟... ساڑھے سات ہزار روپے میں اتنی برکت تھوڑی ہوتی ہے کہ دو ہزار روپے مہینے کی سیکرٹری اور پندرہ سو روپے مہینے کے نوکر رکھے جا سکیں۔“

پینے کے بڑے شوقین تھے۔ اسکاچ سے نوشادر کے ٹھرے تک بھی کچھ پی لیا کرتے تھے مگر رم ان کی پسندیدہ شراب تھی۔ فرمایا: ”تمھیں معلوم ہے، رم حرام نہیں ہے۔“

عرض کیا: ”وہ کس طرح؟“

بولے: ”رم اگر حرام ہوتی تو نہ محرم میں ہوتی اور نہ رمضان میں... پس ثابت ہوا کہ رم حرام نہیں ہے!“

غرض شراب بابا کی بہت سی کمزوریوں میں سے ایک تھی۔ جیسی ملے، جتنی ملے، جہاں بھی ملے، ملنی چاہیے۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ وہ ٹھرا پئیں یا اسکاچ، انھیں نشہ نہیں ہوتا تھا۔ یا یوں کہنا چاہیے کہ کم سے کم میں نے انھیں کبھی نشے میں نہیں دیکھا۔ حالانکہ پینے بیٹھتے تھے تو اچھی خاصی پی لیا کرتے تھے اور پلانے والے کو ٹوکتے بھی جاتے تھے: ”کل کے لیے کر آج نہ خست شراب میں“۔

محرم کے دس دن چھوڑ کے، ہر روز شام کو بقول ممبئی والوں کے ان کی گھنٹی بج جایا کرتی تھی اور پھر وہ تب تک دم نہ لیتے تھے جب تک ساغر و مینا ان کے سامنے نہ آ جائیں۔

اب کوئی پوچھے کہ نیاز حیدر جیسا ناستک محرم کیوں مناتا تھا، اور دس دن تک کالے کپڑے کیوں پہنتا تھا، تو میرے پاس اس کا نہ جواب ہے نہ جواز۔ میں تو بس یہی سمجھتا ہوں کہ نیاز بابا کی شخصیت جن تضادات کے تانے بانے سے تیار کی گئی تھی، یہ عمل بھی اس کا ایک حصہ تھا۔

ایک شام میں نے ڈرتے ڈرتے عرض کیا: ”جب آپ پر اثر ہی نہیں ہوتا ہے تو پیتے کیوں ہیں؟“

مسکرائے، اور فرمایا:

”مے سے غرض نشاط ہے کس روسیاہ کو
یک گونہ بے خودی مجھے 'ہر' رات چاہیے“

میں نے کہا: ”لیور خراب کرنے سے کیا فائدہ؟ آپ کو نشہ تو ہوتا ہی نہیں ہے جس کے لیے لوگ شراب پیتے ہیں۔“

Scanned with CamScanner

بابا کچھ فلسفیانہ موڈ میں تھے۔ کہنے لگے، ''برادر! نشہ انسانی دماغ کی ایک کیفیت کا نام ہے، یہ کسی چیز میں نہیں ہوتا۔ اور یہ بات مجھ سے زیادہ کوئی اور نہیں جانتا، کیونکہ ایسا کوئی نشہ نہیں ہے، سوائے ایک کے، جو میں نے نہیں کیا۔''

پھر اس کے بعد مزے لے لے کر انھوں نے بتایا کہ وہ افیم، چرس، بھانگ، گانجا، کوکن، ہیروئن، سب کا مزہ لے چکے ہیں۔ بلکہ متھرا کے سادھوؤں کے ساتھ بیٹھ کر دھتورے کے لڈو کھا چکے ہیں اور نہنگ سرداروں کے ساتھ پتھر پر سنکھیا کی لکیریں کھینچ کر انھیں زبان سے چاٹ چکے ہیں۔

''سنکھیا؟'' میں نے پوچھا ''آپ سنکھیا کھا کے بھی نہیں مرے؟''

بولے، ''یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصالِ یار ہوتا۔''

پھر ذرا تفصیل سے بتایا کہ ''سنکھیا چاٹنا ہر ایرے غیرے کے بس کا نہیں ہوتا۔ پتھر پر سنکھیا سے لکیریں کھینچ دی جاتی ہیں جو تین سے پانچ انچ لمبی ہوتی ہیں۔ اس نشے کے شوقین اپنی ضرورت اور صلاحیت کے حساب سے ان لکیروں کو زباں سے چاٹ لیتے ہیں۔ زیادہ تر لوگ تیسری لکیر تک پہنچتے پہنچتے ڈھیر ہو جاتے ہیں۔ سنا ہے کہ کچھ سورما سات لکیروں کا ریکارڈ بھی بنا چکے ہیں۔''

''کیسا ہوتا ہے سنکھیا کا نشہ؟''

''کسی بھی نشے کو بیان کرنا بڑا مشکل کام ہے، کیونکہ الفاظ احساس کا احاطہ نہیں کر سکتے۔''

''اور وہ کون سا نشہ ہے جو آپ نے نہیں کیا؟''

''کچھ لوگ نشے کے لیے اپنے آپ کو سانپ سے ڈسواتے ہیں۔ مگر میں یہ حرکت کبھی نہیں کر سکا۔''

''کیوں؟ کیا آپ کو سانپوں سے ڈر لگتا ہے؟''

''ڈر تو نہیں لگتا مگر بہت گندے لگتے ہیں۔''

''بہت سے لوگ تو آستینوں میں سانپ رکھتے ہیں؟''

''وہ بھی بہت گندے ہوتے ہیں۔''

تو ایسے تھے ہمارے نیاز بابا!

1988 میں بابا دلّی میں تھے، پارٹی کا کچھ کام کر رہے تھے۔ ایک دن فون آیا۔ بہت خوش

میں تھے، کہنے لگے: "جاوید میاں! ہمیں مکان مل گیا ہے، ہمارا اپنا مکان۔۔۔ ارے سرکار نے دیا ہے بھائی!۔۔۔ تم دلّی آؤ تو ہمارے ہی پاس ٹھہرنا۔ بلکہ ایک کام کرو، تم اور شمع آج کل جس اسکرپٹ پر کام کر رہے ہو، اسے لے کر آ جاؤ۔ بڑی مزے دار سردیاں ہیں، انگیٹھی جل رہی ہے، شراب بھی چل رہی ہے مگر کوئی دوست پاس نہیں ہے۔ بلکہ ہم تو کہتے ہیں کہ دلہن اور بچوں کو بھی لے آؤ، ہمارا گھر آباد ہو جائے گا۔۔۔ تو تم لوگ آ رہے ہو نا؟"

میں بہت خوش ہوا کہ ساری عمر بھٹکنے کے بعد بابا کو ایک گھر مل ہی گیا جسے وہ اپنا کہہ سکتے ہیں۔ میں نے آنے کا وعدہ بھی کر لیا اور ارادہ بھی۔

فروری 1989 میں اچانک خبر آئی کہ بابا جس گھر کو لے کر اتنا خوش ہو رہے تھے، انھوں نے وہ بھی چھوڑ دیا اور ایک ایسے مکان میں چلے گئے جہاں ان کے علاوہ کوئی اور نہیں رہ سکتا۔

کسی نے سچ ہی کہا ہے: "بنجارے کے سر کو پکی چھت راس نہیں آتی!"

●●

Scanned with CamScanner

ججیانی

آدھی صدی بعد اپنے گھر کو دیکھا تو آنکھوں پر یقین نہیں آیا۔

اس لمبی چوڑی حویلی کے تین ٹکڑے کر دیے گئے ہیں۔ ایک حصے میں ایک اسکول ہے، دوسرے میں ایک اونچی سی رہائشی عمارت کھڑی ہے۔ حویلی کے صحن میں، جہاں کبھی پھولوں سے لدے ہوئے درجنوں پیڑ ہوا کرتے تھے، اب گھاس کا ایک جنگل دکھائی دیتا ہے جس میں ویرانی اور اداسی کے سوا کوئی نہیں رہتا۔

ٹوٹے ہوئے پھاٹک کی دراروں میں سے گھاس کے جنگل کو دیکھتے دیکھتے بہت کچھ یاد آنے لگا، بالکل اسی طرح جیسے کچی نیند کا دھندلا سا خواب یاد آتا ہے۔

یہ ویران حویلی کسی وقت بھری ہوئی تھی۔

پھاٹک پر مونڈھا ڈالے ایک بزرگ بیٹھے رہا کرتے تھے۔ ان کا نام تو پتا نہیں کیا تھا، شاید عزیز خاں یا اسحاق خاں رہا ہوگا۔ بڑے میاں کے نام سے پکارے جاتے تھے۔ پھاٹک کے ساتھ لگا ہوا ایک آؤٹ ہاؤس جیسا تھا۔ اس میں نوکروں کا ایک خاندان رہا کرتا تھا۔ خدمت گار کا نام برکت یا کرامت تھا۔ اس کی ایک بڑی بدصورت موٹی سی بیوی تھی اور بیوی ہی کی شکل کی ایک بیٹی بھی تھی۔ دونوں ماں بیٹیاں قد کی لمبائی کو چھوڑ کر بالکل ایک جیسی دکھائی دیتی تھیں۔ بیٹی کی تو صورت دیکھتے ہی غصہ آنے لگتا تھا۔ نالائق ہر وقت دونوں ہاتھوں سے سر کھجاتی رہتی تھی اور اپنے باپ کو "باپ" کہتی تھی۔ وہ جب بھی منہ پھاڑ کر چلاتی: "با آ آ آپ..." تو اس کا گلا گھونٹ دینے کو جی چاہتا۔ بدذات لڑکی ابو، ابا، بابا کچھ بھی پکار سکتی تھی مگر وہ کہتی تھی باپ۔

اس کا باپ، برکت یا کرامت جو بھی تھا، کچھ ہرفن مولا قسم کا آدمی تھا۔ جب دیکھو، حویلی کے

Scanned with CamScanner

اندر چکوٹ کچھ کرتا رہتا تھا۔ کبھی باورچی خانے کی کھپریل ٹھیک کر رہا ہے، کبھی کرسی میں کیل ٹھونک رہا ہے، کبھی نیم کے پیڑ پر چڑھا ہوا بچوں کے لیے جھولا ڈال رہا ہے اور کبھی ہماری چھوٹی سی کھیتی کو کنوئیں سے پانی دے رہا ہے۔ اس کو کبھی کوئی ایک یا ایک جیسا کام کرتے نہیں دیکھا، شاید اس کا یہی کام تھا۔ اس کی موٹی سی بیوی آنگن میں جھاڑو دیتی تھی اور پیڑوں کے سوکھے پتے جمع کر کے ہر روز رات کو جلاتی تھی تا کہ مچھر بھاگ جائیں۔ آنگن کے آخری حصے میں ایک بارہ دری جیسی تھی جس میں اوپر نیچے کئی کمرے تھے۔ یہ کمرے ہمیشہ بہت ٹھنڈے رہا کرتے تھے کیونکہ ان کے اوپر نیم کا ایک بڑا سا پیڑ سایہ کیے رہتا تھا، اور آم کا پیڑ دھوپ کو اندر نہیں آنے دیتا تھا۔ ان کمروں میں ہمیشہ کوئی نہ کوئی مہمان ٹھہرا رہتا تھا۔ پتا نہیں کون کون وہاں آیا اور رہا۔ مجھے ایک پیر صاحب یاد ہیں، اس لیے کہ وہ بانسری بہت اچھی بجاتے تھے، اور کمال یہ تھا کہ ہونٹوں سے نہیں بلکہ ناک سے بجاتے تھے۔ میرے کمرے کی کھڑکی بارہ دری کی طرف کھلتی تھی۔ کبھی کبھی صبح کے اندھیرے میں جب ان کی بانسری کی آواز آتی تو لیٹا ہوا چپ چاپ سنتا رہتا۔ میرے برابر والا بڑا کمرہ دادی کا تھا۔ گھر میں یک بیٹھک بھی تھی جس کا ایک دروازہ سڑک کی طرف کھلتا تھا، جس میں چھوٹے چچا نے اپنا مطب قائم کر رکھا تھا۔ وہ ہومیوپیتھی کے ڈاکٹر تھے۔

امرود، انجیر، لیموں، سنترے اور لوکاٹ کے پیڑوں سے ملی ہوئی جو لمبی کھپریل تھی، اس میں باورچی خانہ، گودام اور ایک بڑا سا کمرہ تھا جس میں جیانی رہا کرتی تھیں، اور یہ سارا علاقہ ان کی عملداری میں تھا۔ اس میں دادی کے سوا کسی کو پھٹکنے کی اجازت بھی نہیں تھی۔ حد یہ ہے کہ دادی کی منھ چڑھی مرغیاں بھی دور دور ہی رہتی تھیں۔ اگر کبھی کوئی مرغی یا مرغا اپنی اوقات بھولا اور باورچی خانے تک آیا تو جیانی چمٹا یا پھکنی پھینک کر ایسا نشانہ لگاتیں کہ لینے کے دینے پڑ جاتے، اور ساری مرغیاں چیختی چلاتی پر پھڑپھڑاتی دور بھاگ جاتیں۔ بس موتی بیگم کو اجازت تھی کہ وہ جیانی کے پاس ایک پیڑھی پر آنکھیں بند کیے بیٹھی رہا کریں اور حویلی والوں کے لیے دعا کرتی رہیں۔ موتی میری بلی کا نام تھا۔ اس کا رنگ بالکل سفید تھا۔ چاندنی پر بیٹھی ہوتی تھی تو نظر بھی نہیں آتی تھی۔ مجھے اس کی آنکھیں اب تک یاد ہیں، جو بہت خوبصورت تھیں۔ چمکتے ہوئے گہرے ہرے رنگ کی بڑی بڑی آنکھیں اور ان کے بیچ میں بادامی رنگ کی پتلی۔

Scanned with CamScanner

جیانی بہت ننھی منی سی تھیں۔ سر پر کھچڑی بال، گہرے سانولے چہرے پر بہت سی جھریاں، بہت چھوٹی چھوٹی مگر چمکتی ہوئی آنکھیں چھوٹی سی ناک جس میں چاندی کی بڑی سی لونگ جو دور سے مسے کی طرح دکھائی دیتی تھی، کان اوپر سے نیچے تک چھدے ہوئے تھے جن میں چاندی کی چھوٹی چھوٹی بالیاں پڑی ہوئی تھیں۔ بلیوں میں لال ہرے اور سفید موتی جھولتے رہتے تھے اور ان کا وزن اتنا زیادہ تھا کہ کان کا اوپری حصہ دوہرا ہو گیا تھا۔ کان کا یہ زیور بالی پتے کہلاتا ہے۔ مجھے یقین ہے یہ بالی پتے جب سے ان کے کانوں تک پہنچے تھے نہ کبھی اترے تھے اور نہ کبھی صاف ہوئے تھے۔ ہاتھوں میں چاندی کی دو دو چوڑیاں پڑی ہوئی تھیں جو ہر وقت دھلتے رہنے کے باوجود کالی ہی رہتی تھیں۔ ہاتھوں کی نسیں ابھر آئی تھیں، اور ناخن تو دکھائی ہی نہیں دیتے تھے۔ پیر میں موٹے چمڑے کی جوتی پہنتی تھیں جس کا پچھلا حصہ ایڑی کے نیچے دبا رہتا تھا۔ سیدھی کاٹ کا چست پاجامہ جس کا نچلا حصہ، جس میں چوڑیاں پڑتی تھیں، ہمیشہ کسی دوسرے کپڑے اور دوسرے رنگ کا ہوتا تھا۔ ڈھیلا ڈھالا کرتا جو کرتی سے ذرا سا ہی لمبا ہوتا تھا۔ سر پر تین گز کا دوپٹہ جو زیادہ تر کسی موٹے کپڑے کا ہوتا تھا اور جس پر رنگین گوٹ لگی ہوتی تھی تاکہ اوڑھنی کے کام بھی آسکے۔

حویلی میں جیانی کی وہی حیثیت تھی جو انگریزوں کے راج میں ریاست کے ریزیڈنٹ کی ہوا کرتی تھی۔ کہنے کو ہر ریاست میں کسی راجہ مہاراجہ یا نواب کی حکومت ہوتی تھی مگر حکم چلتا تھا ریزیڈنٹ بہادر کا۔ یوں تو وہ نوکرانی تھیں، چھوٹی سی تھیں جب یہاں آئی تھیں۔ یہیں ان پر جوانی آئی، یہیں سے ان کی شادی ہوئی، مگر شادی کے بعد بھی وہ کبھی سسرال نہیں گئیں۔ بلکہ ان کے شوہر کو حویلی میں ہی ایک کوٹھری دے دی گئی تھی۔ جیانی کا بیٹا جما اسی گھر میں پیدا ہوا۔ مگر بیچاری جیانی جوانی میں ہی بیوہ ہو گئیں۔ مچھلی کی بڑی شوقین تھیں اور ان کا فدوی قسم کا شوہر ہر ہفتے ندی سے ٹوکری بھر کے مچھلی پکڑ لاتا اور سب کو کھلاتا۔ ایک دن شکار کھیلنے گیا۔ گرمی کے دن تھے۔ لوٹا تو رستے میں لو لگ گئی، غریب شام تک ٹھنڈا ہو گیا۔ جمے کو اس کا دادا لے گیا، اسی نے پالا۔ جیانی جوان تھیں، بہت زور لگا مگر انھوں نے اپنی دوسری شادی کے لیے ہاں نہیں کی۔ البتہ بیٹے کی شادی بڑی دھوم دھام سے کی۔ کہا جاتا ہے کہ ان کی زندگی میں وہی چار دن تھے جب وہ حویلی سے غائب رہیں۔ بیٹے کو نواب صاحب کے ہاں خاص باغ پیلس میں پہرے دار کی نوکری مل گئی تھی۔ ایک سرکاری کوارٹر بھی ملا ہوا

Scanned with CamScanner

تھا۔ اس نے بہت ہاتھ پاؤں جوڑے، سب سے سفارش بھی کرائی مگر حجیانی نے کبھی ایک رات بھی اس کے گھر میں نہیں گزاری۔ دادی یعنی بڑی بیگم کی بہت منھ چڑھی تھیں۔ انھیں جواب دینے بلکہ ڈانٹ دینے کی ہمت اگر کسی میں تھی تو وہ حجیانی ہی میں تھی۔

خاندان میں سب لوگ انھیں حجیانی کہا کرتے تھے حالانکہ انھوں نے حج نہیں کیا تھا۔ قصہ کچھ یوں مشہور ہے کہ وہ بمبئی گئی ضرور تھیں مگر پانی کو دیکھ کر انھیں چکر آنے لگے۔ بیمار ہوگئیں اور ایسی بیمار ہوئیں کہ جہاز جدہ چلا گیا اور حجیانی اسپتال۔ مگر جب حاجیوں کے پہلے قافلے کے ساتھ اپنے گھر واپس آئیں تو حجیانی مشہور ہوگئیں۔ حالانکہ ان بیچاری نے کبھی نہیں کہا کہ وہ حج کر کے آئی ہیں مگر یہ لفظ حجیانی ان کے نام کے ساتھ آخر تک جڑا رہا، بلکہ ان کا نام ہی بن گیا۔

جب میں نے ہوش سنبھالا تو اس حویلی میں، جو ہمیشہ بھری رہتی تھی، صرف تین آدمی تھے۔ ایک میں، میری دادی اور حجیانی، جنھیں میں میا کہا کرتا تھا۔ یہ وہ وقت تھا جب زمینداریاں ختم ہو چکی تھیں۔ گاؤں سے جو پیسہ اور اناج آیا کرتا تھا، بند ہو چکا تھا اور وہ پیسہ جو آڑے وقتوں کے لیے بچا کے رکھ لیا گیا تھا، سرکاری افسروں اور وکیلوں کی جیبوں میں جا رہا تھا کیونکہ حکومت سے مقدمے بازی ہو رہی تھی اور بات ہائی کورٹ تک پہنچ چکی تھی۔ پھاٹک پہ بیٹھنے والے بڑے میاں مر چکے تھے۔ برکت اپنی بیوی اور بچی کو لے کے کسی گاؤں میں چلا گیا تھا۔ بانسری بجانے والے پیر نرالے میاں پیشکار صاحب کے گھر ٹھہرنے لگے تھے، اور چھوٹے چچا کی ڈسپنسری چوک کی ایک دکان میں منتقل ہوگئی تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے اس گھر سے لوگ ہی نہیں گئے، آوازیں بھی چلی گئیں۔ ہم تینوں آپس میں بہت کم بولتے تھے، اور بات کرنے کو تھا بھی کیا۔ گرمی کی تپتی ہوئی دوپہر جیسا سناٹا تھا جو ہر وقت چاروں طرف پھیلا رہتا تھا۔ مگر اپنا گھر چاہے ویران ہو یا بھرا ہوا، اپنا ہی ہوتا ہے، اس لیے دادی اور میں تو اسے چھوڑ کر جا ہی نہیں سکتے تھے۔ میری بلی موتی کا بھی کوئی دوسرا ٹھکانہ نہیں تھا، وہ بھی ساتھ رہتی تھی۔ مگر حجیانی ہمارے ساتھ کیوں تھیں، اس کی ایک دلچسپ کہانی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ایک دن دادی یعنی بڑی بیگم نے سارے نوکروں کو جمع کیا اور سب کا حساب صاف کر دیا۔ بے چارے دو تین ہی تو رہ گئے تھے۔ گجریا بھنگن اور مسیتا بہشتی کو چھوڑ کر، بھی آنسو پونچھتے اور دعائیں دیتے چلے گئے۔

حجیانی بڑے آرام سے اپنی چھوٹی چھوٹی آنکھیں پٹکاتی رہیں اور منھ میں رکھا پان چباتی

رہیں۔ جب سب چلے گئے تو بڑی بیگم نے ایک لمبی ٹھنڈی سانس لی اور جیانی کی طرف مڑیں، مگر ان کے منہ کھولنے سے پہلے ہی جیانی جھپاک سے اٹھیں اور سامنے آکر کھڑی ہو گئیں۔ انھوں نے سر پہ دوپٹہ ٹھیک کیا اور کمر پہ ہاتھ رکھ کے ذرا سی تیز سی ہو گئیں۔ منھ سے جو آواز نکلی وہ بھی عام دنوں کے مقابلے میں دو سُر اونچی تھی: ''کیا میرا حساب بھی صاف کر رہی ہو؟''

بڑی بیگم نے تھکی تھکی آنکھوں سے جیانی کو دیکھا اور بہت دھیرے سے بولیں: ''تجھے تو سب کچھ معلوم ہے، جیانی۔ اب اللہ کے سوا کوئی آسرا نہیں۔ نہ کسی اور سے کوئی امید ہے۔ میں تو فاقہ بھی کروں گی مگر یہ سب خدمتگار بھوکے رہیں، یہ نہیں دیکھا جائے گا۔'' بڑی بیگم نے لال مخمل کی ایک پرانی سی تھیلی جس میں چاندی کے کچھ روپئے بجے ہوئے تھے، جیانی کی طرف بڑھا دی۔ ''اس میں سے حق چاہے اٹھا لے۔ ہمارا کہا سنا معاف کر دینا۔''

جیانی نے زور سے سر ہلایا اور سی اونچی آواز میں تڑسے بولیں: ''ایسے نہیں جاؤں گی بی بی، حساب صاف کرنا ہے تو پورا حساب کرو۔''

بڑی بیگم نے حیرت سے جیانی کو دیکھا۔ ''کیا مطلب ہے تیرا؟''

''سات برس کی تھی جب آئی تھی اس گھر میں۔ پانچ اوپر پچاس برس ہو گئے خدمت کرتے کرتے۔ کرلو حساب۔ وہ جو ملا بیگم نے گھر میں جنھیں کام کرتی ہے، ہنڈیا میں چمچہ گھمانا بھی نہیں آتا چھنالی کو، مگر مہینے کے مہینے سات روپے گنوا لیتی ہے۔ میں اس سے بھی گئی گزری ہوں کیا؟ کسی شادی بیاہ میں جو کچھ دیا ہے وہ کاٹ کے جوڑو تو بھی ہزاروں روپے ہوتے ہیں۔ اور نہیں تو کیا؟... یہ کیا چاندی کے چار روپے دکھا رہی ہو۔''

کوئی دوسرا وقت ہوتا یا کوئی دوسرا نوکر ہوتا تو اب تک جوتے مار کر حویلی کے پھاٹک سے باہر نکال دیا گیا ہوتا۔ مگر ایک تو یہ کہ جیانی بڑی بیگم کی منہ چڑھی بلکہ لاڈلی تھیں۔ دوسرے یہ کہ وہ جو کچھ کہہ رہی تھیں وہ بالکل درست تھا۔ بڑی بیگم نے سر جھکا لیا۔ انھیں جیانی کے غصے پہ بہت پیار آیا، آنکھوں میں آنسو بھی آگئے۔ انھوں نے ایک لمبی سانس کھینچی اور بولیں: ''یہ غصہ دکھانے کا وقت نہیں ہے، جیانی۔ تو جا، اپنے بیٹے بہو کے ساتھ رہ۔ تیری دو روٹی انھیں بھاری نہیں ہوں گی۔ اگر ہمارا وقت بدل گیا تو پھر بلا لیں گے۔''

Scanned with CamScanner

جھیانی چمک کر بولیں: "اے تم کون ہوتی ہو میری روٹی کا بندوبست کرنے والی!... روٹی کا وعدہ اللہ نے کیا ہے۔ میں جمنا کے ساتھ رہوں یا اس گھر میں، میرے حصے کا رزق مجھے مل جائے گا۔ تم اپنی سوچو۔"

بڑی بیگم بہت دیر تک جھیانی کو دیکھتی رہیں، پھر اپنا پاندان اٹھایا اور چپ چاپ اپنے کمرے میں جا کے بیٹھ گئیں۔

جھیانی نے کمرے کی طرف منھ کیا اور بہت زور سے بولیں: "خاطر جمع رکھو، میں اتنی آسانی سے نہیں جانے والی ہوں۔ اصل نسل کی کہاری ہوں، اصل نسل کی۔ نمک کھایا ہے تو نمک کا حق بھی ادا کروں گی۔" انھوں نے روپوں کی تھیلی کمرے کی چوکھٹ پہ رکھی اور بڑبڑاتی ہوئی باورچی خانے کی طرف چلی گئیں۔

اس دن کے بعد پھر کبھی کسی نے جھیانی کو جانے کے لیے نہیں کہا۔ وہ ہمارے ساتھ بالکل اس طرح رہتی تھیں جیسے کوئی قریبی رشتے دار ہوں۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ انھیں کچھ نہیں ملنے والا ہے، وہ اپنے تمام کام اسی طرح کرتی رہیں جس طرح کرتی آئی تھیں، بلکہ باقی نوکروں کے جانے کے بعد ان کا کام بہت زیادہ بڑھ گیا تھا۔ فجر کی نماز پڑھ کے سارے گھر میں جھاڑو لگاتیں، پیڑوں میں پانی ڈالتیں، چائے بناتیں اور ٹرے میں سجا کے دالان میں بچھی ہوئی چوکیوں کے فرش پہ رکھ دیتیں۔ جب سے بارہ آدمیوں کی ڈائننگ ٹیبل اور اس کے ساتھ کی آبنوسی کرسیاں بکی تھیں، یہ چوکیاں ہماری ڈائننگ ٹیبل بن چکی تھیں۔ اگر گھر میں پیسے ہوتے تو موٹے موٹے گول بسکٹ اور ڈھائی آنے والی سفید مکھن کی ٹکیہ ناشتے میں ملتی، ورنہ رات کی باسی روٹی کو نمک مرچ کے پانی میں گیلا کر کے ذرا سا تل دیتیں۔ باسی روٹی کے وہ پراٹھے چائے کے ساتھ کھانے میں جو مزہ آیا کرتا تھا وہ اب کسی بریک فاسٹ میں نہیں آتا۔

سارے زیور اور چاندی کے برتن تو پہلے ہی بک چکے تھے۔ گھر کا وہ تمام سامان بھی جو ضروری نہیں تھا، پرانا گنج کے ایک کباڑی کی دکان پر جا چکا تھا۔ دادی کے پاس ایک گلوبند رہ گیا تھا، یا شاید انھوں نے جان بوجھ کر روک لیا تھا۔ سونے کا بڑا خوبصورت گلوبند تھا۔ ایک ایک انچ کے سات آٹھ ٹکڑے آپس میں جڑے ہوئے تھے۔ اس کی خوبی یہ تھی کہ اسے دونوں طرف سے پہنا جا سکتا تھا۔

Scanned with CamScanner

ایک طرف سفید کندن تھا اور دوسری طرف سبز مینا۔ وہ اسے میری دلہن کو منہ دکھائی میں دینا چاہتی تھیں۔ مگر روٹی دلہن کی منہ دکھائی سے زیادہ ضروری ہوتی ہے۔ اس لیے جب بھی حویلی بازار جانے سے پہلے پیسہ مانگنے کے لیے کھڑی ہوتیں تو دادی چھالیہ کاٹنے کا سروتا پاندان میں سے نکالتیں، اس اندھیرے کمرے میں جاتیں جہاں کچھ صندوق اب بھی رکھے ہوئے تھے، کسی ایک صندوق سے ایک ڈبیہ نکالتیں، اسے کھول کر اس میں رکھے ہوئے گلوبند کو دیر تک دیکھتی رہتیں۔ پھر سروتے سے سونے کا ایک ٹکڑا کاٹتیں اور جیانی کے پھیلے ہوئے ہاتھ پر رکھ دیتیں۔

ٹکڑا ٹکڑا کر کے وہ گلوبند بک گیا اور دھیرے دھیرے گھر بھی سامان سے خالی ہو گیا۔ اونچی اونچی الماریاں، جن میں جرمن کانچ لگے ہوئے تھے، ٹی سیٹ اور ڈنر سیٹ جن کے اوپر حضرت عیسیٰ اور حضرت مریم کی تصویریں بنی ہوئی تھیں، ہاتھ کے بنے ہوئے کانچ کے گلاس جن کے اوپر سنہری کام کیا ہوا تھا، ہاتھی دانت کے پایوں والی مسہری، تانبے پیتل کے برتن اور نہ جانے کیا کیا۔ یوں تو وہ حویلی تھی ہی بڑی، خالی ہوئی تو اور بھی بڑی معلوم ہونے لگی۔ پہلی مرتبہ مجھے احساس ہوا کہ گھر ویران ہو تو ڈراتا ہے، چاہے وہ پناہ ہی کیوں نہ ہو۔ بات یہاں تک پہنچی کہ مرغیاں اور پیڑوں کی فصلیں بھی بیچ دی گئیں۔ صاحب جان پھل والا آیا اور کاغذی لیموں تین روپے سیکڑا کے حساب سے گن کے لے گیا۔ سنترے، لوکاٹ اور انجیر تو بہت کم تھے مگر بیس سیر کچے پپیتے کے دام بہت اچھے ملے۔

یہ سب مول بھاؤ جیانی کیا کرتی تھیں۔ دادی تو تسبیح ہاتھ میں لیے دالان میں ٹہلتی رہتیں یا پھر کسی در سے کندھا ٹکائے کھڑی ہو جاتیں اور چپ چاپ ان چیزوں کو جاتے دیکھتی رہتیں جو انھوں نے بڑے ارمانوں سے جمع کی تھیں اور جو پھر کبھی واپس نہیں آنے والی تھیں۔ اور ایک دن ایسا بھی آیا جب اس پانچ ہزار گز میں پھیلی ہوئی بائیس کمروں والی حویلی میں ایک چیز بھی ایسی نہیں بچی جسے بیچ کر پاؤ بھر آٹا منگایا جا سکے۔

ایسا نہیں تھا کہ اگر مانگا جاتا تو کوئی انکار کر دیتا۔ آس پاس کے سارے گھر رشتے داروں کے تھے اور ماشاءاللہ سبھی کھاتے پیتے تھے۔ مگر وہ ہاتھ بڑی بیگم کا ہاتھ تھا، جو اپنی اولاد کے سامنے نہیں پھیلا تو کسی اور کے آگے کیسے پھیل سکتا تھا۔ اس رات میں کچھ کچے پکے امرود کھا کے سو گیا۔ موتی رات بھر بھوک سے بلبلاتی رہی اور دادی کے پیروں میں لوٹتی رہی، جو ہاتھ میں تسبیح لیے دالان کے اس

Scanned with CamScanner

کونے سے اس کونے تک چکر لگا رہی تھیں۔ دوسرے دن صبح جب میں سوکر اٹھا تو دادی پریشانی کے عالم میں گھوم رہی تھیں۔ پتا چلا کہ جیانی غائب ہیں۔ پچھ تک کا چھوٹا دروازہ کھلا ہوا تھا، پھر بھی سارا گھر چھان مارا۔ زور زور سے آوازیں دیں، پاخانہ، غسل خانہ بھی دیکھ لیا مگر ان کا کہیں پتا نہیں تھا۔ کئی بار دروازے پہ جا کے باہر دیکھا۔ ایک بار تو کنویں کے اوپر رکھا ہوا ٹین کا ٹکڑا ہٹا کے کنویں میں بھی جھانکا۔ دن چڑھتے چڑھتے دادی کی پریشانی غصے میں بدل گئی۔ ''اے خدا غارت کرے، اللہ ماری کو جانا تھا تو بول کے چلی جاتی۔ پتا نہیں کہاں جا کے مر گئی بدذات۔ بیٹا ذرا جا کے دیکھ کے تو آ۔ کسی کے گھر میں بیٹھی ہوئی باتیں بنا رہی ہوگی۔''

مجھے بھی ان کا جانا کچھ اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ اس لیے نہیں کہ وہ بنا بولے اچانک غائب ہوگئی تھیں بلکہ اس لیے کہ وہ گھر میں ہوتیں تو ناشتے کے نام پہ کچھ نہ کچھ ضرور کھلا دیتیں۔

میں نے آس پاس کے سارے گھر دیکھ ڈالے مگر جیانی کا کوئی پتا نہیں تھا۔

دادی تسبیح لیے ہوئے دالان میں ٹہل رہی تھیں اور بار بار جیسے خود سے پوچھ رہی تھیں، ''کہاں جا سکتی ہے؟ پتا نہیں کہاں گئی ہوگی! نامراد کو برابر دکھائی بھی تو نہیں دیتا۔ ٹھوکریں کھاتی چلتی ہے۔ کسی ٹھیلے تانگے کے زد میں آگئی ہوگی... کم بخت بول کے جاتی تو زبان گھس جاتی کیا...''

دوپہر کو جب سورج سر پہ آگیا، نیم کا ٹھنڈا سایہ سمٹ کر اس کی جڑوں میں چھپ گیا اور آم کے پتوں سے گرم ہوا نکلنے لگی تو کسی نے زنجیر عدل کھینچی۔

یہ زنجیر عدل ایک لمبی سی رسی تھی جس کا ایک سرا دروازے پر بندھا ہوا تھا اور دوسرے سرے پر ایک بڑی سی گھنٹی تھی جیسی بیلوں کے گلے میں ڈالتے ہیں، اور یہ گھنٹی لیموں کے پیڑ سے لٹکی رہتی تھی۔ دروازے سے دالان کافی دور تھا۔ اکثر ایسا ہوتا تھا کہ کنڈی کھڑکھڑانے کی آواز نہیں پہنچتی تھی، اور گھر میں الیکٹرسٹی تو تھی نہیں کہ بجلی کی گھنٹی لگائی جا سکے، اس لیے میری ذہانت نے یہ راستہ نکال لیا تھا۔

گھنٹی زور زور سے کئی بار بجی اور موتی میاؤں میاؤں کرتی ہوئی لپکی تو میں سمجھ گیا کہ میا آگئی ہیں۔ میں نے دروازہ کھولا تو سامنے پسینے میں نہائی ہوئی، ہاتھوں میں دو بڑے بڑے تھیلے اٹھائے، جیانی دکھائی دیں۔ انھوں نے سامان چوکی پہ رکھا اور ہانپتے ہوئے پسینہ پونچھنے لگیں۔ تب تک دادی بھی کمرے سے باہر آچکی تھیں۔ جیانی کو دیکھ کر آگ بگولہ ہوگئیں۔ ''کہاں مر گئی تھی تو؟ بول کے جاتی

Scanned with CamScanner

تو منھ میں دانہ نکل آتا کیا؟"

"چلا دُمت اجما کے پاس گئی تھی،" جھیانی نے تڑسے جواب دیا۔

"خدا تجھے غارت کرے، اگر مجھے بتا کے جاتی تو کیا میں تجھے روک لیتی؟ صبح سے یہ وقت ہو گیا، بچہ پریشان، گھر گھر میں ڈھونڈتا پھرا، اور ممتا کی ماری اماں جان بیٹے سے ملنے پہنچ گئیں۔"

"بتاتی تو تم کبھی نہیں جانے دیتیں۔ اچھی طرح جانتی ہوں تمھیں..."

دادی کی سمجھ میں نہیں آیا، وہ جھلا کے بولیں، "کیوں نہیں جانے دیتی؟... کیا میں نے کبھی آنے جانے سے روکا ہے؟"

جھیانی نے برا سا منھ بنایا اور تھیلے اٹھاتے ہوئے بولیں، "اے اب بس بھی کرو، مجھے بہت کام ہے۔ میں چلی۔" جھیانی تھیلے اٹھا کے باورچی خانے کی طرف جانے لگیں تو دادی نے روک لیا۔

"ان تھیلوں میں کیا لائی ہو؟"

"کھانے پینے کا سامان ہے۔ بکری کا گوشت بھی ہے۔ گرمی بہت ہے، ابھی نہیں پکایا تو خراب ہو جائے گا۔ اے خدا غارت کرے، آگ لگی ہوئی ہے بازار میں، ہر چیز کتی مہنگی ہو گئی ہے۔ گوشت ڈھائی روپیہ سیر ہو گیا، وہ بھی ہڈیوں بھرا۔"

دادی نے اپنی کمر پہ ہاتھ رکھا اور جھیانی کا رستہ روک لیا۔ "تو جما سے پیسے لانے گئی تھی؟"

جھیانی نے تھیلے پٹک دیے۔ "اے بی بی! تمھیں اپنی بھڑاس نکالنے کا دل ہو رہا ہے تو نکال لو۔ ہاں گئی تھی! کیوں نہیں جاتی؟ بیٹا ہے میرا۔ حرامی پلّے کو نو مہینے پیٹ میں رکھا ہے۔ میرا کچھ حق ہے یا نہیں؟"

دادی کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیا کہیں۔ بہت دیر تک جھیانی کی آنکھوں میں دیکھتی رہیں، پھر بولیں، "کیا تو نے اسے بتایا کہ اس گھر میں..."

"اے کیا دیوانی ہوئی ہو! مجھے کیا اللہ کی مار تھی جو میں اپنے دکھڑے لے کے بیٹھ جاتی۔ میں نے کہا، مجھے پیسے چاہیے، اس نے دے دیے۔ اللہ اللہ خیر سلا۔"

"تو نے اچھا نہیں کیا جھیانی۔ تجھے جما کے پاس نہیں جانا چاہیے تھا۔"

جھیانی نے اپنا کالا جھریوں بھرا ہاتھ دادی کے سامنے نچایا اور چیخ کر بولیں، "یہ اونچی ناک

اپنے پاس رکھو سنبھال کے ! ہوش کی دوا کرو، ہوش کی۔ معصوم بچہ کل سے بھوکا ہے۔ کچے پھل کھا کے کب تک پیٹ بھرے گا؟ بیمار ہو گیا تو لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔"

بڑی بیگم نے ہونٹ کھولے۔ ان کی آنکھوں سے لگا جیسے وہ برس ہی تو پڑیں گی لیکن منھ سے نکلا: "مگر جھجیانی..."

جھجیانی تھیلے اٹھاتے ہوئے بولیں، "چولھے میں گئی تمھاری اگر اور مگر... میں چلی۔ تمھیں کھانا ہو تو کھانا، نہیں کھانا ہو مت کھانا۔" جھجیانی باورچی خانے کی طرف چل پڑیں۔

موتی ایک تھیلے کو بار بار سونگھ رہی تھی اور زور زور سے چلا رہی تھی۔ جھجیانی نے اسے دیکھا اور زور سے ڈانٹا: "لائی ہوں، مرات پٹی، تیرے لیے بھی لائی ہوں۔ مری کیوں جا رہی ہے؟"

ظہر کی نماز پڑھنے کے بعد جب بڑی بیگم نے سلام پھیرا تو جھجیانی سامنے کھڑی تھیں۔ ان کے ہاتھ میں ہمیشہ کی طرح لوٹا اور سلفچی تھا۔ "دسترخوان لگ گیا ہے، ہاتھ دھو لو۔ میاں کو کھلا دیا ہے۔"

تھوڑی دیر کو ایسا لگا جیسے بڑی بیگم پتھر کی ہو گئی ہوں۔ وہ جس طرح بیٹھی تھیں اسی طرح بیٹھی رہیں۔

"ارے اب چلو نا، قورمہ ٹھنڈا ہو جائے گا تو مزہ بھی نہیں آئے گا۔"

اور پھر جب مدار المہام، سردار ڈیوڑھی، افسر ذات خاص، حافظ احمد علی خاں بہادر کی بہو اور تحصیل دار اشرف علی خاں صاحب بہادر کی بیوہ نے چار وقت کے فاقے کے بعد روٹی کا ٹکڑا توڑا تو اچانک رک گئیں۔ انھوں نے جھجیانی کی طرف دیکھا جو پاس ہی کھڑی تھیں۔ "تو بھی بیٹھ جا جھجیانی، تو نے بھی تو کچھ نہیں کھایا ہوگا۔"

"یہ لو، میں بیٹھ گئی تو گرم پھلکا کون لائے گا؟... اللہ! پتھر پڑیں میری عقل پہ، چٹنی رکھنا تو بھول ہی گئی۔ ابھی لائی۔"

جھجیانی جوتی گھسیٹتی ہوئی تیزی سے باورچی خانے کی طرف بڑھ گئیں۔ بڑی بیگم نے آسمان کی طرف منھ اٹھایا اور دھیرے سے بولیں:

"اس نمک کا حق کیسے ادا ہوگا مولا؟"... پھر سر جھکایا اور نوالہ منھ میں رکھ لیا۔

●●

Scanned with CamScanner

موگرے کی بالیوں والی

بکھری ہوئی مٹی کو اکٹھا کر کے قبر کی شکل دے دی گئی تھی، سوکھی مٹی پر پانی ڈال کر گیلا کر دیا گیا تھا اور دھوپ سے کمھلائے ہوئے اداس پھولوں کی ایک چادر قبر کے اوپر ڈال دی گئی تھی، جس میں لال پیلی اور ہری مٹی کے ربن ہوا کے جھونکوں سے ہل رہے تھے اور ایک عجیب بے معنی اور بیہودہ سی آواز پیدا کر رہے تھے۔

وہ چند لوگ جو جنازے کے ساتھ آئے تھے، جا چکے تھے اور سورج پیلا ہو کر گل مہر کے پیڑ کے پیچھے چلا گیا تھا۔ وہاں میرے علاوہ قبر کھودنے والا ایک مزدور تھا، جو بکھری ہوئی مٹی کو ٹوٹی ہوئی قبروں میں ڈال کر صفائی کر رہا تھا۔ میں بہت دیر تک کمھلائے سفید پھولوں کے نیچے گیلی کالی مٹی کو دیکھتا رہا، پھر میں نے کہا: ''اچھا آپا، تو خدا حافظ...''

یہ کہتے ہوئے شاید میری آواز بہت اونچی ہو گئی تھی، اس لیے کہ مٹی صاف کرنے والے مزدور نے اپنا پھاوڑا روکا اور سر ٹیڑھا کر کے مجھے دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں کوئی جذبہ نہیں تھا، نہ حیرت کا، نہ ہمدردی کا، نہ دکھ کا۔ ہونا بھی نہیں چاہیے تھا۔

ایسے ہنگامے تو یاں روز ہوا کرتے ہیں

میں نے آخری دفعہ قبر کو دیکھا ہاتھ ہلایا اور باہر جانے والی پکی پگڈنڈی پہ چل پڑا۔ پتا نہیں کیسے، وہ آنسو جو بہت دیر سے رکے ہوئے تھے، اچانک بہنے لگے۔ ہر چیز ایک دم سے دھندلی ہو گئی اور اس دھند میں ظفر گورکھپوری کی آواز سنائی دی: ''آپا بڑی اچھی انسان تھیں...'' میں نے سر ہلایا اور آنسو پونچھ ڈالے۔

ظفر نے میرے کندھے پہ ہاتھ رکھ دیا۔ ''تمھاری رشتے دار تھیں؟''

Scanned with CamScanner

"نہیں..." میں نے کہا۔

"کب سے جانتے تھے؟"

اب میں انھیں کیا بتاتا کہ کب سے جانتا تھا! مجھے تو ہمیشہ ایسا ہی لگا کہ میں انھیں ہمیشہ سے جانتا تھا، اور مجھے یہ بھی نہیں معلوم کہ یہ ہمیشہ کتنا لمبا ہے۔

یہ اس زمانے کی بات ہے جب میں انقلاب میں کام کیا کرتا تھا۔ خالد انصاری امریکہ سے جرنلزم کی ایک بڑی سی ڈگری لے کر آئے تھے اور اردو صحافت میں انقلاب لانے کے لیے "انقلاب زندہ باد" کا نعرہ لگا چکے تھے۔ انھوں نے چن چن کر ان تمام نوجوان صحافیوں کو انقلاب میں جمع کرلیا تھا جو ادھر اُدھر بکھرے پڑے تھے۔ میں بھی انھیں میں سے ایک تھا شام ہوتے ہوتے دفتر کی ساری میزیں دونوں طرف سے بھر جاتیں۔ چونکہ میزیں کم تھیں، یا یوں کہنا چاہیے کہ جگہ تھوڑی تھی، اس لیے دو دو آدمی آمنے سامنے بیٹھا کرتے تھے۔ صرف ایک میز ایسی تھی جس پر خلش جعفری کا قبضہ بلا شرکت غیرے رہا کرتا تھا، کیونکہ وہ ایڈیٹر تھے۔ کام وام تو خیر ہوتا ہی تھا لیکن باتیں کرنے اور سننے میں بھی بہت مزہ آتا تھا۔ اس چھوٹے سے دفتر میں عزیز قیسی بھی تھے، ہاشم طرزی بھی، شاہد رزاق، شمیم زبیری، محمود راہی، سردار عرفان، شمس الحق شمس لکھنوی، شمیم پھلواروی اور میں۔ دھاردار جملے، خاردار تبصرے اور قہقہے ایک ایسا ماحول بناتے تھے جو میں نے انقلاب کے بعد کسی دفتر میں نہیں دیکھا۔ سونے پہ سہاگہ کالم نگار عبداللہ ناصر، سلامت خیر آبادی، مولانا اطہر مبارکپوری، شعر پہ شوشہ والے کارٹونسٹ وہاب حیدر اور بسم اللہ ہوٹل کی چائے۔ بارہ بجتے بجتے آخری کاپی پریس چلی جاتی اور ہم میں سے کئی نوجوان، جن کے گھر بار نہیں تھے، کھانا ڈھونڈنے کے لیے نکل پڑتے۔

مجھے اور سردار عرفان کو وہ تمام خفیہ جگہیں معلوم تھیں جہاں سستا اور عمدہ کھانا ملا کرتا تھا۔ فارس روڈ پہ بچو کی باڑی کے باہر نان چاپ اور بھنا گوشت بہت اچھا ملتا ہے۔ کھاتے کھاتے کچھ ٹھمکے بھی دیکھے جاسکتے ہیں۔ وہیں پاس میں مبارک سیخ والا بھی اپنا ٹھیلا لگاتا ہے۔ مستان تالاب کے کونے پہ نہاری اور سری پائے والا کبھی کبھی مل جاتا ہے، کیونکہ اس کا مال ذرا جلدی بک جاتا ہے۔ بھنڈی بازار کے چوراہے پر پانکا منزل کے نیچے فٹ پاتھ پر دور تک چٹائیاں بچھی ہوتی ہیں اور نہایت مزے دار کھچڑا، جس پر تلی ہوئی پیاز اور ہری مرچوں کی ڈریسنگ ہوتی ہے، بہت سستا ملتا ہے۔ آپ چاہیں تو

Scanned with CamScanner

وہیں دکان کے تختے پر بیٹھ کر سر کی مالش بھی کرا سکتے ہیں، کیونکہ دو تین مالش والے مجھڑے والے کے ساتھ ہی فٹ پاتھ پر ڈیرہ جمایا کرتے ہیں۔ اگر گوشت خوری کا موڈ نہ ہو تو ذرا سا آگے بڑھ جائیے، پایدھونی اور بھیشور کے بیچ میں چار پانچ ٹھیلے والے بہت اچھی اور سستی آلو کی ترکاری اور پوریاں بیچتے ہیں۔ اور منھ میٹھا کرنے کے لیے جے جے ہسپتال پر بڑی اور کالی جلیبی۔۔۔ اے سبحان اللہ، ایسا ذرا کسے نصیب ہوگا۔ مگر کھانا کھانے کے بعد کافی پینے کا مزہ تو ناگپاڑہ جنکشن پر ہی آتا ہے۔ رولیکس ہوٹل کے پاس روزنامہ ہندوستان کے دفتر کے نیچے فٹ پاتھ پر ایک بھیا دو سماوار لیے ہوئے بیٹھا ہوتا ہے۔ سماوار کے نیچے دہکتی ہوئی آگ اور سماوار کے اندر ابلتی ہوئی کافی اور چائے۔ چائے سات پیسے کی، کافی دس پیسے کی۔ پیچھے پان اور سگریٹ کی دکان بھی ہے۔ مشتاق پان والا مینا کماری پر بہت سنجیدگی سے عاشق ہے۔ اس کی دکان میں جو آئینہ لگا ہے، اس پر مینا کماری کی درجن بھر سے زیادہ تصویریں چپکی ہوئی ہیں۔ آپ دیکھنا بھی چاہیں تو اپنی صورت نہیں دیکھ سکتے، اس لیے مینا کماری کی آنکھوں میں جھانک کر ہی اس کو تسلی دینی پڑتی ہے۔

پان کی دکان پر اور رولیکس ہوٹل کی پتھر کی سیڑھیوں پر شب زندہ داروں کی ایک محفل جمی ہوتی تھی۔ ان محفلوں میں کوئی بزرگ تو کبھی کبھار ہی آیا کرتے تھے، ہاں لونڈے لپاڑے بہت سے ہوتے تھے۔ کچھ لوگ ادب اور سیاست کی گرتی ہوئی صحت کے بارے میں پریشان ہوتے، کچھ لڑکے کرکٹ اور کوپریج پر ہونے والے فٹ بال کے میچ کے ہارنے اور جیتنے پر جھگڑتے ہوتے، اور کبھی کبھار کوئی سیاسی بحث بھی چھڑ جاتی، کیونکہ سو قدم آگے کمیونسٹ پارٹی کا آفس تھا اور لال باوٹے والے جب بھی آتے محفل کو گرما کے رکھ دیتے۔ میں نے بہت سی راتیں رولیکس ہوٹل کے ٹھنڈے پتھر پر بیٹھے بیٹھے گزاری ہیں۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ میں نے جو کمرہ کرائے پہ لے رکھا تھا وہ باندرہ ایسٹ کی ایم آئی جی کالونی میں تھا، اور وہاں جانے کا کوئی راستہ نہیں ہوتا تھا کیونکہ دو بجے تک بسیں اور لوکل ٹرینیں بند ہو جاتی تھیں۔ اس لیے کبھی کاتبوں کے بیٹھنے کی گدیاں ملا کے انقلاب کے دفتر میں سو جاتا اور کبھی کامریڈ عبدالجبار کی طرف سے لال باوٹا آفس کی بینچ پر کمر سیدھی کرنے کی اجازت مل جاتی۔ اور یہ بھی نہ ہو تو رولیکس کی سیڑھیاں تو مہمان نوازی کے لیے موجود ہی تھیں۔ مقصد تو رات کو صبح کرنا ہوتا تھا، اور رات کی ایک اچھی عادت یہ ہے کہ کسی طرح بھی کٹے مگر کٹ ضرور جاتی ہے، اور صبح ختم

Scanned with CamScanner

ٹھونکتی ہوئی سامنے آکھڑی ہوتی ہے:

کون ہوتا ہے حریف مے مرد افگن عشق

ایسی ہی ایک میلی کچیلی صبح تھی۔ میں رونیکس ہوٹل میں بیٹھا ہوا اپنی پہلی چائے ختم کر رہا تھا۔ پہلی اس لیے کہ جب گیارہ بجے سو کر اٹھو تو نیند کا نشہ ایک پیالی سے نہیں ٹوٹتا۔ اچانک سامنے کے فٹ پاتھ پہ کچھ ہلچل سی دکھائی دی۔ کچھ لڑکے جن کے ہاتھوں میں لال پرچم تھے، لپکتے ہوئے گزر رہے تھے۔ ان کے پیچھے دس پندرہ آدمیوں کی ایک چھوٹی سی ٹولی اور بھی تھی جن کے بیچ میں سلطانہ آپا سڑک پار کر رہی تھیں۔

لال بارڈر والی سفید ساڑی جس کا پلو تیز دھوپ سے بچنے کے لیے سر پہ لے لیا گیا تھا۔ گرمی کی شدت سے گورا رنگ سرخی مائل ہو گیا تھا، بڑی بڑی خوبصورت آنکھوں میں چمک تھی اور پتلے پتلے گہرے گلابی ہونٹوں پر ایک ایسی مسکراہٹ جوان کے ہونٹوں سے نہیں چہرے سے پھوٹتی ہوئی لگتی تھی۔ سلطانہ آپا کمیونسٹ پارٹی کے ٹکٹ پہ ناگپاڑے سے اسمبلی کا الیکشن لڑ رہی تھیں اور اسی سلسلے میں علاقے کے گلی محلوں میں گھوم رہی تھیں۔ میرے ذہن کے البم میں سلطانہ آپا کی یہ پہلی تصویر ہے۔

انقلاب میں میری تنخواہ تھی ایک سو بیس روپے۔ دوسرے اخباروں کے مقابلے میں یہ خاصی بڑی رقم تھی، کیونکہ دوسرے اخباروں کے مالک تو پچاس ساٹھ روپے سے زیادہ کا نام سنتے ہی نوکری مانگنے والوں کو بھگا دیا کرتے تھے۔ مگر ایک سو بیس روپے میں بھی کیا ہوتا تھا۔ پچاس ساٹھ روپے ماہوار تو ملباری کے ہوٹل میں دینا پڑتا تھا جو مہینے بھر تک دوپہر کا کھانا دھار کھلایا کرتا تھا اور کھانے کی رقم اپنی کاپی میں لکھتے وقت ہمیشہ بتا دیا کرتا تھا کہ ٹوٹل کتنا ہوا، تاکہ کھانے والا چادر سے باہر پاؤں نہ پھیلائے۔ کچھ پیسے اماں کو بھی بھیجنے پڑتے تھے۔ کمرے کا کرایہ بھی دینا پڑتا تھا جو زیادہ تر وعدوں کی صورت میں ادا ہوتا رہتا تھا۔ باقی اوپر کا خرچہ جس میں ایک نئی علت خستہ صاحب نے شامل کر دی تھی۔

خستہ صاحب میرے سامنے بیٹھا کرتے تھے۔ بہت دبلے پتلے تھے۔ کمزور تو میں بھی تھا مگر وہ اس قدر منحنی تھے کہ اگر جسم پہ کھال نہ ہوتی تو میڈیکل کالج والے ڈھانچہ سمجھ کے لے جاتے۔ کوٹ پہننے اور ٹائی لگانے کے بڑے شوقین تھے۔ کوٹ تو خیر ٹھیک تھا، ان کی کمزوری کو کسی حد تک چھپا لیتا تھا، مگر وہ نامراد ٹائی ان کی پتلی سی گردن کو اور زیادہ نمایاں کر دیتی تھی۔ بالکل ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے

تصویر کے نیچے سرخی لگی ہو۔ وہ چین سموکر تھے۔ ایک سگریٹ ختم نہیں ہونے پاتی تھی کہ ہاتھ کوٹ کی جیب میں جاتا، قینچی چھاپ سگریٹ کی ڈبیا باہر آتی، شمس صاحب ڈبیہ کو دیکھے بغیر ٹٹول کے ایک سگریٹ نکالتے اور ڈبیا میری طرف بڑھاتے ہوئے کہتے: "لیجیے لیجیے، سگریٹ لیجیے، پیجیے۔" اور میں بہت ادب سے عرض کرتا: "شکریہ، میں نہیں پیتا..." شمس صاحب کا سگریٹ پیش کرنے کا عمل شام سے رات تک اتنی بار ہوتا کہ غصہ آنے لگتا تھا، مگر میں جانتا تھا کہ وہ جان بوجھ کر مجھے تنگ نہیں کر رہے ہیں بلکہ مہمان نوازی اور مدارات ان کے کردار کا ایک حصہ ہے، کیونکہ آخر تھے تو لکھنؤ ہی کے۔

سگریٹ پیش کرنے اور انکار کرنے کا یہ سلسلہ مہینوں جاری رہا۔ مگر اس کے اندر پتھر تو ہوتا نہیں ہے، میری برف بھی پگھلنے لگی اور ایک دن میں نے شمس صاحب کا سگریٹ اس لیے قبول کر لیا کہ ایسے اچھے ساتھی کا دل آخر کتنی بار توڑا جا سکتا ہے۔

شروع میں تو میں یہ کرتا تھا کہ دھواں منہ میں بھرتا تھا اور نکال دیتا تھا۔ مگر سگریٹ پینے والے جانتے ہیں کہ یہ دھواں منہ کے اندر نہیں رکتا، یہ گلے سے اترتے وہاں تک پہنچ جاتا ہے جہاں پہنچ کر زندگی کا ایک حصہ بن جاتا ہے، اور پھر ایک دن زندگی کو ساتھ لے کر چلا جاتا ہے۔ شروع شروع میں تو کھانا کھانے کے بعد ایک سگریٹ بہت مزہ دیتی تھی، پھر اس کی ضرورت بڑھنے لگی۔ اور پھر کوئی بھی شریف آدمی مانگے کے سگریٹ پر کب تک گزارہ کر سکتا ہے، اس لیے میں نے اپنے پیکٹ منگانا اور شمس صاحب کے احسانوں کا بدلہ اتارنا شروع کر دیا۔ اس زمانے میں گولڈ فلیک کی ڈبیہ ایک روپے کی آتی تھی، اور مل بانٹ کر پی جائے تو ڈیڑھ دو پیکٹ روزانہ کا خرچ تھا۔ بالفاظ دیگر یہ کہ تقریباً چالیس پچاس روپے ماہوار کا خرچ بڑھ چکا تھا۔ بہت حساب لگایا، بہت کوشش بھی کی مگر ایک سو بیس روپے میں کھانا، چائے اور دیگر اخراجات کے ساتھ سگریٹ کسی صورت سے نہیں سمایا۔ مہینے کے آخر میں تو دو دن کے پیسے بھی نہیں بچتے تھے، اور کچھ کھانے پینے سے پہلے جیب میں ہاتھ ڈال کر انگلیوں سے پیسے گنا کرتا تھا کہ کہیں بل دیتے وقت بے عزتی نہ ہو جائے۔ ایسا ہی کوئی دن تھا جب کامریڈ جبار بھائی نے پوچھا: "کیا بات ہے کامریڈ، بڑے اجڑے اجڑے لگ رہے ہو؟"

میں نے جیب و دل کا سارا احوال سنا دیا۔

جبار بھائی ایک دم سے چپ ہو گئے اور سڑک پر گزرنے والوں کو دیکھنے لگے۔

Scanned with CamScanner

جبار بھائی میری زندگی میں کب اور کیسے گھس آئے تھے، مجھے یاد نہیں۔ بس اتنا یاد ہے، مجھ جیسے بہت سے نوجوانوں کے لیے، اور کچھ بزرگوں کے لیے بھی، ہر مرض کی دوا تھے۔ وہ جرنلسٹوں کی کوئی پربلم ہو، ہاتھ کرگھا والوں کے مسائل ہوں، بیکریوں میں بریڈ اور بسکٹ بنانے والوں کی پریشانی ہو، میونسپلٹی کا مسئلہ ہو یا حکومت کا، جبار بھائی ہر مورچے پر ڈٹ جایا کرتے تھے۔

وہ بہت دیر تک بسم اللہ ہوٹل کے باہر سڑک کی چہل پہل دیکھتے رہے۔ پھر اچانک میری طرف مڑے، مسکرائے اور بولے، ”اماں ہٹاؤ، یہ کوئی اتنا بڑا پرابلم نہیں ہے۔ کوئی رستہ نکال لیں گے۔ چلو چائے منگواؤ۔“

انھوں نے رستہ یوں نکالا کہ ایک دن صبح مجھے لے کر ٹیپین کی روڈ پہنچے جہاں سوویت انفارمیشن کا دفتر تھا۔ ایک بڑے سے ہال میں بہت سے لوگ لکھنے پڑھنے میں معروف تھے۔ جبار بھائی وہاں بیٹھے ہوئے سب لوگوں کو جانتے تھے اور سب لوگ انھیں جانتے تھے۔ ان میں مشہور جرنلسٹ اور کالم نگار لاجپت رائے تھے، گجراتی کے ادیب بنک دیسائی تھے اور دینا پاٹھک بھی تھیں جو بہت مشہور اسٹیج اور فلم ایکٹریس تھیں۔ کچھ دیر تک خیر خیریت پوچھنے کا سلسلہ جاری رہا اور پھر ہم ایک کمرے میں داخل ہوئے جہاں چاروں طرف کاغذوں، کتابوں ور اخباروں کے ڈھیر لگے ہوئے تھے، اور اس ڈھیر کے پیچھے ایک کرسی پہ سلطانہ آپا بیٹھی تھیں۔ وہ سینئر ایڈیٹر تھیں اور اردو وانگلش کے ڈپارٹمنٹ ان کے پاس تھے۔ آنکھوں میں وہی چمک، ہونٹوں پہ وہی مسکراہٹ تھی جو پورے چہرے سے پھوٹتی ہوئی محسوس ہوتی تھی۔ جبار بھائی نے تعارف کرایا۔ آپا نے مجھے بڑی ہمدردی اور پیار سے دیکھا اور پوچھا: ”چائے پیو گے؟“ میرے ہاں کہنے پر انھوں نے میز کے نیچے سے ایک تھرماس نکالا اور تھرماس کے اوپر لگے ہوئے پلاسٹک کے کپ میں چائے ڈال کر میری طرف بڑھا دیا، ور خود جبار بھائی سے باتیں کرنے لگیں۔ نہ انھوں نے مجھ سے کچھ پوچھا نہ میں نے بتایا۔ تھوڑی دیر بعد جب ہم لوگ جانے لگے تو آپا نے APN کے چار پانچ آرٹیکل میری طرف بڑھا دیے۔ ”انھیں ترجمہ کر کے لے آنا، مگر زبان ذرا آسان لکھنا۔“ آپا کے ساتھ یہ میری پہلی ملاقات تھی۔

روسی مضامین ملک کی مختلف زبانوں میں ترجمہ کیے جاتے اور اخباروں کو بھیج دیے جاتے۔ چونکہ اتنے سارے مترجم ملازم نہیں رکھے جا سکتے اس لیے ترجمے کا کام جاب ورک کے طور پر ہوتا تھا۔

Scanned with CamScanner

اور ہم جیسے بہت سے لوگ یہ ترجمے کرتے تھے اور ہمیں اس کا معاوضہ دیا جاتا تھا۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے، انگلش کے ایک صفحے کا ترجمہ کرنے پر سات روپے ملتے تھے۔ دس پانچ منٹ کی محنت کا یہ معاوضہ برا نہیں تھا مگر مشکل یہ تھی کہ سلطانہ آپا کسی ایک کو زیادہ کام دے کر جانب داری کا الزام اپنے سر نہیں لینا چاہتی تھیں۔ مہینے میں دو چار دفعہ چلا جاتا، جو ہاتھ آتا وہ اٹھا لاتا اور جو پیسے مل جاتے انھیں لے کر لینن کا شکر ادا کرتا۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا کہ، بقول بمبئی والوں کے، کھانے پینے کے واندے ہو جاتے۔ ایسے موقعوں پر دو ہی سہارے تھے: آل انڈیا ریڈیو یا پھر سلطانہ آپا۔ اور وہ بھی بلا کی چہرہ شناس تھیں، منھ دیکھ کر جیب کا حال جان لیا کرتی تھیں۔ کبھی کبھی ڈانٹ بھی دیا کرتیں۔ "کبھی تم تو مجھے نوکری سے نکلوا دو گے۔ ابھی آٹھ دن پہلے ہی تو..."

"آپ کا زمانہ بہت خراب ہے اور میرے حالات زمانے سے زیادہ خراب ہیں..." میں ڈھٹائی سے جواب دیتا۔ وہ مسکرا دیتیں۔ مسکراہٹ پورے چہرے پر پھیل جاتی۔ پھر وہ کوئی آرٹیکل پکڑاتے ہوئے کہتیں، "چلو، اس کونے میں بیٹھ جاؤ اور جلدی سے ترجمہ کر ڈالو۔" اور میں کسی کونے میں بیٹھ کر دو چار کاغذ کالے کرتا اور آپا کے پاس پہنچ جاتا۔ آپا مضمون کو دیکھتیں، ایک کاغذ پر ایک نوٹ بناتیں اور کہتیں، "لیجیے، یہ نوٹ اپنے پاس چھپا کر رکھ لو ورنہ نکل جائے گی۔"

سلطانہ آپا بھی عجیب سی درد مند خاتون تھیں۔ بہت ننھی منی سی خاتون تھیں۔ خود کو میز کے برابر کرنے کے لیے کرسی پر دو تین کشن رکھا کرتی تھیں۔ شاید اردو یا ہندی جانتی تھیں لیکن تھیں بڑی محبت کی۔ اردو کے دو چار جملے آتے تھے جنھیں وہ ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں ملا کے اس طرح بولتی تھیں کہ مزہ آ جاتا تھا۔

خود مضمون دیکھتیں، اور جتنا دیکھتیں، پھر ایک واؤچر بناتیں اور رسیدی ٹکٹ لگا کر دستخط لینے کے بعد نوٹوں کو دو تین بار گنتیں اور حوالے کرتے وقت میرے شکریہ کہنے سے پہلے خود ہی کہتیں، "شکریہ!"

شروع شروع میں تو آپا سے جتنی بھی ملاقاتیں ہوئیں وہ رسمی اور کاروباری تھیں۔ مگر دھیرے دھیرے یہ دوری کم ہوتی گئی۔ اکثر ایسا ہوتا کہ آپا فرصت سے ہوتیں اور ہم لوگ اپنی باتیں کرتے۔ آپا لکھنؤ کی رہنے والی تھیں اس لیے بڑی شائستہ زبان بولتی تھیں۔ لہجہ مدھم اور ٹھہرا ہوا اور آواز میں

Scanned with CamScanner

ایک ایسی مٹھاس تھی جو بہت دیر تک سننے کے بعد بھی کانوں پہ بار نہیں گزرتی تھی۔ ان کی باتوں میں عصمت آپا والی چٹکیاں تو نہیں ہوتی تھیں مگر تھوڑی دیر بعد ایک آدھ جملہ ایسا ضرور سنائی دیتا تھا جو ان کی حاضر جوابی اور حاضر دماغی کا ثبوت ہوتا تھا۔ آپا نے بتایا کہ امیٹھی کے ایک خاندانی رئیس منہاج الدین ان کے والد تھے۔ وہ چھ بہنیں تھیں جن میں سے تین، یعنی سلطانہ، خدیجہ اور آمنہ ایزابیلا تھوبرن (IT) کالج لکھنؤ میں پڑھا کرتی تھیں اور منہاج سسٹرز کے نام سے مشہور تھیں۔ مگر جیسا کہ یوپی کی عام بول چال میں جوان لڑکی کے نام کے ساتھ بی لگا دیا جاتا ہے، ان تینوں کے ساتھ بھی لگا ہوا تھا۔ یعنی سلطانہ بی خدیجہ بی اور آمنہ بی، اور اس رعایت سے کالج کے منچلے ان تینوں کو Three Bees کے نام سے یاد کیا کرتے تھے۔ یہ تینوں بہنیں پڑھنے لکھنے کے ساتھ ساتھ دوسری سرگرمیوں میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیتی تھیں۔

ہر سال جب دلی میں یوتھ فیسٹول ہوتا تو لکھنؤ کی نمائندگی کرنے والوں میں سلطانہ منہاج کا نام سب سے پہلے لکھا جاتا۔ یہیں وہ یوتھ فیسٹول تھے جہاں علی گڑھ کے ایک تیز طرار آتش بیاں مقرر علی سردار جعفری سے ان کی پہلی ملاقات ہوئی تھی۔ یہ الگ بات ہے کہ دونوں ایک دوسرے کے مقابلے پر تھے۔ پتا نہیں موضوع بحث کیا تھا، مگر جو بھی تھا، سردار جعفری نے اس کی دھجیاں اڑا کے رکھ دیں اور سلطانہ کا گروپ ہار گیا۔ مگر سلطانہ نہیں ہاریں۔ انھوں نے رات میں کیمپ فائر کے موقعے پر سردار جعفری کو پکڑ لیا اور اپنے موقف کی حمایت میں ایسی ایسی دلیلیں دیں کہ سردار جعفری کا منھ کھلا رہ گیا۔ انھوں نے حیرت سے پوچھا، ''ارے بھئی، آپ نے یہ سارے arguments اس وقت اسٹیج پر کیوں نہیں بولے؟'' سلطانہ ایک دم سے چپ ہو گئیں۔ سردار جعفری کے بار بار پوچھنے پر انھوں نے ایک شرمندہ سا جواب دیا، ''اس وقت میں بھول گئی تھی۔''

سلطانہ آپا نے جب یہ قصہ مجھے سنایا تو میں نے کہا، ''آپا، اس قصے میں تو نور جہاں اور جہانگیر والی کہانی کی بڑی شباہت ہے۔ میرا کبوتر کیسے اڑ گیا؟ ایسے اڑ گیا۔ اس سادگی پر تو کوئی بھی عاشق ہو جائے گا۔''

آپا کا چہرہ مسکراہٹ سے بھر گیا، آنکھوں میں چمک آ گئی مگر غصے میں بولیں، ''اے ہٹو، فالتو باتیں مت کرو۔ نہ کوئی عاشق ہوا تھا نہ کسی کو عشق ہوا تھا۔ میری شادی طے ہو چکی تھی۔''

Scanned with CamScanner

آپا نے پولیٹکل سائنس میں ایم اے کیا تھا۔ ان کی شادی ایک فوجی افسر شہاب الدین قریشی کے ساتھ ہوئی تھی جو ان کے چچازاد بھائی بھی تھے۔ اس شادی سے ایک بیٹی دردانہ (Guddo) پیدا ہوئی۔ مگر یہ رشتہ بہت دن تک قائم نہیں رہ سکا۔ دردانہ کا کہنا ہے کہ ان کے باپ اور ماں دونوں بہت اڑیل تھے۔ گرمسہ سے ہاں نکل گئی تو نہیں ہوگی اور نہ کہہ دیا تو ہاں کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ شہاب الدین صاحب کے بارے میں تو میں کچھ بھی نہیں جانتا مگر آپا کے ضدی ہونے پر یقین نہیں آتا۔ چالیس اکتالیس سال کی میل ملاقات میں آپا کے بہت سارے روپ میرے سامنے آئے مگر ان کی ضد یا ہٹ دھرمی کا کوئی نمونہ دیکھنے کو نہیں ملا۔ لیکن ہوسکتا ہے کہ آپا کی شخصیت کے کچھ ایسے پہلو بھی ہوں جو میری نظر سے چوک گئے ہوں، کیونکہ بہر حال ایک بیٹی اپنی ماں کو بہتر جانتی ہے۔

ہاں تو یہ ہوا کہ گڈو تین چار برس کی تھی جب طلاق ہوگئی۔ آپا نے آل انڈیا ریڈیو میں نوکری کرلی اور ان کی پوسٹنگ لاہور میں ہوئی۔ یہ وہ وقت تھا جب بٹوارے کی تیاریاں تقریباً مکمل ہوچکی تھیں اور دن گنے جارہے تھے کہ کب اس خوبصورت ملک کے چہرے پہ نفرت کے چاقو سے ایک لکیر ڈالی جائے گی اور ایک ایسا زخم بن جائے گا جو صدیوں تک خون دیتا رہے گا۔ فسادات شروع ہوچکے تھے۔ کسی کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کون کہاں رہ کے محفوظ رہے گا۔ لاہور کا اسٹیشن ڈائریکٹر ایک ہندو تھا۔ اس نے آپا کو بلایا اور پوچھا، ''اگر ملک تقسیم ہوا تو اس بات کا پورا امکان ہے کہ لاہور پاکستان کا ایک حصہ بنے گا۔ آپ اپنے ہم مذہبوں کے ساتھ یہاں رہنا پسند کریں گی یا۔۔۔؟'' آپا نے جواب دیا، ''میں ہندوستان جاؤں گی جو میرا وطن ہے۔'' اور اس طرح 1946 میں آپا نے اپنا تبادلہ بمبئی کرالیا۔ بمبئی پہنچ کر انھوں نے آل انڈیا ریڈیو کے کاموں سے زیادہ انجمن ترقی پسند مصنفین میں دلچسپی لینا شروع کی۔ اس وقت بمبئی ترقی پسند تحریک کا مرکز تھا اور وہ تمام لوگ جو اس تحریک کے روح رواں تھے بمبئی میں جمع تھے۔ اور ان میں علی سردار جعفری بھی تھے۔

اس زمانے میں دو باتیں ایک ساتھ ہوئیں۔ سلطانہ آپا کمیونسٹ پارٹی کے قریب آنے لگیں اور سردار جعفری سلطانہ آپا کے۔ اور 1948 میں ایک سادہ سی تقریب میں سلطانہ منہاج عرف سلطانہ قریشی، سلطانہ جعفری بن گئیں۔

کبھی کبھی ایسا ہوتا کہ میں مضامین لینے کے لیے سوویت انفارمیشن میں جاتا تو فریدہ کو بھی لے

جاتا، اور آپا بار بار پوچھتی تھیں، ''ارے بھئی، تم لوگ شادی کب کر رہے ہو؟'' اور میں ہمیشہ بات کو ٹال جایا کرتا تھا۔ ایک دن آپا کچھ زیادہ ہی سنجیدہ ہو گئیں۔ کہنے لگیں، ''لڑکی بہت اچھی ہے، جاوید۔ جتنی جلدی ہو سکے شادی کر لو، کیونکہ اچھی لڑکیوں کو رشتوں کی کمی نہیں ہوتی۔ اور مڈل کلاس کے ماں باپ کی سب سے بڑی خواہش یہی ہوتی ہے کہ جوان بیٹی جلدی سے رخصت ہو جائے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ فریدہ کے ماں باپ کسی اور کو ہاں کہہ دیں۔ تم تو خیر پچھتاؤ گے ہی، اس کی زندگی بھی برباد ہو جائے گی۔'' میں نے کہا، ''آپا، اتنی کم تنخواہ ہے، اوپر سے جو انکم ہوتی ہے وہ بھی آپ جانتی ہیں۔ سر کے اوپر اپنی چھت بھی نہیں ہے۔ فریدہ تو اپنے ماں باپ کی مرضی کے بغیر بھی شادی کے لیے تیار ہیں مگر ان کا سوال بھی یہی ہے کہ شادی کے بعد رہیں گے کہاں؟ آفس کی میز پر تو سونے سے رہے۔''

آپا نے اپنا ہاتھ زور سے ہوا میں گھمایا اور بولیں، ''سب ہو جاتا ہے، ہمت ہونی چاہیے۔ جب میری شادی ہوئی تھی تو سردار کے پاس کون سے بنگلے تھے؟ اندھیری کمیون میں رہتے تھے ہم لوگ۔ سردار پارٹی کے فل ٹائمر (Full-timer) تھے، ان کو سو روپے مہینہ ملتا تھا۔ اور میری تنخواہ 240 روپے تھی۔''

میں کچھ لاجواب سا ہو گیا۔ آپا نے کہا، ''جلدی کرو جلدی، ورنہ میں کسی دن خلافت ہاؤس جاؤں گی جہاں فریدہ رہتی ہے، اور اس کے ماں باپ سے کہوں گی کہ یہ لڑکا بالکل نکما اور ناکارہ ہے، آپ اپنی بیٹی کی شادی کسی اچھے گھر میں کر دیجیے۔ سوچ لو، تمھارا کیا انجام ہوگا۔'' وہ میرے زرد ہوتے ہوئے چہرے کو دیکھ کر بہت زور سے ہنسیں اور پھر بڑے رازدارانہ انداز میں دھیرے سے بولیں، ''کبھی مایوس مت ہونا۔ کبھی نہیں۔ چائے پیو گے؟''

یہ حقیقت ہے کہ شادی کے بعد آپا اور جعفری صاحب کافی بھٹکتے رہے مگر مایوس نہیں ہوئے۔ پہلے اندھیری کمیون میں رہتے تھے۔ لیکن چونکہ سردار جعفری کا حلقۂ کارکردگی لال باغ پریل کی ملوں سے لے کر مدنپورہ ناگپاڑے تک تھا اس لیے پارٹی نے دادر میں ایک کمرہ دے دیا۔ پھر بعد میں انھیں کھیت واڑی میں ریڈ فلیگ ہال میں منتقل کر دیا گیا جہاں اور بھی بہت سے کامریڈ رہتے تھے۔

آپا جب بھی ریڈ فلیگ ہال میں گزرے ہوئے اپنے دنوں کے قصے سناتیں تو بالکل ایسا لگتا جیسے کوئی اپنے بچپن کے ٹوٹے پھوٹے کھلونوں کو صاف کر کے، سہلا کے، پیار کر کے الماری میں سجا رہا ہو۔

Scanned with CamScanner

"کیفی اور موتی (شوکت کیفی) سامنے والے کمرے میں رہتے تھے۔ موتی بڑی سگھڑ ہے، اس نے اپنی چھوٹی سی بالکنی کو کچن بنا لیا تھا اور جب بھی اس کے کمرے سے کھانے کی خوشبو آتی تھی تو مجھے بہت غصہ آتا تھا۔"

"کھانے پر غصہ کیوں آتا تھا؟"

"بھئی، مجھے آملیٹ کے سوا کچھ بنانا نہیں آتا۔ کبھی کبھی قورمہ اور قیمہ بناتی ہوں یا ماش کی سفید دال۔ یہ کبھی اچھے بن جاتے ہیں تو کھانے والوں کی قسمت۔"

"ارے آپ کیسی لکھنؤ والی ہیں، کھانا بنانا نہیں جانتیں؟"

"بھئی یہ ہماری خاندانی مجبوری ہے۔ ہماری اماں کو بھی کھانا پکانا نہیں آتا تھا ورنہ ہماری بچی کو آتا ہے۔ مگر لکھنؤ کا اتنا شرف ضرور ہے کہ اچھے اور برے کھانے کی تمیز رکھتے ہیں، اچھے کھانے کے شوقین ہیں اور اس ادا میں کہیں بھی پہنچ سکتے ہیں۔"

یہ "شوقین" والی بات ذرا قابلِ غور ہے۔ سلطانہ آپا اچھے کھانے کی ہی نہیں، ہر طرح کے کھانے کی شوقین تھیں۔ عصمت آپا انھیں چٹوری کہا کرتی تھیں حالانکہ خود عصمت آپا بھی نہایت چٹوری تھیں۔ ہمارے دور کی چٹوری خواتین کہیں بھی، راہ چلتے بھی کھا سکتی تھیں، بس چٹپٹا ہونا چاہیے۔ اگر یقین نہ ہو تو انڈین ورلڈ (جہاں عصمت آپا رہتی تھیں) کے بیچ ہٹ سے ہونے والے چٹا چاٹ، بھیل پوری اور پانی پوری والوں سے پوچھ لیجیے۔ ہمارے ادب کی ان خواتین اول اور سلطانہ جعفری نے کھٹائی اور مرچیں کھانے کے کیسے کیسے ریکارڈ بنائے ہیں۔

آپا نے مجھے ریڈ فنیف ہال کے زمانے کے بہت سے گفتنی اور ناگفتنی قصے سنائے تھے جن میں سے چند اب تک یاد ہیں۔ انھوں نے بتایا تھا کہ ایک مرتبہ رئیس المتغزلین حضرت جگر مرادآبادی بھی آئے ہوئے تھے۔ انھوں نے رات کو مشاعرہ پڑھا اور صبح اچانک غائب ہو گئے۔ چاہنے والے تو چاہنے والے، نہ چاہنے والوں میں بھی کھلبلی مچ گئی کہ جگر صاحب کہاں چلے گئے۔ جہاں جہاں جانے کے امکانات تھے وہاں وہاں فون کیے گئے، جان پہچان والوں سے پوچھ تاچھ کی گئی مگر جگر صاحب کا کوئی پتہ نہیں چلا۔ مجروح صاحب خاص طور سے پریشان تھے، کیونکہ ایک تو یہ کہ وہ جگر کو اپنا استاد سمجھتے تھے، دوسرے یہ کہ شرابی آدمی ہے، خدانخواستہ کوئی حادثہ نہ پیش آ گیا ہو۔ شام کو جب ہانپتے

Scanned with CamScanner

کانپتے مجروح سلطانپوری سردار جعفری کو جگر صاحب کی گمشدگی کی منحوس خبر سنانے کے لیے ریڈ فلیگ ہال پہنچے تو دیکھا کہ کمرے میں محفل جمی ہوئی ہے۔ جگر صاحب، سلطانہ جعفری، سردار جعفری اور ایک سی آئی ڈی انسپکٹر یوسف خاں صاحب رمی کھیل رہے ہیں۔ پورا کمرہ دھوئیں سے بھرا ہوا ہے اور چٹائی پر سگریٹوں کے چھوٹے چھوٹے ڈھیر لگے ہوئے ہیں۔ مجروح اپنا سر پکڑ کے بیٹھ گئے اور انھوں نے جگر صاحب سے کہا: ''قبلہ، آپ کو معلوم ہے کہ سارا شہر آپ کے لیے کس قدر پریشان ہے۔'' جگر صاحب نے بڑی سنجیدگی سے جواب دیا: ''میاں مجروح، آپ ذرا میری پریشانی دیکھیے، ایک پتے کے لیے ہاتھ روکے بیٹھا ہوں۔''

آپا نے بتایا کہ جگر صاحب کے ریڈ فلیگ ہال میں آنے کی اصلی وجہ یہ نہیں تھی کہ وہ رمی کے بہت شوقین تھے اور جب بھی آتے تو وقت نکال کر آپا سے دو دو ہاتھ ضرور کرتے، بلکہ اصلی وجہ یہ تھی کہ کوئی فلم اسٹار (شاید دلیپ کمار) جگر صاحب کی ماں مدد کرنا چاہتا تھا اور جگر صاحب اسے منع بھی نہیں کر سکتے تھے، اس لیے چپکے سے بھاگ کھڑے ہوئے تھے۔

آپا کا رمی کا شوق تو میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ دیوالی سے کئی دن پہلے کیفی صاحب کے گھر پر پتے بازی شروع ہو جاتی ہے۔ (یہ روایت اب بھی قائم ہے۔) سلطانہ آپا جب تک زندہ رہیں، ہمیشہ ان محفلوں میں شریک ہوتی رہیں۔ لیکن ان کی اصلی رمی پارٹنر عصمت آپا تھیں اور جب بھی موقع ملتا تھا، عصمت آپا پتے نکال کر شروع ہو جاتی تھیں، اور جب جیتتی تھیں تو سارے پیسے بچوں میں بانٹ دیا کرتی تھیں۔ دردانہ کا کہنا ہے کہ جب بھی اماں اور عصمت خالہ رمی کھیلنے بیٹھتی تھیں تو بچے کچھ دور بیٹھ کر زور و شور سے دعائیں مانگا کرتے تھے کہ اللہ عصمت خالہ کو جتا دے اور ہمیں کے رستم کی آئس کریم ملے۔

دو گواہوں، عصمت چغتائی اور لاجپت رائے کا کہنا ہے کہ سلطانہ آپا زندگی میں جتنی ایماندار تھیں، تاش کھیلتے وقت اتنی ہی بے ایمانی کرتی تھیں۔ اکثر ایسا ہوتا تھا کہ ان پر نظر رکھنے کے لیے کسی بچے کو بٹھایا جاتا تھا تاکہ وہ پتوں کی ہیرا پھیری نہ کر سکیں یا پوائنٹس کم کر کے نہ بتائیں۔

ریڈ فلیگ ہال کے زمانے کی بات ہے کہ ایک دن سردار جعفری کی بہن رباب جعفری نے آپا کے کان میں کہا: ''آج موتی کے یہاں کھانا نہیں پکا ہے۔ شاید پیسے نہیں ہیں۔''

Scanned with CamScanner

کمرے آمنے سامنے تھے۔ آپا نے جھانک کے دیکھا تو ربو کی بات کی تصدیق ہو گئی۔ اسٹوو خاموش تھا، اس کے اوپر کوئی برتن بھی نہیں تھا، اور شوکت آپا (موتی) دیوار سے پیٹھ لگائے پکوڑی رہی تھیں۔

آپا نے جعفری صاحب کو بتایا اور بیس روپے دے کر کہا کہ کسی صورت سے موتی کو دے دیں۔ مگر یہ کوئی آسان کام نہیں تھا۔

"کیفی اور شوکت کسی قیمت پر قبول نہیں کریں گے۔ اور کیفی تو ایسے ہیں کہ برا مان گئے تو ہفتوں بات بھی نہیں کریں گے..."

"ارے تو کیا وہ لوگ ایسے ہی بیٹھے رہیں گے؟" آپا پریشان ہو گئیں۔

بہت غور کرنے کے بعد ایک ترکیب نکال لی۔

جعفری صاحب خیریت دریافت کرنے کے لیے کیفی صاحب کے کمرے میں گئے، کچھ اِدھر اُدھر کی باتیں کیں اور بیس روپے ایک کتاب کے نیچے رکھ کے چلے آئے اور اطمینان کا سانس لیا کہ اتنا بڑا مسئلہ اتنی آسانی سے حل ہو گیا۔ مگر کوئی دو گھنٹے بعد شوکت کیفی آپا کے روم میں دندناتی ہوئی داخل ہوئیں، بیس روپے ان کی انگلیوں میں لہرا رہے تھے۔ انھوں نے چھوٹتے ہی پوچھا، "سردار بھائی، یہ پیسے آپ رکھ کے آئے تھے نا؟"

"پیسے، کون سے پیسے؟" سردار جعفری نے بڑی معصومیت سے پوچھا۔

"یہ بیس روپے۔"

"نہیں موتی، یہ روپے میرے نہیں ہیں۔" سردار جعفری نے بے حد ایمانداری کے ساتھ کہا۔

"تو سلطانہ نے رکھے ہوں گے۔"

"میں تو تمھارے روم میں گئی ہی نہیں۔"

شوکت آپا پریشان ہو گئیں۔ انھوں نے دونوں کو دیکھا، سلطانہ اور سردار جعفری کے چہروں کو دیکھا، اور پھر جیسے خود سے پوچھا، "آپ لوگوں نے نہیں رکھے تو پھر یہ آئے کہاں سے؟"

"تم یا کیفی رکھ کے بھول گئے ہوگے۔" سلطانہ آپا نے بڑے پیار سے سمجھایا۔ "فالتو ہوں تو مجھے دے دو۔"

شوکت آپا بہت دیر تک کچھ سوچتی رہیں، پھر چپ چاپ واپس چلی گئیں۔ اور تھوڑی دیر بعد

جب کیفی صاحب کے کمرے سے اسٹوو کی آواز سنائی دی تو سردار جعفری لکھنا چھوڑ کے بہت دیر تک اسے سنتے رہے، پھر بولے، "سلطانہ، آج تم نے بہت بڑا کام کیا ہے۔" مگر سلطانہ آپا خوش نہیں ہوئیں، اور میرے سے بولیں، "اس بات کا افسوس ہے کہ میرے پاس بیس ہی روپے تھے۔"

ایک دن میں دھک سے رہ گیا۔

پتا چلا کہ آپا فریدہ کے گھر پہنچ گئی تھیں اور بہت دیر تک بیٹھی بھی رہی تھیں۔

حالانکہ تب تک بہت سے انقلاب آ چکے تھے۔ میں اپنا شام نامہ اردو رپورٹر نکالنے لگا تھا جو گھٹنیوں چلنے کی کوشش کر رہا تھا، سرکار نے دو کمروں کا ایک گھر بھی دے دیا تھا اور فریدہ کے گھر والے بھی تقریباً راضی ہو گئے تھے، سوائے ان کے بھائیوں کے، اور فریدہ کے پارسی رشتے داروں کی طرف سے کوشش اس بات کی ہو رہی تھی کہ سانپ مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے، یعنی کوئی ہنگامہ بھی نہ ہو اور بیٹی رخصت بھی ہو جائے۔

بظاہر سب ٹھیک تھا مگر سلطانہ جعفری کا خلافت ہاؤس میں (جہاں فریدہ کی فیملی رہتی تھی) ورود اور ان کے اہل خاندان سے ملاقات مجھے اس لیے خوفزدہ کر رہے تھے کہ آپا نہایت منھ پھٹ واقع ہوئی تھیں۔ پولیٹکل سائنس میں ڈگری لینے کے باوجود سیاست، ڈپلومیسی اور موقع شناسی کی سخت دشمن تھیں۔ میں ڈر رہا تھا کہ خدا جانے کیا بول بیٹھی ہوں اور میری محبت کی کہانی ایک الیے پر ختم ہو جائے۔

میں ان کے آفس پہنچا تو وہ کچھ زیادہ ہی خوش دکھائی دیں۔ مسکراہٹ چہرے کی حدوں سے باہر تک پھیلی ہوئی تھی اور آنکھوں میں ایک شریری چمک تھی۔ مجھے دیکھتے ہی بولیں، "بھئی تمھاری ساس کو تو میں جانتی ہوں۔ میرے ساتھ Adult Education پروگرام میں کام کیا کرتی تھیں۔ انھوں نے دھان ساگ بنا کے کھلایا۔ مزہ آ گیا۔"

"آپ، وہاں کوئی ایسی ویسی بات تو نہیں ہوئی؟"

"ایسی ویسی بہت سی باتیں ہوئیں... تمھارے خلافت ہاؤس میں چوہے کتنے ہیں، ایک تو میرے پیروں کے اوپر سے گزر گیا۔ یہ تمھارے چچا زاہد شوکت علی صاحب چوہے بھی نہیں مار سکتے کیا؟"

"آپ نے یہ تو نہیں بتایا کہ فریدہ میرے ساتھ یہاں آیا کرتی ہیں؟"

"فریدہ گھر میں نہیں تھی۔ اس کی چھوٹی بہن تھی۔ وہ بھی بہت پیاری ہے۔"

Scanned with CamScanner

''میرے بارے میں کیا بات ہوئی؟''

''مرے کیوں جا رہے ہو؟ میں نے تمھارا نام بھی نہیں لیا۔ انھیں تو یہ بھی نہیں معلوم کہ میں تم جیسے فالتو آدمی کو جانتی ہوں۔''

''تو پھر آپ وہاں گئیں کیوں تھیں؟''

''دیکھنے گئی تھی کہ جو لوگ لاٹھیوں سے تمھاری پٹائی کی دھمکیاں دے رہے ہیں، ان کے پاس لاٹھیاں ہیں بھی یا نہیں؟''

''مذاق مت کیجیے آپا...''

آپا سنجیدہ ہو گئیں۔ ''جاوید، اب تم اپنی شادی کا اعلان کر دو۔ اور ایک اچھا سا ریسیپشن دو۔ میں شہاب الدین دسنوی سے کہہ دوں گی، وہ صابو صدیق کا ہال دے دے گا۔ سردار کا دوست ہے، پیسے بھی نہیں لے گا۔''

''مگر اتنی جلدی؟''

''دس فروری بہت اچھی تاریخ ہے۔ برتولت بریخت کی سالگرہ کا دن ہے۔''

''برتولت بریخت سے میرا کیا تعلق؟''

''بریخت کا تعلق ترقی پسند سے ہے۔ تو میں دسنوی کو فون کروں؟''

''فروری تک کیسے ممکن ہے آپا؟''

''فروری دو مہینے دور ہے، اور اتنے دن میں بہت کچھ ہو سکتا ہے۔''

''وہ تو ٹھیک ہے مگر اور بھی تو ضرورتیں ہیں۔''

''کیا ضرورتیں؟... تم نے کیا انتظام کیا ہے؟ مجھے بتاؤ۔''

''تھوڑا بہت کیا ہے، مگر پھر بھی کم ہے۔''

''ٹھیک ہے، تم کل آنا اور بتانا کیا لیا ہے۔ پھر بات کریں گے۔''

میں رات بھر سو نہیں سکا۔ آپا کی محبت سر آنکھوں پر مگر انھوں نے تو الٹی میٹم دے دیا، ورنہ بھی ایسا کر نہ ہاں کہہ سکتا ہوں نہ نہ۔

دوسرے دن پہنچا تو آپا میٹنگ میں تھیں۔ ماسکو سے کچھ روسی آئے ہوئے تھے۔ بند کمرے

Scanned with CamScanner

میں بحث چھڑی ہوئی تھی اور میں باہر ایک کونے میں چپ چاپ بیٹھا پریشان ہو رہا تھا۔

چار بجے کے قریب آپا باہر آئیں۔ رات بھر جاگنے اور پانچ گھنٹے انتظار کرنے کی کہانی میرے چہرے پر لکھی ہوئی تھی۔

آپا نے معذرت کی اور وہ فہرست دیکھی جو میں نے بنائی تھی۔ بولیں: "سارا بندوبست تو ہے، اور کیا چاہیے؟"

میں نے کہا: "میری طرف سے دو چار جوڑے اور کچھ زیور بھی تو ہونا چاہیے۔"

"زیور کس لیے؟ مارکسسٹ بیویاں زیور نہیں پہنتیں۔"

میں جھنجھلا گیا۔ میں نے آواز ذرا سی اونچی کر کے کہا: "فریدہ مارکسسٹ نہیں ہیں اور نہ ان کے گھر والے..."

آپا نے ایک کھنکتا ہوا قہقہہ لگایا اور بولیں: "پھولوں کے زیور پہناؤ، پھولوں کے..."

پھول آپا کی کمزوری تھے، خاص طور سے موگرہ۔ جب بھی موگرے کی لڑیاں مل جاتیں، ان کے کنگن بنا کے پہنتیں، بالوں میں لگاتیں اور بہت سی کلیاں چاندی کی بالیوں میں پرو کر کانوں میں بکا لیتیں۔ ان کی بالیاں کیا تھیں، چاندی کا پتلا سا تار تھا جسے گول کر کے کان میں ڈال لیا کرتی تھیں، اور جب پھول مل جاتے تو اسی چاندی کے تار کو موگرے سے بھر دیتیں۔

1995 کی بات ہے۔ آپا علی گڑھ میں تھیں۔ میرس روڈ پر موگرا دکھائی دیا تو سائیکل رکشا سے نیچے اتر گئیں۔ پلو بھر کے کلیاں خریدیں اور رکشا میں بیٹھ کر موگرے کی بالیاں بنانے لگیں۔ جھٹکا لگا تو کچھ پھول رکشا کے پائیدان میں گر پڑے۔ آپا اٹھانے کے لیے جھکیں تو دوسرا جھٹکا لگا اور آپا سڑک پر اس طرح گریں کہ ہاتھ کی ہڈی تین جگہ سے ٹوٹ گئی مگر موگرے کے پھول ہاتھوں سے نہیں چھوٹے۔

آپا کے چاہنے والے جب بھی ان سے ملنے جاتے، اگر موسم ہوتا تو موگرے کے پھول ضرور لے جاتے۔ اور آپا انھیں اپنی مشہورِ زمانہ چائے پلاتیں۔ دردانہ نے بتایا کہ علی رضا جب بھی جاتے تھے، موگرے کی کم سے کم پانچ وینیاں لے کر جاتے، اور پوچھنے پر بڑے پیار سے کہتے: "بھئی، یہ وینی نہیں ہے، یہ تو سلطانہ کی رشوت ہے۔ اب وہ ہمیں لاپ چو (Lopchu) پلائیں گی۔"

یہ پھولوں والی بات تو یوں ہی برسبیلِ تذکرہ آ گئی۔ اصل مسئلہ یہ تھا کہ آپا میری شادی کرانے پہ تلی ہوئی تھیں اور میری حالت وہی تھی جو ایک اناڑی ایکٹر کی ہوتی ہے: وہ اسٹیج پہ آ تو جاتا ہے مگر ہاتھ پاؤں کانپتے ہوتے ہیں، زبان سوکھ جاتی ہے، ڈائیلاگ یاد نہیں رہتے اور اس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ اسٹیج پر کھڑا رہے یا بھاگ جائے۔ میں بھی راتوں کو جاگ کر یہی سوچ رہا تھا کہ کس جنجال میں پھنس گیا ہوں۔ لوگوں کی شادیاں ہوتی ہیں تو خوشیاں ہوتی ہیں، ایک نئی زندگی کا آغاز ہوتا ہے۔ یہاں یہ عالم ہے کہ آغاز سے پہلے انجام کا ڈر سونے نہیں دیتا۔

میں کئی دن تک نہیں گیا تو آپا کا فون آیا۔ ''کیا ہوا، کیا بیمار ہو؟''

''جی نہیں، ذرا مصروف تھا۔''

''میں نے دسنوی کو فون کر دیا ہے۔ دس فروری کو چھوٹا والا ہال مل جائے گا۔''

میرے ہاتھ پاؤں سچ مچ ٹھنڈے ہو گئے۔ سوچنا چاہتا تھا مگر سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا سوچوں۔ سونے پہ سہاگہ یہ کہ کامریڈ حمید مل گئے۔ بہت دبلے پتلے آدمی تھے۔ پیر خان اسٹریٹ میں ٹیلرنگ کی دکان تھی۔ نہایت متقی مارکسسٹ تھے، یعنی نماز پابندی سے پڑھتے تھے اور کمیونسٹ پارٹی کے سرگرم رکن بھی تھے۔ مجھے دیکھ کر انھوں نے ایک بل کھایا (باتیں کرتے کرتے بل کھانا ان کی عادت تھی) اور مسکرا کے پوچھا: ''تم شادی کر رہے ہو؟''

''آپ کو کس نے بتایا؟''

''سلطانہ آپا ملی تھیں، وہی بتا رہی تھیں۔''

میرا دل چاہا کہ میں اپنا سر پیٹ لوں اور کامریڈ حمید کو دھکا دے کے بھاگ جاؤں، مگر ان کے اگلے جملے نے روک لیا: ''کپڑا لا دینا، سوٹ ہم سی دیں گے۔ ہماری طرف سے تحفہ۔'' میں نے ایک پل کو آنکھیں بند کیں اور تصور کیا کہ جب ان پچاس کلو ہڈیوں پر ایک سوٹ ہوگا، پتلی سی گردن میں شمس الحق شمس کی طرح ایک ٹائی ہوگی، سر پہ بڑے بڑے بال ہوں گے اور ایک بڑی سی ناک پہ موٹا سا چشمہ ہوگا، تو میں کیسا نظر آؤں گا۔ میرے تصور کی پرواز کو داد دیجیے کہ میں اپنی شادی کے البم میں بالکل ویسا ہی نظر آتا ہوں جیسا سوچا تھا۔ جو بھی ہماری شادی کی تصویریں دیکھتا ہے بڑی حیرت سے فریدہ کو ضرور دیکھتا ہے۔ کئی ہمدردوں نے تو دبی زبان میں ان سے پوچھ بھی لیا ''بی بی، جب تم

نے اس شادی کو ہاں کہی تو کیا تم اپنے پورے ہوش وحواس میں تھیں؟''

بات کامریڈ حمید پر ختم ہو جاتی تو بھی غنیمت تھا۔ دو تین دن کے اندر اندر یہ خبر اخباری ضمیمے کی طرح پھیل گئی کہ میری شادی ہو رہی ہے، ہال بک ہو چکا ہے، کامریڈ حمید سوٹ سی رہے ہیں، جبار بھائی نے چار گز امپورٹیڈ کپڑا لا کے دیا ہے جو صابو صدیق مسافر خانے کے باہر دکانیں لگانے والے اسمگلروں سے خریدا گیا ہے۔

ہندوستان کے ایڈیٹر غلام احمد خاں آرزو نے اس وقت پکڑ لیا جب میں ان کے دفتر کے نیچے ایک دکان سے سگریٹ خرید رہا تھا۔ ''مبارک ہو، سنا ہے تم شادی کر رہے ہو؟''

''جی،'' میں نے نہایت انکساری سے جواب دیا۔

''بہت اچھی بات ہے، سب کو شادی کرنی چاہیے۔ مگر کورٹ میرج ہے یا نکاح مسنونہ؟''

''آپ کو معلوم کیسے ہوا؟'' میں نے پوچھا۔

''راہی نے بتایا۔''

میں فوراً سمجھ گیا کہ محمود راہی کو کس نے بتایا ہوگا۔ راہی ہر ہفتے مضامین کا ترجمہ کرنے کے لیے آپا کے پاس جایا کرتا تھا۔ مطلب یہ کہ محترمہ سلطانہ جعفری، جنھیں سوویت انفارمیشن آفس میں بیٹھ کر روس کی ترقی اور کامیابی کی خبریں پھیلانا چاہیے تھا، ان دنوں جاوید صدیقی کی شادی خانہ آبادی کی خبروں میں زیادہ دلچسپی لے رہی تھیں۔

میں بڑے خراب موڈ میں آپا کے پاس پہنچا۔ وہ خواجہ احمد عباس سے باتیں کر رہی تھیں۔ مجھے دیکھتے ہی عباس صاحب سے بولیں، ''تم انھیں جانتے ہو نا عباس؟ یہ اپنے جاوید صدیقی ہیں۔ دس فروری کو ان کی شادی ہے۔'' میں تو پہلے ہی سے جلا بھنا تھا، بھڑک کر بولا، ''شادی کیسے ہوگی آپا، ابھی تک ایک انگوٹھی تک کا تو بندوبست نہیں ہوا ہے۔''

''ہے ہے، ابھی تک نہیں ہوا؟''

میں سر جھکا کے بیٹھ گیا۔ آپا کچھ سوچتی رہیں، پھر بولیں، ''تم ایک کام کرو، یہ چیک میرا چیک ہے اور یہ میرا اکاؤنٹ نمبر ہے۔ جا کے معلوم کرو، اکاؤنٹ میں پیسے کتنے ہیں؟''

میں خود کو گالیاں دیتا ہوا مبارک ہال سے نیچے اترا۔ آپا کے بینک سے ان کا بیلنس معلوم کیا تو دل

Scanned with CamScanner

بیٹھ گیا۔ ان کے اکاؤنٹ میں صرف 800 روپے تھے۔ میں سمجھ گیا کہ آپا معافی مانگ لیں گی اور میری حالت اس مچھلی جیسی ہوگی جو کانٹا نگل لیتی ہے اور تڑپنے کے سوا کچھ نہیں کر سکتی۔ میں پسینے اور تھکن سے نڈھال ان کے آفس پہنچا اور تھکے ہوئے لہجے میں بولا: ''آپ کے اکاؤنٹ میں تو پیسے ہی نہیں ہیں، بس 800 روپے پڑے ہوئے ہیں۔'' ان کے ماتھے پر کوئی بل آیا نہ آنکھوں میں شرمندگی کی جھلک دکھائی دی۔ ''تو اور کتنا ہوگا۔ تمھاری قسمت اچھی ہے کہ اتنے بھی بچ گئے۔'' انھوں نے اپنی چیک بک نکالی اور چیک لکھنے لگیں: ''سات سو تم لے جاؤ، سو روپے چھوڑنا ضروری ہے ورنہ کھاتہ بند ہو جائے گا۔''

سستے کا زمانہ تھا۔ ساڑھے چار سو روپے تولہ سونا تھا۔ آپا کے پیسوں کی مدد سے ایک سیٹ خریدا گیا جو فریدہ کے پاس آج تک ہے اور وہ کسی کو ہاتھ بھی لگانے نہیں دیتی ہیں۔ کچھ اس لیے کہ وہ ان کی شادی کا چڑھاوا ہے اور کچھ اس لیے کہ اس کے ساتھ آپا کی یاد جڑی ہوئی ہے۔ نہ سونا بوڑھا ہوا ہے اور نہ سلطانہ آپا کی یاد۔

ہماری شادی کے ریسپشن میں آپا شریک نہیں ہو سکی تھیں۔ وہ جعفری صاحب کے ساتھ کہیں باہر گئی ہوئی تھیں۔ مگر انھوں نے کسی کے ہاتھ ایک لفافہ بھیجا تھا جس میں 51 روپے تھے اور ایک کاغذ پر سردار جعفری کے دو شعر لکھے ہوئے تھے۔ وہ پرچہ تو کہیں کھو گیا، وہ شعر بھی اب یاد نہیں۔ جعفری صاحب کے اشعار ویسے بھی ذرا مشکل سے یاد رہتے ہیں۔ اس بات پر سلطانہ آپا سے کئی بار بحث ہوئی کہ سردار جعفری شاعر اچھے ہیں، نثر اچھی ہے، ادیب اچھے ہیں، یا لیڈر بہت اچھے ہیں۔ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ آپا کی رائے کیا رہی ہوگی۔ سردار جعفری کا ہر لفظ، چاہے وہ کاغذ پر ہو یا زبان پر، انھیں تو اوپر سے اترا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ ایک مرتبہ میں نے انھیں چھیڑنے کی نیت سے کہا: ''سردار جعفری کی شاعری بڑی روکھی پھیکی شاعری ہوتی ہے۔ پڑھ کر کچھ مزہ ہی نہیں آتا۔'' اس دن آپا سچ مچ برا مان گئیں۔ ''تم تو لوگوں کی سنی سنائی باتیں مت دہرایا کرو۔ جو لوگ سردار کی شاعری کو پھیکا اور بے مزہ کہتے ہیں وہ شاعری نہیں کرتے، برف کے گولے بیچتے ہیں، جو رنگین بھی ہوتے ہیں اور ٹھنڈے میٹھے بھی، مگر کتنی دیر کے لیے؟... میرے خیال میں 'ہاتھوں کا ترانہ' اردو کی بے مثال نظموں میں سے ایک ہے۔

Scanned with CamScanner

ان ہاتھوں کی تعظیم کرو
ان ہاتھوں کی تکریم کرو
دنیا کو چلانے والے ہیں
ان ہاتھوں کو تسلیم کرو

کیا تم اس نظم کی اہمیت اور موضوع کی سچائی سے انکار کر سکتے ہو؟''

میں اگر انکار کرنا بھی چاہتا تو نہیں کرتا، کیونکہ آپا کا دل دکھانے سے بڑا گناہ کوئی دوسرا نہیں ہو سکتا۔ شاعری پر بات نکلی ہے تو عرض کروں کہ سردار جعفری نے لکھا ہے، 'ہر عاشق ہے سردار یہاں ہر معشوق سلطانہ ہے'، مگر آپا کو جاننے والے جانتے ہیں کہ یہ جھوٹ ہے۔ سلطانہ معشوق نہیں تھیں، وہ عاشق تھیں۔ انھوں نے اپنے سردار کو جس طرح پیار کیا اس کی کوئی مثال مجھے تو نہیں دکھائی دیتی۔ جب سلطانہ آپا اور سردار جعفری کی شادی ہوئی تو ہر اچھے شوہر کی طرح جعفری صاحب کو بھی لگا کہ انھیں کام کرنا چاہیے، اور وہ نوکری حاصل کرنے کے لیے جگہ جگہ درخواستیں بھیجنے لگے۔ آپا کو معلوم ہوا تو انھوں نے وہ ساری درخواستیں پھاڑ کر پھینک دیں اور کہا، ''تم بیوی بچوں کا پیٹ پالنے کے لیے نوکری نہیں کرو گے۔ تمھارا کام ادب کی تخلیق ہے، تم وہی کرو۔ گھر کیسے چلے گا، کہاں سے چلے گا، کون چلائے گا، آج سے یہ ذمے داری میری۔''

آپا ستر سال کی عمر تک کام کرتی رہیں۔ انھوں نے جو وعدہ کیا تھا، آخر تک نبھایا۔ آمدنی کم تھی، گھر چھوٹا تھا اور رہنے والے زیادہ۔ دو بچے، پپو اور چنم، سردار جعفری کی دو بہنیں، رباب اور ستارہ، خود سردار جعفری اور آپا۔ مہمانوں اور آنے جانے والوں کا سلسلہ بھی لگا ہی رہتا تھا۔ مگر ان کے چہرے کی مسکراہٹ کبھی مدھم نہیں ہوئی۔

ایسا نہیں ہے کہ سردار جعفری نے واقعی کوئی کام نہ کیا ہو۔ انھوں نے فلم بنائی، سیریل بھی بنائے، رسالے بھی نکالے، مگر ان کا سب سے بڑا کارنامہ وہ تین کتابیں ہیں جو ان کی انتھک محنت اور برسوں کی تحقیق کا نتیجہ ہیں۔ یہ کتابیں ہیں دیوان میر، دیوان غالب اور کبیر بانی، جو اس طرح شائع کی گئی ہیں کہ اردو کا ہر لفظ سامنے والے صفحے پر ہندی میں بھی موجود ہے۔ جعفری صاحب کا ارادہ تھا کہ اردو کا تمام ادب اور مشہور شاعروں کے دیوان اسی طرح شائع کیے جائیں تاکہ ہندی اور

Scanned with CamScanner

اردو والے دونوں ایک ہی وقت میں مزہ لے سکیں۔ یہ تینوں کتابیں اب تقریباً نایاب ہیں، خاص طور سے دیوان غالب۔ ایک دن میں نے آپا سے کہا، ''کہیں سے بھی کر کے دیوان غالب کی ایک جلد لا کر دیجیے۔'' کہنے لگیں، ''سردار والا دیوان غالب تو میرے پاس بھی نہیں ہے مگر میرا اپنا جو ہے وہ میں تم کو دے دوں گی۔''

''کب دیں گی؟'' میں نے پوچھا۔ آپا بہت پیار سے مسکرائیں اور بولیں، ''جب وقت آئے گا۔''

میں تو یہ بات بھول بھی چکا تھا مگر آپا کو یاد تھی۔ ان کے انتقال سے کچھ دن پہلے مجھے ایک پیکٹ ملا۔ کھولا تو اس میں آپا کا ذاتی نسخہ رکھا ہوا تھا جس پر لکھا تھا:

''جاوید صدیقی، یہ دیوان غالب ہے۔ یہ صرف تمھارے لیے ہے بلکہ فریدہ کے لیے بھی ہے۔ اور ہاں تمھاری اولاد کے لیے۔ اور تمھاری اولاد کی اولاد کے لیے، تمام پیار اور خلوص کے ساتھ... سلطانہ۔

1-8-2003''

آپا نے اپنا وعدہ پورا کر دیا تھا۔

آپا بہت بہادر تھیں، وہ نہ زندگی سے ہاریں نہ انسانوں سے۔ بس ایک دفعہ میں نے آپا کی آنکھوں میں نمی دیکھی تھی۔ یہ مارچ 2000 کی بات ہے۔ میں ان سے ملنے گیا اور میں نے کہا، ''میں اپٹا کے لیے ایک ڈاکیومنٹری بنا رہا ہوں جس کے لیے جعفری صاحب کا انٹرویو بہت ضروری ہے۔ کیونکہ وہ انڈین پیپلز تھیٹرز ایسوسی ایشن (IPTA) کے بانیوں میں سے ایک ہیں۔'' آپا کہنے لگیں، ''سردار کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ پتا نہیں کیا ہو گیا ہے، بھولنے بہت لگے ہیں۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ بولتے وقت کوئی لفظ بھول جاتے ہیں اور پھر پریشان ہو کر بولنا ہی بند کر دیتے ہیں...'' کہتے کہتے انھوں نے اپنا چہرہ گھما لیا، مگر میں ان کی بڑی بڑی آنکھوں میں پانی کی لکیر دیکھ چکا تھا۔

جعفری صاحب کی بیماری بڑھتی گئی یہاں تک کہ وہ کوما میں چلے گئے۔ میں انھیں دیکھنے کے لیے جاسلوک ہاسپٹل پہنچا۔ وہ شخص جس کی زبان و بیان کی دھاک ساری دنیا پر بیٹھی ہوئی تھی، بے حس و حرکت، خاموش لیٹا ہوا تھا۔ ان کے برابر ایک کرسی پر آپا بیٹھی ہوئی انھیں دیکھے جا رہی تھیں۔

Scanned with CamScanner

کمرے میں مکمل خاموشی تھی۔ آپا نے مجھے دیکھا اور دھیرے سے سر ہلا دیا۔

میں بہت دیر تک کمرے کے سناٹے کو سنتا رہا، پھر اشارے سے سلام کیا اور باہر نکل گیا۔ آپا بھی باہر آ گئیں۔ "بس یہی حالت ہے۔ ڈکٹر کہتے ہیں کبھی بھی ہوش آ سکتا ہے، پتا نہیں..."

میں کیا کہتا، کہنے کو تھا بھی کیا۔ مجھے لفظی ہمدردی ہمیشہ سے بے معنی معلوم ہوتی ہے۔ پھر بھی میں نے پوچھا، "آپ، کسی چیز کی ضرورت ہو تو..." آپا بہت تھکی ہوئی لگ رہی تھیں، شاید کئی دن سے سوئی نہیں تھیں۔ وہ بہت دیر تک کچھ سوچتی رہیں، پھر بولیں، "سردار نے دیوان میر کا نیا ایڈیشن چھپوایا ہے۔ پبلشر نے اسے بیچنے کا کوئی انتظام ابھی تک نہیں کیا ہے۔ سیکڑوں جلدیں گھر میں آ کے پڑی ہوئی ہیں۔ اگر تم کچھ نکلوا سکو تو..." وہ چپ ہو گئیں۔

میں سمجھ گیا کہ آپا مالی طور پر بہت پریشان ہیں۔ اس اسپتال کا خرچہ ہی نہ جانے کتنا ہوگا۔ اور آپا کسی کے سامنے ہاتھ پھیلائیں، یہ تو ہو ہی نہیں سکتا۔ میں نے انھیں یقین دلایا کہ میں دیوان میر کی کاپیاں اٹھا لوں گا اور جتنی جلدی ہو سکے گا، بیچنے کی کوشش کروں گا۔ آپا نے پھر سر ہلا دیا جیسے کہہ رہی ہوں، "شکریہ..." جانے کے لیے پلٹا تو انھوں نے پیچھے سے آواز دی۔ "جاوید..." میں رک گیا۔ "جی آپا؟" انھوں نے پوچھا: "تم دعا مانگتے ہو؟" اور میرا جواب سننے سے پہلے دھیرے سے بولیں، "سردار کے لیے دعا کرنا" کہتے کہتے مڑیں اور کمرے کے اندر چلی گئیں۔ مگر کسی دوا، کسی دعا سے کچھ نہیں ہوا۔ سردار جعفری جس خاموش ویرانے میں چلے گئے تھے، یکم اگست 2000 کو اسی میں کہیں کھو گئے۔

انھیں سیتا محل لایا گیا اور آخری سفر کی تیاری شروع ہوئی۔ سردار جعفری تو خیر کسی مذہب کو نہیں مانتے تھے مگر بلرامپور کے ایک معزز شیعہ گھرانے میں پیدا ہوئے تھے، اس لیے ایک شیعہ قبرستان رحمت آباد میں تدفین کا بندوبست کیا گیا۔ اور تب اچانک سلطانہ آپا کی آواز سنائی دی: "سردار کو سانتا کروز قبرستان میں دفن کیا جائے گا۔" وہ شیعہ مولانا جو انتظامات میں پیش پیش تھے، اچھل پڑے۔ "سانتا کروز قبرستان؟... مگر وہ تو سنیوں کا ہے۔"

"تو کیا ہوا؟ سردار کے سارے دوست وہیں ہیں۔ زندگی بھر جن کا ساتھ رہا، موت کے بعد انھیں الگ کیسے کیا جا سکتا ہے؟"

Scanned with CamScanner

اور وہی ہوا۔ تمام اعتراضات اور مخالفت کے باوجود سردار جعفری کو سانتا کروز کے سنی قبرستان میں سپردِ خاک کیا گیا۔

اس وقت یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی تھی مگر آج جب سوچتا ہوں تو ایسا لگتا ہے کہ آپا سردار جعفری کی موت کے بارے میں نہیں، ان کی ابدی تنہائی کے بارے میں سوچ رہی تھیں۔ اگر جعفری صاحب شیعہ ہونے کے ناطے رحمت آباد چلے جاتے اور آپا سنی ہونے کی وجہ سے سانتا کروز پہنچتیں تو دونوں کے درمیان ایک ایسی دوری بن جاتی جو کبھی ختم نہ ہوتی۔ اور وہ سردار اور سلطانہ جو چار دن بھی ایک دوسرے سے الگ نہیں رہے، ہمیشہ ہمیشہ الگ رہیں، یہ کیسے ممکن تھا!

جعفری صاحب کی موت کے بعد میں آپا سے کئی دفعہ ملا، مگر ہمیشہ یہی احساس ہوا کہ ان کے اندر کچھ بجھ گیا ہے۔ آنکھوں کی وہ چمک جو شمعیں روشن کر دیا کرتی تھی، دھواں بن چکی ہے۔ چہرے سے پھوٹنے والی مسکراہٹ غائب ہو چکی ہے۔ بال روکھے اور بے جان ہو چکے تھے اور وزن جو پہلے ہی سے کم تھا اور بھی کم ہو گیا تھا۔ سفید ساڑی میں لپٹا ہوا ان کا سراپا اپنی کشش کھو چکا تھا۔ وہ اپنی ہی کوئی پرانی دھندلی سی تصویر معلوم ہوتی تھیں۔

اپنے سردار سے الگ ہو کر وہ چار سال بھی نہیں رہ سکیں اور 16 جولائی 2004 کو وہیں پہنچ گئیں جہاں سردار جعفری اپنے دوستوں ساحر، مجروح، جاں نثار اختر، اختر الایمان، خواجہ احمد عباس اور راہی معصوم رضا وغیرہ کے ہجوم میں گھرے بیٹھے تھے۔ انھوں نے جیسے ہی سلطانہ کو دیکھا، کہا: ''لیجیے حضرات، وہ بھی آ گئیں جن کے بغیر یہ محفل ادھوری تھی۔ آؤ بھئی سلطانہ!...''

❀❀

بڑے پاپا

ہوا یوں کہ میری بیٹی لبنیٰ کی شادی لکھنؤ کے ایک ہونہار نوجوان سلیم عارف کے ساتھ ہوئی۔ لبنیٰ جب اپنے سسرال لکھنؤ پہنچی تو، جیسا کہ دستور ہے، سلیم کے رشتے داروں اور دوستوں نے بہت سی دعوتیں اور پارٹیاں دے ڈالیں۔ ایسی ہی ایک دعوت سلیم کے دوست اور اسکول کے ساتھی سنیل ستیہ دکتا کے گھر بھی ہوئی۔ سنیل نے لبنیٰ کو ایک پنسل اسکیچ دکھایا جو سلیم نے بنایا تھا۔

لبنیٰ نے تصویر کو پہچان لیا اور کہا، ''یہ تو دیوان شیام بہادر کی تصویر ہے، اور یہ تصویر میرے پاپا نے کھینچی تھی۔''

سنیل کے والد نے چونک کر پوچھا، ''کیا نام ہے تمھارے پاپا کا؟''

اور جب لبنیٰ نے بتایا تو سریش صاحب نے اسے گلے سے لگا کر سلیم سے کہا:

''میاں صاحبزادے! تم بہو کو لے کر ہمارے گھر آئے تھے، مگر یہ تو ہماری بیٹی نکل آئی۔''

بیٹی بہو سے بیٹی کیسے بن گئی؟ ... یہ کہانی رام پور سے شروع ہوتی ہے۔

ہمارے گھر سے دو دروازے چھوڑ کر دیوان ہاؤس تھا یہ ایک لمبی چوڑی شاندار حویلی تھی۔ اوپر نیچے ملا کر کوئی اٹھارہ بیس کمرے تھے۔ زنانے اور مردانے حصوں میں دو بڑے بڑے صحن۔ ایک کونے میں چھوٹا سا گارڈن۔ پھاٹک میں گھسو تو دونوں طرف برآمدے تھے، جس میں ایک طرف نوکر رہتے تھے، دوسری طرف آنے جانے والوں کے بیٹھنے کا بندوبست تھا۔ برآمدوں سے گزرتے ہوئے کورٹ یارڈ میں آنے پر اِس سرے سے اُس سرے تک انگور کی بیلیں پھیلی ہوئی تھیں جن میں سبزی مائل سنہرے خوشے لٹکے رہتے تھے۔ سامنے ایک بڑا سا ہال تھا، جس میں پرانی قدِ آدم تصویریں، جانوروں کے بھوسا بھرے ہوئے سر اور پرانے فرنیچر کی آرائش تھی۔

Scanned with CamScanner

لکڑی کے بے حد موٹے دروازے والا پھاٹک ہمیشہ کھلا ہی رہتا تھا، اس لیے آتے جاتے اندر کی طرف نظر مڑ ہی جاتی تھی۔ زیادہ تر ایسا ہوتا تھا کہ ہال کے باہر والے چبوترے یا برآمدے میں، جس کی محراب پر بیل گلاب کی بیلیں چڑھی ہوئی تھیں، ایک آرام کرسی پر آدھے لیٹے، آدھے بیٹھے بڑے پاپا دکھائی دیتے تھے۔ کبھی کتاب پڑھتے ہوئے تو کبھی اخبار یا کبھی دھوپ سینکتے ہوئے۔

دوہرا بدن جو موٹاپے کی حدوں کو چھو رہا تھا مگر ساتھ ہی یہ بھی بتاتا تھا کہ یہ بدن کسی زمانے میں خاصا سڈول رہا ہوگا۔ کھلتا ہوا سانولا رنگ، ذہین چمکتی ہوئی آنکھیں، آنکھوں پہ چشمہ، چھوٹے چھوٹے سفید بال، بدن پہ ململ کا باریک کرتا اور چست پاجامہ، پاؤں میں چپل یا بو (Bow) والے پمپ شوز۔

میری سمجھ میں آج تک نہیں آیا کہ بڑے پاپا کو دیکھ کے اتنا پیار کیوں آتا تھا۔ جی چاہتا تھا، ان سے لگ کے لگ جائیں، وہ پیار سے سر پر ہاتھ پھیریں اور ایک مسکراہٹ کے ساتھ ہمارا حال چال پوچھیں۔ ان کے پورے وجود میں ایک عجیب سی شفقت تھی۔ ایک ایسی محبت جو کسی ایکسپریشن کی محتاج نہیں ہوتی۔ خوشبو کی طرح پھیلتی ہے اور جو بھی سامنے ہوتا ہے، اسے اپنی بانہوں میں لپیٹ لیتی ہے۔

لیکن وہ بڑے پاپا میرے ہم عمروں کے دادا تھے۔ میرے ابو انھیں چچا کہا کرتے تھے اور میرے خاندان کے سب لوگ ان کا بے حد احترام کیا کرتے تھے۔ اس لحاظ سے وہ میرے لیے بھی دادا جیسی محترم ہستی ہونی چاہیے تھے مگر ایسا نہیں تھا، وہ میرے دوست تھے۔ پتا نہیں دوسرے بچوں کے ساتھ بھی ان کی دوستی تھی یا نہیں، مگر میرے ساتھ تو ان کی دوستی ہی تھی۔ یہ دوستی اس وقت شروع ہوئی تھی جب مجھے اپنی لائبریری بنوانے کا خیال آیا تھا۔ پڑھنے کا شوق تھا، کتابیں گھر میں بھی تھیں مگر زیادہ تر ادبی کتابیں تھیں جو پڑھ تو لیتا تھا مگر سمجھ میں نہیں آتی تھیں۔ صولت پبلک لائبریری سے کتابیں مل جایا کرتی تھیں، مگر وہاں مصیبت یہ تھی کہ گھنٹہ بھر تک رجسٹر چھاننے کے بعد جب کسی اچھے سے ناول پر دل آتا تو پتا چلتا کہ وہ باہر گیا ہوا ہے۔ اب ایسی صورت میں لے دے کے شمسی صاحب کا سہارا تھا۔ شمسی کا نام کیا تھا، یہ تو اب یاد نہیں مگر اس نے چلتی پھرتی لائبریری کا ایک انوکھا تجربہ کیا تھا۔ وہ فرصت سے سائیکل پر آتے، دو تھیلے سائیکل کے ہینڈل میں ٹنگے ہوتے اور دو بڑے

بڑے تھیلے پچھلے ٹائر کے اوپر کریٹ میں پھنسے ہوتے۔ ان چاروں تھیلوں میں کتابیں بھری رہتیں۔ میرے خاندان کی کچھ ریٹائرڈ خواتین بڑے ذوق وشوق سے رئیس احمد جعفری، قیسی رام پوری، گلشن نندہ، صادق سردھنوی، نسیم حجازی کے ناول لیا کرتیں اور مزے لے لے کر پڑھا کرتیں۔ شمسی ایک ناول کے چار آنے یا تیس پیسے لیا کرتے تھے اور ہر ہفتے آکر ناول بدل دیا کرتے تھے۔ میں نے شمسی سے دوستی کر لی تھی اور ان کی دکان پہ جا کے کتابیں لے آیا کرتا تھا، جس کے پیسے وہ کبھی لیتے اور کبھی گھر کا بچہ سمجھ کر معاف کر دیتے۔

میری پڑھنے کی رفتار اتنی تیز تھی کہ چار پانچ سو صفحات کا ناول چوبیس گھنٹے میں چٹ کر جاتا۔ دادی برا بھلا کہتیں تو گھر کے کسی کونے میں چھپ جاتا یا چھت پہ چلا جاتا، مگر کتاب ہاتھ سے نہ چھوٹتی۔ کوئی دلچسپ ناول ہاتھ لگ جاتا تو کھاتے وقت بھی پڑھائی کا سلسلہ جاری رہتا۔ یہ عادت تو ابھی کچھ عرصہ پہلے تک رہی ہے اور بیوی کی مستقل ڈانٹ سے چھوٹی ہے۔ کبھی کبھی تو ایسا بھی ہوتا تھا کہ دادی غصے میں آکر لائٹ بند کر دیا کرتی تھیں اور میں چاند کی روشنی میں پڑھا کرتا تھا۔ ہاں، تو بات ہو رہی تھی لائبریری کی۔ شمسی صاحب نے مجھے بہت انسپائر کیا۔ یہ اچھا دھندا ہے، کتابیں بھی پڑھنے کو ملیں اور پیسے ملیں سو الگ۔ میرے پاس کوئی پچاس ساٹھ ناول ور رسالے ہوں گے، لیکن میں نے اپنے رشتے داروں میں اپنی اسکیم کا ذکر کیا کہ میں ایک لائبریری کھولنا چاہتا ہوں تو سب نے بڑی ہمت افزائی کی۔ ہر گھر میں سے جتنی پرانی کتابیں اور رسالے تھے، سب مجھے دان کر دیے گئے۔ میں نے پرانی کتابوں کی مرمت کی، انھیں ٹھیک ٹھاک کیا، ان پر کور چڑھائے، نام لکھے، ایک رجسٹر بنایا اور لائبریری کھولنے کی پوری تیاری کر لی۔

ہماری بیٹھک کا دروازہ سڑک کی طرف کھلتا تھا۔ اس سے مناسب جگہ لائبریری کے لیے نہیں مل سکتی تھی۔ اسی لیے بیٹھک کی دیوار پر موٹا موٹا ''شمع لائبریری'' لکھا گیا۔ مجھے آج بھی یاد ہے، شمع کے ''شین'' کو کھینچ کر دیے کی شکل دی گئی تھی اور ''شین'' کے نقطے اس طرح لگائے گئے تھے، جیسے کرنیں پھوٹ رہی ہوں۔

شمع لائبریری کے پہلے ممبر بڑے پاپا تھے۔ وہ شاید کسی سے مل کر آرہے تھے۔ بیٹھک کھلی دیکھی اور دیوار پر ''شمع لائبریری'' لکھا دیکھا تو رک گئے، اندر آئے اور بہت دیر تک کتابوں اور

Scanned with CamScanner

رسالوں کو الٹ پلٹ کر دیکھتے رہے۔ پھر کہنے لگے:

''بھیا، تمھاری لائبریری کی فیس کتنی ہے؟''

میں نے کہا: ''تیس روپے ڈپوزٹ، جو کتاب کے کھو جانے، پھٹ جانے یا واپس نہ کرنے کی صورت میں ضبط کر لیے جائیں گے۔ کتاب تین دن کے اندر اندر واپس کرنی ہوگی اور اس کا کرایہ ہوگا دس پیسے۔''

بڑے پاپا نے شیروانی کی جیب میں ہاتھ ڈالا اور ایک نوٹ نکال کر کہنے لگے:

''بھئی، فی الحال ہمارے پاس دو ہی روپے ہیں۔''

میں نے کہا: ''کوئی بات نہیں، آپ تو اپنے ہی ہیں۔ آپ سے کیا ڈپوزٹ لینا، کتاب لے جائیے۔''

کہنے لگے: ''نہیں بھائی، بزنس بزنس ہوتا ہے۔ یہ دو روپے رکھو اور یہ دس پیسے کرایہ بھی رکھ لو۔ باقی حساب بعد میں کریں گے۔''

کتاب لے کر بڑے پاپا چلے گئے۔ ہفتہ بھر گزرا، پندرہ دن گزر گئے۔ مہینہ گزر گیا تو میں نے یاد دلایا۔ ''بڑے پاپا، وہ ناول آپ نے ابھی تک ختم نہیں کیا؟''

''ارے یار، کیا بتائیں، وہ ناول تو ہم کئی بار ختم کر چکے ہیں۔''

''اچھا! اتنا مزے دار ناول ہے کیا؟''

بڑے پاپا کچھ دیر سوچتے رہے، سر ہلاتے رہے، پھر دھیرے سے بولے: ''دراصل بات یہ ہے کہ ہم آخر کا ورق پڑھتے ہیں تو پچھلا بھول جاتے ہیں، اس لیے پھر سے پڑھنا شروع کر دیتے ہیں۔ ہمیں معلوم ہے، تمھارا نقصان ہو رہا ہوگا مگر ہم شام کو آئیں گے تو نئی کتابیں بھی لے لیں گے اور پرانا حساب بھی کر دیں گے۔''

بڑے پاپا نے اس کے بعد کئی کتابیں لیں اور ہر کتاب مہینوں بعد واپس آئی۔ شمع لائبریری تو کچھ عرصے بعد بند ہو گئی کیونکہ اس میں کبھی اتنے پیسے ہی نہیں جڑے کہ نئی کتابیں آ سکیں۔ اور ممبر نئی کتابیں مانگتے تھے مگر بڑے پاپا کے ساتھ کتابوں کا لین دین اور ان پر بحث و مباحثہ میرے رام پور چھوڑنے تک جاری رہا۔

Scanned with CamScanner

بڑے پاپا نے بھی مجھے بہت سی کتابیں دیں جن میں سب سے زیادہ قیمتی چیز رسالہ زمانہ، کانپور کے تقریباً سب ہی شمارے تھے، جن کے ضائع ہو جانے کا مجھے آج تک افسوس ہے۔

بڑے پاپا یعنی دیوان شیام بہادر کا بھرا پرا گھر تھا۔ ہر عمر، ہر حلیے اور مزاج کے بیٹے بیٹیاں، بھائیوں کے بچے اور بہنوں کے بچے بھرے ہوئے تھے۔ کھانے بیٹھتے تو ایسا لگتا جیسے پارٹی ہو رہی ہو۔ ان میں پتلے دبلے نازک سے بڑے للاّ تھے جو مختصر ہو کر "بڑلا صاحب" کہلاتے تھے، سریش صاحب جو میرے ابو کے بہت عزیز دوستوں میں تھے، شمو صاحب جو بمبئی آ گئے تھے اور جنھوں نے کئی فلموں میں کام بھی کیا تھا، اور روبی صاحب تھے جو ہم سے زیادہ بڑے تو نہیں تھے مگر رہتے ہمیشہ بڑوں کے ساتھ ہی تھے، نیلم جی تھیں، مادھوری جی تھیں، کسم، ششی اور نگا، اور میرے ہم عمر تارا صاحب، رائے صاحب، راجہ صاحب، مسٹر اور تھامتا خوبصورت سا بچہ راکیش۔ اس گھر کے ہر بچے کے ساتھ صاحب کیوں لگا ہوا تھا، مجھے آج تک نہیں معلوم، مگر اس طرح لگا ہوا تھا جیسے نام ہی کا ایک حصہ ہو۔

عجیب رونقیں رہتیں۔ دیوان ہاؤس کا صحن بچوں کے شور اور ہنسی کی آوازوں سے گونجتا رہتا۔ کرکٹ ہو یا آنکھ مچولی، سات پتھر ہو یا کبڈی، ایک ہنگامے پہ موقوف تھی گھر کی رونق۔ اس ہنگامے میں ان کے گھر کے سارے بچوں کے علاوہ میں اور میری دو کزن پروین اور شاہین، ڈاکٹر بھل کے دو بیٹے لیش پال اور ستیہ پال اور محلے کے بہت سے بچے شامل ہوتے۔

بڑے پاپا جہاں دیدہ آدمی تھے۔ وہ جانتے تھے کہ کھیل میں مگن بچے بھڑکے گھوڑوں کی طرح ہوتے ہیں، جن پر قابو پانا آسان نہیں ہوتا۔ اس لیے خود ادھر اُدھر ٹل جایا کرتے تھے یا اپنے کبوتروں کی مزاج پرسی کے لیے اوپر چلے جاتے تھے۔ بڑی اماں شور شرابے سے بہت گھبراتی تھیں۔ ہر تھوڑی دیر میں ان کی آواز سنائی دیتی:

"ارے میا، ان بچوں نے تو جینا دوبھر کر دیا ہے۔ ارے نالائقو! تم لوگ کوئی چپکے کا کھیل نہیں کھیل سکتے کیا؟" مگر بھڑکے ہوئے گھوڑے کہاں سنتے ہیں۔

یوں تو بڑی اماں ہماری شرارتوں سے تنگ رہتی تھیں مگر کبھی کبھی انھیں ترس بھی آ جاتا اور وہ ہم کو ڈانٹنے کے بدلے ہمارا حال چال پوچھ لیتیں:

Scanned with CamScanner

"ارے تم لوگ سویرے سے کھیل میں جٹے ہو، کچھ کھانے پینے کا بھی ہوش ہے یا نہیں؟"
بچے جس عمر میں تھے اس میں کہاں کسی بات کا ہوش رہتا ہے اور کھیل میں بھوک پیاس کسے لگتی ہے! بڑی اماں اپنے چوکے کے باہر بچوں کو بیٹھ جانے کا حکم دیتیں مگر اس سے پہلے پسینے میں بھیگے ہوئے ہاتھ اور مٹی میں سنے ہوئے پیر دھلوائے جاتے۔ پھر سب کے ہاتھ میں ایک ایک پلیٹ پکڑائی جاتی اور بڑی اماں کے ہاتھ کی پوری کچوری اور بھاجی اس وارننگ کے ساتھ دی جاتی کہ "خبردار جو پلیٹ میں کچھ چھوڑا تو۔" جب تک بچے کھاتے رہتے بڑی اماں اپنی ساڑی کا پلو سر پہ لیے چوکے کے چوکھٹ پہ کھڑی رہتیں اور سب کو دیکھتی رہتیں۔ دھان پان سی تھیں، قد بھی اونچا نہیں تھا مگر سب ان سے ڈرتے تھے، یہاں تک کہ بڑے پاپا بھی۔

بڑی اماں کو کبوتر پسند نہیں تھے۔ "اے نے، ناس پیٹے اتی گندھ پھیلاتے ہیں اور اتی آوازیں کرتے ہیں کہ بیٹھنا مشکل ہو جاتا ہے۔" مگر بڑے پاپا کو کبوتروں سے عشق تھا۔ نیم پر ایک بڑی سی لکڑی کی کابک تھی، جس میں سوا ڈیڑھ سو کبوتروں کے رہنے سہنے کا بندوبست تھا۔ روز سویرے ایک پتلے دبلے بڈھے آیا کرتے تھے، جن کے سر پر رامپوری ٹوپی، جسم پر شیروانی، گلے میں رومال اور منھ میں پان۔ مجھے آج بھی یاد ہے۔ دولہا خان کبوتر باز تھے۔ بڑے پاپا اور دولہا خان کبوتر باز اوپر پہنچتے اور ہر کبوتر کا حال چال پوچھتے۔ کسی کے پر پھیلا کر قلمیں کاٹی جاتیں، کسی کے زخم پہ ہلدی اور چونا لگایا جاتا، کسی کو ہتھیلی پہ دانہ رکھ کے کھلایا جاتا۔ اور پھر دولہا خاں ایک جھنڈی ہلاتے اور ستر اسی کبوتروں کا جھنڈ ایک ساتھ آسمان پر بلند ہوتا۔ دور تک سفید دھند سی چھا جاتی اور اڑتے ہوئے پروں کی آوازوں کے سوا کوئی اور آواز سنائی نہ دیتی۔ دوسری طرف سے اتنے ہی کبوتروں کی دوسری ٹکڑی آتی ہوئی دکھائی دیتی۔ یہ ننھو خان پتنگ باز کے کبوتر ہوتے۔ کبوتروں کی دونوں ٹکڑیاں آپس میں لڑ جاتیں۔ جہاں تک نظر جاتی کبوتر ہی کبوتر دکھائی دیتے۔ اور جب دونوں ٹکڑیاں ایک دوسرے کے ساتھ گتھ جاتیں تو دولہا خان ایک سفید جھنڈا ہلانے لگتے اور بڑے پاپا زور زور سے چیختے: "آ... آ... آ..." دور نہ جانے کیسے سیکڑوں گز کی اونچائی سے کبوتر اپنے مالک کی آواز پہچان لیتے اور پر کا پرا نیچے پرا اس طرح اتر آتا جیسے کوئی بڑی سی چادر زمین پر پھیلا دی جائے۔ اس کو ٹکڑی لڑانا کہتے ہیں اور کھیل کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ آپ کی ٹکڑی دشمن کی ٹکڑی سے کچھ کبوتر توڑ لائے۔ اگر کبھی کوئی اچھا سا

Scanned with CamScanner

شیرازی یا لقہ آجاتا تو پاپا جی کے چہرے کی چمک اور ہونٹوں کی مسکراہٹ دیکھنے جیسی ہوتی۔

میں آج جب ریپبلک ڈے پر ہوائی جہازوں کے کرتب دیکھتا ہوں تو مجھے بڑے پاپا کے کبوتروں کی ٹکڑی بہت یاد آتی ہے۔

ہر ہولی پر ہمارے خاندان کے بزرگ اپنے دیوان خانے کے برآمدے میں سفید کپڑے پہن کر بیٹھ جاتے۔ سب سے پہلے ہولی کھیلنے کے لیے آنے والوں میں بڑے پاپا اور ان کے گھر والے ہوتے۔ کپتان دادا سے گلے ملتے، ان کی سفید براق داڑھی میں گلال لگاتے۔ ہم بچے پان، الائچی، سپاری اور مصری کی تھالیاں لیے کھڑے رہتے اور مہمانوں کی خاطر کرتے۔ بڑے پاپا سب کے سروں پر پیار سے ہاتھ پھیرتے، گالوں پر ذرا سا رنگ چھواتے اور چلے جاتے۔

عید پر جب ہمارے خاندان کے لوگ ان کے سلام کو جاتے تو چھوٹا ہو یا بڑا، ہر کسی کو چاندی کا چمکتا ہوا ایک روپے کا سکہ عیدی کے طور پر ملتا اور منھ میٹھا کرایا جاتا۔ کبھی کبھی جب ہولی آتی ہے تو مجھے رنگوں میں ڈوبی ہوئی ایک سفید داڑھی ضرور یاد آتی ہے، اور کبھی کبھار کسی عید پر چاندی کا ایک روپیہ بھی یادوں کے اندھیروں میں کوند جاتا ہے۔

عجیب آدمی تھے بڑے پاپا۔ کوئی غلط بات تو برداشت ہی نہیں کرتے تھے۔ ایک شام اپنی ٹمٹم پر کلب جا رہے تھے۔ راستے میں دو بچوں کو لڑتے دیکھا تو ٹمٹم رکوائی، نیچے ترے اور دونوں کو ایک ایک طمانچہ رسید کیا۔ بہت سے لوگ جمع ہو گئے اور وجہ پوچھی تو کہا، "شریف زادے سڑکوں پر نہیں لڑا کرتے۔" دونوں کو ٹمٹم پر بٹھا کر ان کے گھر چھوڑا اور پھر کلب چلے گئے۔

بڑے پاپا کی ایمانداری اور صاف گوئی کے بہت سے قصے سنے ہیں میں نے۔ جب وہ ریاست کے دیوان تھے تو ایک دن انگریز پولیٹکل ایجنٹ نے انھیں بلا کر یہ جاننا چاہا کہ ریاست کے سرکاری خزانے میں کتنا مال ہے اور کہاں ہے؟ دیوان شیام بہادر بات کی اہمیت کو تاڑ گئے اور کسی طرح بات کو ٹال گئے۔ لیکن دوسرے دن دربار میں حاضر ہوئے اور نواب صاحب کو استعفیٰ پیش کر دیا۔ نواب صاحب نے وجہ پوچھی تو پولیٹکل ایجنٹ کا سارا قصہ سنا دیا اور عرض کیا: "سرکار، میں جھوٹ نہیں بول سکتا اور سچ بولنا حضور کی نمک حرامی ہو گی۔ اس لیے استعفیٰ دے رہا ہوں۔ جب دیوان ہی نہیں رہوں گا تو اس کے سوال کا جواب دینے کا پابند نہیں رہوں گا۔" نواب صاحب نے اس نمک

حلالی سے خوش ہو کر اپنے وفادار کو دو گاؤں انعام میں دیے اور چار ہزار گز زمین دیوان ہاؤس تعمیر کرنے کے لیے عطا کی گئی۔ ہاں بڑے پاپا کو پنشن بھی ملتی تھی: ستاون روپے چھ آنے مہینہ۔

بمبئی آنے سے کچھ دن پہلے میں بڑے پاپا سے ملنے گیا۔ بڑی دیر تک غور سے مجھے دیکھتے رہے، پھر کہنے لگے:

"کیوں جا رہے ہو؟"

میں نے کہا: "یہاں تو کوئی فیوچر دکھائی نہیں دیتا، وہاں شاید کوئی بات بن جائے۔"

کہنے لگے: "میری رائے مانو تو اپنی تعلیم پوری کر لو۔ تم نے ہائی اسکول تو کیا ہے۔ کم سے کم بی اے کر کے جاؤ تو اچھی نوکری مل سکتی ہے۔"

میں نے کہا: "بڑے پاپا، آپ تو ہمارے حالات جانتے ہیں، آگے پڑھنے کا خرچہ کون اٹھانے والا ہے؟"

کہنے لگے: "کتابوں کا جتنا خرچ آئے گا میں دینے کے لیے تیار ہوں۔"

میں نے بہت شکریہ ادا کیا اور انکار کر دیا۔ چلتے وقت دروازے تک چھوڑنے کے لیے آئے اور ایک لفافہ دیتے ہوئے کہا:

"اس لفافے میں میرے ایک دوست کا پتا ہے جو بمبئی میں رہتے ہیں۔ کبھی بھی کسی بھی چیز کی ضرورت ہو تو چلے جانا۔" بمبئی آنے کے کئی مہینے کے بعد ایک دن وہ لفافہ میرے ہاتھ آ گیا۔ میں نے لفافہ کھول کے دیکھا۔ اس میں ایک پتا تو تھا مگر اس کے ساتھ ہی دس روپے کا ایک نوٹ بھی تھا اور نوٹ کے اوپر لکھا تھا: "سفر خرچ کے لیے، دعا کے ساتھ۔"

بڑے پاپا سے میری آخری ملاقات ان کے مرنے سے دس دن پہلے ہوئی۔ میں اپنی بیوی اور بچی کو لے کر رام پور گیا تو بڑے پاپا کے سلام کو بھی گیا۔ دیوان ہاؤس کی رونق بہت کم ہو گئی تھی۔ انگور کی گھنی بیلیں اب اتنی گھنی نہیں تھیں اور ان کے پتے پیلے ہو گئے تھے۔ نیم کے اوپر چڑھی ہوئی گلو کی بیل، لوگ جس کے ٹکڑے کھانسی اور دمے کے لیے لے جایا کرتے تھے، سوکھ گئی تھی۔ برآمدے کی محراب پر پھیلی ہوئی پیلے گلابوں کی بیل غائب تھی اور کبوتروں کی آوازیں بند تھیں۔ چاروں طرف ایک عجیب سا سناٹا پھیلا ہوا تھا۔ بڑے پاپا بیمار تھے اور آنکھیں بند کیے لیٹے تھے۔ بڑی اماں

Scanned with CamScanner

سرھانے بیٹھی رومال ہلا رہی تھیں۔ میں نے اشارے سے خیر خیریت پوچھی اور لوٹنے لگا۔ بڑی اماں نے میرا نام لیا تو فوراً آنکھیں کھول دیں۔ بڑی اماں نے کہا، ''بہو آئی ہے۔'' تو اٹھ کر بیٹھ گئے۔ مجھے، فریدہ اور لبنیٰ کو پیار کیا۔ پھر وہ تمام رسمیں ادا کی گئیں جو بہو کے آنے پر ہوتی ہیں۔ آرتی اتاری گئی، تلک دیا گیا، ایک جوڑا، ایک سو ایک روپے کی سلامی وغیرہ وغیرہ...

بڑے پاپا کو اس کمزور اور مرجھائی ہوئی حالت میں دیکھ کر میرا دل بھر آیا، پھر بھی ڈرتے ڈرتے بولا، ''پاپا، اگر آپ اجازت دیں تو آپ کی ایک تصویر لے لوں؟'' فوراً راضی ہو گئے۔ ان کی کرسی پہلی ہوتی دھوپ میں رکھوا دی گئی۔ بڑے پاپا شال لپیٹ کر بیٹھ گئے۔ اس وقت گھر میں جتنے بھی بچے و بڑے تھے، سب ان کے پیچھے کھڑے ہوے اور میں نے تصویر کھینچی۔ دس دن بعد خبر ملی کہ بڑے پاپا دنیا میں نہیں رہے۔ اس کے ساتھ ہی ایک خط بھی ملا جس میں لکھا تھا کہ وہ تصویر جو میں نے اتاری تھی، وہ بڑے پاپا کی آخری تصویر تھی، اگر اس تصویر کی ایک کاپی مل جائے تو بڑی مہربانی ہوگی۔ میں نے وہ تصویر انلارج کرا کے سریش صاحب کو بھیج دی۔ یہی وہ تصویر تھی جسے پہچان کر لبنیٰ بہو سے بیٹی بن گئی تھی۔

سریش صاحب زندہ ہیں۔ لکھنؤ میں رہتے ہیں۔ اور میں جب بھی لکھنؤ جاتا ہوں، کم سے کم ایک وقت کا کھانا ان کے وہاں ضرور کھاتا ہوں۔ اور جتنا وقت ملتا ہے، ہم دونوں دیوان ہاؤس کی باتیں کرتے ہیں، بڑے پاپا کی باتیں کرتے ہیں اور ان رشتوں کی باتیں کرتے ہیں جو کسی دھرم یا مذہب کی سمجھ میں نہیں آسکتے، کیونکہ یہ دل کے رشتے ہیں، اور دل نہ ہندو ہوتا ہے نہ مسلمان!

Scanned with CamScanner

گرو جی

دو سال کی مسلسل کوشش کے بعد آخر کار ابرار علوی صاحب خودکشی کر لینے میں کامیاب ہو گئے!

ان کے بچے، دوست، رشتے دار، جاننے والے، بلکہ ان کے ڈاکٹر بھی یہ ماننے کے لیے تیار نہیں ہیں کہ ابرار صاحب نے خودکشی کی ہے۔ کوئی بھی میری بات پر یقین نہیں کرتا۔

بیمار تو وہ برسوں سے تھے۔ ذیابیطس بہت زیادہ تھی اور اکثر کھانستے رہتے تھے مگر ہنستے بھی تھے "بھائی ان بیماریوں کے فائدے بھی ہیں۔ کھانسی سے گھر میں چور نہیں آتے اور ذیابیطس سے شکر کے پیسے بچتے ہیں۔" بیماریوں نے انھیں اور انھوں نے اپنی حرکتوں کو کبھی نہیں چھوڑا۔ ڈاکٹر نے سگریٹ کو منع کیا تھا مگر کھانا اچھا ہو تب، یا ذہنی الجھن زیادہ ہو تو سگریٹ پینی پڑتی ہے۔ شام کی وسکی میں ٹھنڈا پانی نہ ہو تو وسکی دوا معلوم ہونے لگتی ہے۔ میٹھے کے ساتھ بھی کا نا پردہ تھا۔ کوئی اصرار کرے تو انکار نہیں کرتے تھے۔ مگر ابرار صاحب اپنی کسی بیماری سے نہیں مرے۔ وہ اس لیے مر گئے کہ مرنا چاہتے تھے۔ اپنے عزیز ترین ساتھی گرو دت کی طرح انھوں نے بھی زندگی کے مقابلے میں ہتھیار پھینک کر شکست مان لی تھی۔

موت سے تین برس پہلے سے انھوں نے اپنے کمرے سے نکلنا بند کر دیا تھا۔ 2007 کی بات ہے، میں ہمیشہ کی طرح یکم جولائی کو سالگرہ کی مبارکباد دینے پہنچا۔ یہ ایک روایت تھی جو اس سال سے چلی آ رہی تھی جس سال میں ان سے ملا تھا۔

مجھے سٹنگ روم میں بٹھا دیا گیا اور بہت دیر بعد ایک نہایت کمزور ابرار صاحب اپنے بیٹے انور، ایک نوکر اور دیواروں کا سہارا لیتے ہوئے باہر آئے، پھر کئی تکیوں کے سہارے صوفے پر بیٹھ گئے۔ میں نے حال پوچھا تو ایک پھیکی سی مسکراہٹ ہونٹوں پر آ گئی۔

Scanned with CamScanner

"بس اب چل چلاؤ ہے بھائی۔ سارے ساتھی چلے گئے۔نوشاد چلے گئے۔مجروح چلے گئے۔کیفی چلے گئے۔جانی بھی چلے گئے۔"

(جانی واکر کا انتقال کچھ دن پہلے ہوا تھا۔)

ہم لوگ دیر تک ادھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ بہکنے لگے ہیں۔ بولتے بولتے خیال بھٹک جاتا اور وہ کہیں اور پہنچ جاتے۔

کہا جاتا ہے، اس دن کے بعد وہ پھر کبھی باہر نہیں آئے۔ کچھ دن بعد انھوں نے چلنا پھرنا تو دور کی چیز ہے، اٹھنا بیٹھنا بھی بند کر دیا. کھانے پینے سے لے کر دوسری ضرورتوں تک سب کی سب بستر پر پوری کی جاتیں۔ ٹی وی کھول دیا جاتا تو "شور بہت کرتا ہے" کہہ کر بند کرا دیتے۔ اخباروں کتابوں کو ہاتھ بھی نہیں لگاتے تھے، سوائے ان دو کتابوں کے جو ان کے سرھانے رکھی رہتی تھیں. یہ دونوں کتابیں گرودت کے بارے میں تھیں۔

دنیا سے ان کے تعلقات ایک گھنٹی اور ایک فون تک سمٹ گئے تھے۔ گھنٹی سن کر نوکر آجاتا تھا اور فون ہم جیسے لوگوں کا رشتہ قائم رکھے ہوئے تھا۔

میں کبھی ملنے چلا جاتا تو بہت خوش ہوتے مگر موت اور مرنے کی باتیں زیادہ کرتے۔

ایک دن کہنے لگے، "جاوید میاں، میری اولادوں کو تو کچھ آتا جاتا ہے نہیں۔ آپ سمجھدار آدمی ہیں اس لیے ایک درخواست ہے..."

"فرمایئے،" میں نے کہا۔

"جب میں مر جاؤں تو میرا کفن دفن اور باقی جو کچھ بھی ہوتا ہے، اپنی نگرانی میں کرنا، اور کسی اچھے صاف ستھرے قبرستان میں لے جانا..."

میں نے ہمیشہ کی طرح انھیں ٹوکا۔ "ارے ابرار صاحب، آپ کی پرابلم کیا ہے؟ جب دیکھو بری بری باتیں کرتے رہتے ہیں۔ اچھی باتیں سوچا کیجیے۔"

انھوں نے سر ٹیڑھا کر کے مجھے غور سے دیکھا اور بولے، "اس عمر میں یہی باتیں اچھی لگتی ہیں..." کچھ دیر سوچتے رہے، پھر بولے، "مسلمانوں کا ڈر نہیں ہوتا تو میں بھی عصمت چغتائی کی طرح جل جاتا..."

"کیوں؟... جلنے میں ایسی کیا خاص بات ہے؟" میں نے پوچھا۔

مسکرائے اور بولے، "کون مہینوں تک سڑتا رہے گا یار!"

ایک رات ان کے بیٹے انور کا فون آیا۔ "ابا بات کرنا چاہتے ہیں..." میں ڈر گیا۔ شاید طبیعت زیادہ خراب ہوگئی ہے۔ دوسری طرف سے ابرار صاحب کی کھرکھراتی ہوئی آواز سنائی دی:

"میاں، سو تو نہیں رہے تھے؟"

"جی نہیں سر، ٹی وی دیکھ رہا تھا...!"

"بھائی، بات یہ ہے کہ..." اتنا بول کر چپ ہو گئے۔

"جی ابرار صاحب، میں سن رہا ہوں۔ فرمائیے، کیا بات ہے؟"

کچھ دیر کھانستے رہے، پھر ہانپتے ہوئے بولے۔

"معاف کرنا بھائی، میں بھول گیا کہ آپ کو کیوں فون کرایا تھا..."

"کوئی بات نہیں۔ یاد آ جائے تو بتا دیجیے گا۔ طبیعت کیسی ہے آپ کی؟"

"طبیعت تو بالکل ٹھیک ہے..." اور فون بند ہو گیا۔

کوئی پانچ منٹ بعد پھر گھنٹی بجی۔ ابرار صاحب خود بول رہے تھے:

"یاد آ گیا بھائی، میں یہ پوچھ رہا تھا کہ کسی قبرستان میں ٹرسٹیوں میں آپ کے پہچان والے ہیں کیا؟"

مجھے ان کی دماغی حالت پر شک ہونے لگا۔ یہ آدھی رات کو قبرستان اور ٹرسٹی کیوں یاد آ رہے ہیں ان کو؟

"جی ہیں تو نہیں، مگر پہچان نکالی جا سکتی ہے۔ بات کیا ہے؟"

"میاں، سنا ہے کہ سال دو سال میں قبر کھود کر دوسرا مردہ دبا دیتے ہیں۔ کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ ڈونیشن وغیرہ دے کر کوئی مستقل جگہ مل جائے؟"

"میں معلوم کرتا ہوں سر...!"

"بڑی مہربانی ہوگی میاں، قبر پکی بنوانا اور تختی ضرور لگوانا..."

"جی بہتر،" میں نے ایک لمبی سانس لی اور فون بند کر دیا۔

Scanned with CamScanner

ڈاکٹر آتے، انھیں دیکھتے، طرح طرح کے ٹیسٹ کرتے، اور پھر کہتے: ''انھیں ایسی کوئی بیماری نہیں ہے کہ یہ اٹھنے بیٹھنے سے معذور ہو جائیں۔'' مگر وہ نہیں اٹھے، لیٹے لیٹے کمر میں پہلے چھالے اور پھر زخم پڑ گئے، پاؤں سوکھ کر سیاہ اور سخت ہو گئے، مگر ابرار صاحب اسی طرح لیٹے ہوئے کمرے کی دیوار کو تکتے رہے۔ کاش میں وہ ساری کہانیاں پڑھ سکتا جو انھوں نے اپنی بجھتی ہوئی آنکھوں کی روشنی میں کمرے کی سفید دیوار پر لکھی تھیں۔ مجھے یقین ہے ان میں میری کہانی بھی رہی ہوگی۔

جب میں نے صحافت چھوڑی، یعنی ضمیر بیچنے سے توبہ کی، تو حالات اتنے خراب ہو گئے کہ بیوی کے زیور بیچنے کی نوبت آ گئی۔ ان پھٹے حالات میں، جب میں پاؤں کی انگلیاں چٹخاتا گھوم رہا تھا، ایک دن دادر اسٹیشن پر عزیز قیسی سے ملاقات ہو گئی۔ وہ میرے ساتھ روزنامہ انقلاب میں ایک زمانے تک کام کر چکے تھے اور یوں بھی محبت والے آدمی تھے۔ بڑے پیار سے ملے اور چائے پلانے کے لیے 'روپ تارا اسٹوڈیوز' لے گئے جہاں ان کے ایک پروڈیوسر کا دفتر تھا۔ میرے حالات سنے، بہت دیر تک خاموشی سے پریشان ہوتے رہے، پھر بولے: ''ہوٹل سیزرز پیلس میں میرا کمرہ ہے۔ کل وہاں آ جانا، بیٹھ کر سوچیں گے اور کوئی ترکیب نکالیں گے۔''

دوسرے دن میں ہوٹل پہنچ گیا جہاں قیسی محمود کے لیے فلم ایک باپ چھ بیٹے کا اسکرپٹ لکھ رہے تھے۔ انھوں نے محمود کے لیے پہلے بھی ایک فلم لکھی تھی جو سپر ہٹ ثابت ہوئی تھی۔ اس فلم کا نام تھا کنوارا باپ۔ انھوں نے فلم انڈسٹری کے حالات پر ایک طویل تبصرہ کیا جس کا خلاصہ یہ تھا کہ یہ چمکتی دمکتی دنیا بہت گھٹیا، ناپائیدار اور بے فیض دنیا ہے اور اس میں کسی شریف آدمی کے لیے کوئی گنجائش نہیں ہے۔ دل تو بہت چاہا کہ پوچھوں، ''کیوں برادر، کیا آپ شریف آدمی نہیں ہیں؟'' مگر میری اپنی شرافت نے زبان روک لی۔ قیسی کو نہ کسی اسسٹنٹ کی ضرورت تھی نہ ساتھی کی، مگر میں جب بھی چلا جاتا بڑی محبت سے حال پوچھتے، کبھی کبھار اپنا کچھ سین سناتے یا یوں ہی گپ اڑاتے۔ ایک دن انھیں کسی مشاعرے میں جانا تھا اور محمود کو تازہ لکھے ہوئے سین بھی بھجوانے تھے۔ بہت ہچکچاتے ہوئے انھوں نے کہا، ''جاوید میاں، اگر آپ...''

''ضرور ضرور!'' میں نے کہا اور وہ لفافہ لے لیا جس میں سین تھے۔

اس زمانے میں بڑے فلم اسٹار وہ ہوا کرتے تھے جن کے پاس ایک بڑا سا بنگلہ ہو، بڑی سی

گاڑی ہو اور کسی بڑے ہوٹل میں ایک کمرہ ہمیشہ بک رہے۔ محمود کا گھر تو پتا نہیں کہاں تھا مگر وہ ہمیشہ ''سن اینڈ سینڈ'' کے ایک سوئٹ (Suite) میں پائے جاتے تھے۔

جب محمود کے بوائے (Boy) بادشاہ نے مجھے اندر بلایا تو وہ سامنے ہی بیٹھے تھے۔ الٹے ہاتھ میں سلگتا ہوا سگریٹ، سیدھے ہاتھ میں چائے سے بھرا ہوا گلاس، جسم پر سلک کا کرتا اور لنگی، گلے میں سونے کی ایک بھاری چین اور ہاتھ میں ایک موٹا سا بریسلٹ جس پر ہیرے چمک رہے تھے۔ محمود نے اپنی بڑی بڑی آنکھوں سے (جن میں سفیدی کم، سرخی زیادہ تھی) مجھے سر سے پاؤں تک دیکھا۔ محمود فلم انڈسٹری میں بھائی جان کہلاتے تھے۔ میں نے بھی اسی رشتے کا سہارا لیا اور کہا، ''بھائی جان! قیسی صاحب نے یہ سین بھیجے ہیں۔'' انھوں نے کوئی جواب نہیں دیا اور میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اس طرح دیکھتے رہے جیسے اندر اتر کے کچھ تلاش کر رہے ہوں۔ اچانک گلاس پہ لپٹی ہوئی ان کی ایک انگلی کھلی اور کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولے، ''بیٹھو!''

میں بیٹھ گیا۔ بھائی جان نے چائے کا ایک گھونٹ لیا، سگریٹ کا ایک لمبا کش کھینچا اور فرمایا، ''سناؤ!''

میں اس حملے کے لیے تیار نہیں تھا، مگر بچنے کا کوئی رستہ بھی نہیں تھا اس لیے لفافے سے سین نکالے اور پڑھنا شروع کر دیے۔

محمود نے سارے سین، جو تعداد میں تقریباً دس تھے، اس طرح سنے کہ کچھ بولنا تو دور کی بات ہے، ہلے تک نہیں۔ ان کے چہرے سے بھی اندازہ نہیں ہو کہ قیسی کی محنت وصول ہوئی یا نہیں۔

سین پڑھنے کے بعد میں نے واپس لفافے میں رکھے اور لفافہ ان کے پاس پڑی ہوئی چھوٹی سی ٹیبل پہ رکھ کے جانے کے لیے کھڑا ہوا تو ان کے لفظوں نے روک لیا۔

''تم تو کافی پڑھے لکھے معلوم ہوتے ہو۔''

''جی... یوں ہی تھوڑا سا...''

''قیسی کے اسسٹنٹ ہو؟''

''جی نہیں، دوست ہوں۔ ملنے گیا تھا تو انھوں نے یہ سین پہنچانے کے لیے دے دیے۔ وہ خود کسی مشاعرے میں گئے ہیں۔''

Scanned with CamScanner

محمود نے سر ہلایا، سگریٹ کو چائے کے گلاس میں ڈال کر بجھا دیا اور پوچھا، ''کیا کرتے ہو؟''

''فی الحال تو بیکار ہوں۔''

وہ کچھ دیر تک سوچتے رہے، پھر بولے، ''میرے پاس کام کرو گے؟'' اور اس سے پہلے کہ میں اپنی حیرت یا خوشی کا اظہار کر سکتا، بھائی جان نے کہا، ''میں دو فلمیں بنا رہا ہوں۔ ایک تو یہی ہے ...'' (انھوں نے لفافے کی طرف اشارہ کیا۔) ''دوسری ابرار علوی لکھ رہے ہیں۔ اس میں میری بیٹی جتی کام کر رہی ہے۔ امریکن ماں کی بیٹی ہے، زبان بہت خراب ہے۔ دن بھر 'آتا ہوں، بتاتا ہوں' کرتی رہتی ہے۔ مجھے ایک ایسا آدمی چاہیے جو اسے ٹھیک سے ڈائیلاگ بولنا بتا سکے۔ ایکٹنگ سکھانے والا نہیں چاہیے، وہ بہت اچھی ایکٹریس ہے۔ باقی میں سنبھال لوں گا۔ اگر تم صحیح ورڈ کمز بتا سکو تو بولو۔''

قیسی کی ''گھٹیا، ناپائیدار اور بے فیض فلمی دنیا'' کا دروازہ مجھ پر کھل رہا تھا۔ اب یہ مجھ پر منحصر تھا کہ پاؤں بڑھا کے اندر داخل ہو جاؤں یا سر جھکا کے لوٹ جاؤں۔ دل سے آواز آئی: ''ابے سوچ کیا رہا ہے! زندگی کامیاب اور ناکام تجربوں کے ایک سلسلے کا نام ہی تو ہے۔ ایک اور ناکام تجربہ سہی۔'' محمود جیسے ہوشیار آدمی کی آنکھوں نے میری کشمکش کو فوراً بھانپ لیا

''ہزار روپے ملیں گے۔ لنچ اور کنوینس الگ سے۔''

''مجھے منظور ہے،'' میں نے کہا۔

محمود کی آنکھوں میں پل بھر کے لیے ایک چمک آئی اور غائب ہو گئی۔

''کل سے دھندے پہ لگ جاؤ۔''

''جی،'' میں نے کہا اور ''خدا حافظ'' کہہ کر نکل گیا۔

وہ جولائی کی ایک سہ پہر تھی۔ آسمان کالے بادلوں سے گھرا ہوا تھا اور بارش اس طرح ہو رہی تھی جیسے کئی مہینے کا حساب ایک ہی دن میں چکا دینا چاہتی ہو۔ میں بھائی جان کے سوئٹ کی بالکنی میں بیٹھا ہوا تھا اور اپنے سامنے سمندر پر چھائی ہوئی بارش کی دھند اور جھاگ اڑاتی ہوئی موجوں کو دیکھ رہا تھا جو ہوٹل کی دیوار کو چھو رہی تھیں، اور سوچ رہا تھا کہ بارش تو رکنے کا نام ہی نہیں لے رہی ہے، اگر لوکل ٹرینیں اور بسیں بند ہو گئیں تو اپنے گھر کیسے جاؤں گا۔

اچانک بھائی جان اپنے کمرے سے باہر آ گئے اور بولے، ''جاوید میاں، چلیے، ابرار علوی کے

Scanned with CamScanner

گھر چلتے ہیں۔ آج وہ جمی اور جانی کا اسکرپٹ سنا رہے ہیں۔" میں بارش، بس، فرزین اور اپنا گھر، سب کچھ بھول کر کھڑا ہو گیا۔ "چلیے چلیے..."

مجھے ابرار صاحب سے ملنے کی بڑی تمنا تھی۔ اس زمانے کے فلم رائٹرز میں ابرار صاحب کی وہی حیثیت تھی جو سنگیت میں بڑے غلام علی خاں کی تھی۔ میں نے ان کا نام ہی سنا تھا۔ انھیں دیکھنا تو دور کی بات، ان کی تصویر بھی نہیں دیکھی تھی۔ ان سے ایک عجیب سی عقیدت تھی مجھ کو۔ ان کی ہر فلم دیکھنا، اور ممکن ہو تو کئی بار دیکھنا لازمی تھا۔ پیاسا، کاغذ کے پھول، پروفیسر اور صاحب، بی بی اور غلام جیسی فلمیں لکھنے والے ابرار علوی میرے لیے ایک نام نہیں تھے، وہ ایک نشان تھے صاف ستھری اور بامقصد فلموں کا، اور ایک نئے طرز تحریر کا جس میں نپے تلے والے بے معنی مکالمے نہیں ہوتے تھے، جس میں لفظ وہیں استعمال ہوتا تھا جہاں اس کی ضرورت ہوتی تھی اور جس میں دو ڈائیلاگ کے بیچ کی خاموشی بولتی تھی۔ ان کے مختصر مگر دھاردار جملے، زندگی کے بازار سے چن کر اٹھائے گئے کردار، سینما ہال کے بند کمرے میں ہوا کے تازہ جھونکے کی طرح محسوس ہوتے تھے۔ میرے نزدیک فلمی دنیا میں ان کی وہی حیثیت تھی جو دلی والوں کے لیے قطب مینار کی یا بمبئی والوں کے لیے گیٹ وے آف انڈیا کی۔

محمود کی ویلینٹ (Valiant) جانکی کٹیر میں ایک چھوٹے سے بنگلے کے سامنے جا کر ٹھہر گئی جو سبز بیلوں سے ڈھکا ہوا تھا، اور جس کے لان پر نئی کیاریاں پھولوں سے مزین ہوئی تھیں۔

"اترو!" محمود نے کہا۔

میں نے سہمے ہوئے دیکھا۔ اس کالونی کی پتلی رپٹیلی گلی چمک رہی تھی اور تیز بارش کا شور بڑھ گیا تھا۔ محمود کا ڈرائیور تیزی سے اترا۔ اس نے چھاتا کھول کر محمود پر تان دیا اور خود بھیگتا ہوا اپنے مالک کو بنگلے کے اندر لے جانے لگا۔

گاڑی میں تین مسافر اور بھی تھے۔ محمود کا بیٹا مسعود، جو پکی کہلاتا تھا، ان کا چیف اسسٹنٹ پاریکھ اور میں۔ ہمیں لگا کہ ڈرائیور واپس آئے گا مگر وہ نہیں آیا تو ہمت باندھی اور پانی میں سے چھپاکے بھرتے ہوئے پتھروں اور اینٹوں پر پاؤں رکھتے، ہاتھوں سے سر کو بچاتے، بنگلے کی طرف دوڑ لگا دی۔ مگر پھر بھی برآمدے تک پہنچتے پہنچتے کافی بھیگ گئے۔ اس برآمدے میں جو لکڑی کے ستونوں پر ٹکا

Scanned with CamScanner

ہوا تھا اور جس کے ہر ستون پر بڑے پتوں والی بیلیں بل کھا رہی تھیں، کوئی بھی نہیں تھا۔

پکی نے برآمدے کے کونے کی طرف اشارہ کیا جہاں ایک دروازہ دکھائی دے رہا تھا۔ ہم تینوں اس کمرے میں گھس گئے۔

دروازے کے پاس ہی ایک بڑی سی میز تھی جس کے پیچھے ایک گھومنے والی کرسی پر ابرار صاحب تشریف رکھتے تھے۔ چہرہ اور سر بالوں سے خالی، چھوٹی چھوٹی آنکھیں جن سے تھکان اور بیزاری جھلک رہی تھی، موٹی سی ناک، موٹے موٹے ہونٹ اور پھولے ہوئے گال۔ سانولا رنگ اور بھاری بدن پر سلک کا کرتا اور لنگی...

پہلی نظر میں وہ کوئی ایسا پہلوان نظر آتے تھے جو برسوں پہلے اکھاڑے کو خدا حافظ کہہ چکا ہو۔ فلمی اصطلاح میں وہ کوئی ریٹائرڈ فائٹ ماسٹر دکھائی دیتے تھے۔ ان کی شخصیت میں ایسی کوئی ادا نہیں تھی جس سے شک بھی ہو سکے کہ وہ رائٹر ہیں، بلکہ بڑے رائٹر ہیں۔ انھوں نے سر ٹیڑھا کر کے ہم تینوں پر ایک نظر ڈالی، مگر اس نظر میں محبت، مروت اور خوشی جیسی کوئی بات نہیں تھی، اور پھر اپنے فائل کی ورق گردانی میں مصروف ہو گئے۔

میز کے پاس رکھی کرسی پر بھائی جان قبضہ کر چکے تھے۔ دو کرسیاں اور تھیں جن پر پکی اور پاریکھ بیٹھ گئے۔ یہ کمرہ شاید ابرار صاحب کا دفتر بھی تھا اور خواب گاہ بھی۔ کیونکہ آئینہ لگی ہوئی ایک بڑی سی الماری اور ایک ڈبل بیڈ بھی وہاں کے مختصر سامان کا حصہ تھے۔ میرے حصے میں پلنگ کا ایک کونا آیا اور میں اس پر اس طرح بیٹھ گیا جیسے نیا مجرم عدالت میں بیٹھتا ہے۔

ابرار صاحب نے اسکرپٹ سنانا شروع کیا اور میں نے پہلو بدلنا شروع کر دیا۔ وجہ اسکرپٹ نہیں تھی بلکہ وہ بدذات اے سی تھا جو بالکل میرے سامنے لگا ہوا تھا۔ میری معمولی سی سوتی قمیص، جو بھیگی ہوئی بھی تھی، اے سی کی تیز برفیلی ہوا کو روکنے کی کوشش اس طرح کر رہی تھی جس طرح غریب آدمی مہنگائی کو روکنے کی کوشش کرتا ہے اور ناکام ہوتا ہے۔ کانوں کو چھوڑ کر، جو ابرار صاحب کے ایک ایک لفظ کو غور سے سن رہے تھے، باقی پورا جسم خود پر قابو رکھنے اور کپکپی پر کنٹرول کرنے میں لگا ہوا تھا۔

ابرار صاحب جس طرح اسکرپٹ سناتے تھے اس طرح شاید ہی کوئی اور سنا سکے۔ ایسا لگتا تھا جیسے ہر کردار زندہ ہو گیا ہو۔ حد یہ ہے کہ جب وہ اپنی بھاری، کھردار آواز میں کسی عورت کے

Scanned with CamScanner

ڈائیلاگ بھی سناتے تھے تو اجنبیت کا احساس نہیں ہوتا تھا۔ ذہن اور سماعت دونوں اسے قبول کرلیا کرتے تھے۔ مختصر یہ کہ ابرار صاحب نے سماں باندھا، سننے والے عش عش کر اٹھے، مگر ابرار صاحب کو تشفی نہیں ہوئی۔ انھوں نے باری باری سب کی رائے پوچھی اور سب نے وہی کہا جو انھیں کہنا چاہیے تھا۔ انھوں نے میری طرف دیکھا اور پوچھا،'' آپ کو کیسا لگا؟'' تب تک میرے گھٹنے سُن ہو چکے تھے۔ ہاتھوں کی انگلیاں اس طرح جم گئی تھیں کہ ہلانے میں تکلیف ہو رہی تھی۔ ہونٹ بھی شاید نیلے ہو گئے ہوں گے۔ میں نے اپنی پوری قوتِ ارادی کا زور لگا کے بدن کی کپکپی کو روکا اور کہا،'' کچھ سین بہت اچھے ہیں۔''

ابرار صاحب کی نظریں بہت دیر تک مجھ پہ جمی رہیں۔ شاید انھیں '' کچھ سین'' والی بات پسند نہیں آئی تھی۔ یہ بڑے بڑے بالوں والا مریل سا لڑکا کیا جانتا ہے کہ کچھ سین نہیں، ہر سین ایک شاہکار ہے۔

میٹنگ ختم ہوگئی۔ میں جیسے تیسے گھر پہنچا اور کئی دن تک بخار میں پڑا رہا۔ اس کے بعد سین لینے یا کاپی کرنے کے لیے کئی بار ان کے گھر جانا پڑا، مگر ابرار صاحب نے کبھی لفٹ نہیں دی۔ اپنے کمرے میں بلانا تو دور کی بات ہے، وہ خود بھی باہر نہیں آتے تھے۔ نوکر کے ہاتھ سین بھیج دیتے اور ہم بند دروازے کا شکریہ ادا کر کے لوٹ آتے۔

شوٹنگ شروع ہو چکی تھی۔ سارا یونٹ محمود کے فارم کے پاس ایک گاؤں میں ایک بہت ہی گندے اور گھٹیا گیسٹ ہاؤس میں ٹھہرا ہوا تھا۔ لیکن پتا نہیں کیوں، بھائی جان مجھ پر بہت مہربان تھے۔ انھوں نے میرے قیام کا بندوبست اپنے فارم ہاؤس پہ کر دیا تھا۔ کھانا پینا بھی ان کے ساتھ ہی تھا۔ شاید اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ میں جی کے قریب رہ سکوں اور اس کی زبان کو درست کرنے کے لیے زیادہ وقت مل سکے۔

ایک دن شوٹنگ سے کچھ دیر پہلے بھائی جان کا میک اپ مین عبدل میرے پاس آیا اور کہنے لگا،'' آپ کو بلا رہے ہیں۔''

میں پہنچا تو دیکھا بھائی جان میک اپ کر کے تیار ہیں اور ایک ہاتھ میں سگریٹ اور دوسرے میں چائے لیے بیٹھے ہیں۔ سامنے ان کے دونوں اسسٹنٹ کھڑے ہوئے ہیں جنھیں محمود نے

"حیران" اور "پریشان" کا نام دیا تھا۔ حیران کے ہاتھ میں سین تھا اور پریشان ایک نوٹ بک میں کچھ لکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

"جی بھائی جان؟" میں نے عرض کیا۔ بھائی جان نے سگریٹ والا ہاتھ اوپر سے نیچے تک ہلایا، اپنی بڑی بڑی آنکھوں سے جن میں نشے یا نیند کے گہرے گلابی ڈورے چمک رہے تھے، مجھے گھورا اور حکم دیا: "جاوید میاں، ذرا یہ سین پڑھیے۔" میں نے سین پڑھنا شروع کیا۔ یہ محمود اور ہیلن کے بیچ ایک لو (Love) سین تھا جس کی ابتدا کچھ اس طرح ہوتی تھی:

"فریم کے بائیں کونے میں ایک پیڑ دکھائی دے رہا ہے جس کی ڈالی پر دو کبوتر بیٹھے ہوئے چونچیں لڑا رہے ہیں۔ کیمرا ڈاون ٹلٹ ہو کے پیڑ کے ساتھ ساتھ نیچے آتا ہے جہاں ہم دیکھتے ہیں کہ پیڑ کی ابھری ہوئی جڑوں پر ہیرو اور ہیروئن بیٹھے ہوئے ہیں اور باتیں کر رہے ہیں۔" سین کافی لمبا تھا لیکن ابرار صاحب کی خوبصورت جملے بازی نے سنبھال لیا تھا۔ میں نے سین ختم کر کے محمود کی طرف دیکھا تو وہ اچانک گرجے: "فون لگاؤ اس سالے لکھنے کو، اور پوچھو کہ کبوتر کہاں سے لاؤں؟... اور گر کبوتر مل بھی جائیں تو انھیں غٹرغوں کرانے کے لیے پیڑ پہ کیسے بٹھاؤں؟... لکھ دیتا ہے سالا جو جی چاہے! پانچ پیج کا سین بھیج دیا۔ ایک ڈا نگیٹو (Negative) کتنے میں آتا ہے، معلوم ہے اسے؟ کاٹو، سب کاٹو۔ مجھے پانچ لائنیں چاہییں، بس۔ جاؤ، لکھ کر لاؤ۔"

محمود کے دونوں اسسٹنٹ تو نام کے حیران پریشان تھے، مگر میں سچ مچ حیران پریشان تھا۔ ابرار علوی کی تحریر میرے لیے ایک مقدس چیز تھی۔ اسے تبدیل کرنے یا ترمیم کرنے کی گستاخی کے بارے میں تو سوچا بھی نہیں جا سکتا تھا۔ میں سین لے کے باہر نکلا۔ حیران پریشان میرے ساتھ تھے۔ میں نے پاریکھ سے پوچھا: "میں کیا کروں پاریکھ صاحب؟"

"وہی کرو جو بھائی جان کہہ رہے ہیں۔ سب کاٹ دو۔ بس اپنے کام کی دو چار لائنیں رہنے دو۔" اس نے سوکھا سا جواب دیا اور ٹہلتا ہوا چلا گیا

جمے جمائے سین کو توڑنا آسان نہیں ہوتا۔ ہر ایک ڈائیلاگ دوسرے ڈائیلاگ سے زنجیر کی طرح جڑا ہوا ہوتا ہے۔ ایسے سین کی ایڈیٹنگ کرنے میں سب سے بڑا خطرہ یہ ہوتا ہے کہ کہیں وہ بے ربط و بے مطلب نہ ہو جائے۔ میں نے سین کو دس بارہ دفعہ پڑھا۔ ادھر اُدھر سے کچھ جملے اٹھا کر

Scanned with CamScanner

جوڑنے کی کوشش بھی کی، مگر جب بات نہیں بنی تو اپنی طرف سے کچھ جوڑ کے سین کو بے ربط ہونے سے بچایا اور بھائی جان کی خدمت میں پیش کر دیا۔ مجھے بڑی حیرت ہوئی جب انھوں نے کہا: ''اچھا ہے، جاؤ شاٹ لگاؤ۔''

اس کے بعد میرے لیے ابرار صاحب کے سین پڑھ کر سنانا اور پھر محمود صاحب کی ہدایات کے مطابق ان میں تبدیلیاں کر کے شوٹنگ کرانا روزمرہ کا معمول ہو گیا۔ اکثر ایسا ہوتا تھا کہ سین لکھنے کے لیے نہ میرے پاس وقت ہوتا تھا اور نہ جگہ۔ بھائی جان سین سننے کے بعد اسے دوبارہ لکھنے کے لیے اتنا ہی وقت دیتے تھے جتنا ایک شاٹ سے دوسرے شاٹ کے بیچ میں ہوتا ہے۔ جب میں ابرار صاحب کے خوبصورت مکالموں کو کاٹتا تھا تو مجھے افسوس بھی ہوتا تھا، ڈر بھی لگتا تھا اور غصہ بھی آتا تھا، مگر کیا نہ کرتا۔ کبھی فٹ پاتھ پر، کبھی کسی گاڑی کے بونٹ پر اور کبھی کسی دروازے کی سیڑھیوں پر بیٹھ کر میں نے ان شہ پاروں کا جو حشر کیا وہ میرا دل ہی جانتا ہے۔ خدا خدا کر کے شیڈول ختم ہوا۔ بمبئی واپس جانے کی خوش خبری سنائی دی تو بہت اچھا لگا، مگر یہ ڈر بھی لگا کہ جب ابرار صاحب تک میری نازیبا حرکات کی خبر پہنچے گی تو وہ کیا کہیں گے، اور وہی ہوا۔ گھر پہنچے کچھ ہی دن ہوئے تھے۔ ایک دن فون کی گھنٹی بجی اور ایک گمبھیر آواز سنائی دی: ''جاوید صدیقی صاحب سے بات ہو سکتی ہے؟ میں ابرار علوی بول رہا ہوں۔''

یہ بتانا مشکل کام نہیں ہے کہ میری کیا حالت ہوئی ہوگی۔ محاورے میں نہیں بلکہ سچ مچ اوپر کی سانس اوپر اور نیچے کی نیچے رہ گئی۔ ''جی، میں بول رہا ہوں۔'' میں نے مری ہوئی آواز میں جواب دیا۔

''میاں، اگر تکلیف نہ ہو تو کسی دن گھر پہ آ جائیے، ایک ضروری بات کرنی ہے۔''

میں سمجھ گیا کہ وہ ضروری بات کیا ہوگی۔ ذہن میں طرح طرح کی تصویریں بننے اور بگڑنے لگیں۔ پتا نہیں کیا کہیں گے۔ برا کہیں گے، گالیاں دیں گے۔ اگر ہاتھ واتھ اٹھا بیٹھے تو کیا ہوگا۔ سنا ہے بڑے تیز آدمی ہیں اور منہ پھٹ بھی ہیں۔ دل سے آواز آئی، بہانہ کر دے، خیریت اسی میں ہے کہ جو ہونے سے دور رہا جائے۔ مگر منہ سے نکلا: ''جی، میں حاضر ہو جاؤں گا۔''

میں جب ابرار صاحب کے کمرے میں داخل ہوا، وہ اسی طرح اپنی گھومنے والی کرسی پہ بیٹھے تھے۔ انھوں نے کوئی جنبش دیے بغیر صرف آنکھوں سے کئی بار میرا قد ناپا اور پھر ذرا تیز لہجے میں

پوچھا: "محمود کے یہاں میرے سین کی اصلاح آپ کرتے تھے؟"

میں اس حملے کے لیے تیار تھا۔ میں نے عرض کیا: "سر، آپ تو بھائی جان کو جانتے ہیں۔ وہ وہی کرتے ہیں جو انھیں کرنا ہوتا ہے۔ میں نے بہت کوشش کی مگر وہ ہر سین کو اپنے طریقے سے لکھوانا چاہتے تھے۔ آئی ایم سوری سر، لیکن میں ان کی بات نہیں ٹال سکتا تھا، اس لیے جو انھوں نے کہا، میں نے لکھ دیا۔ زیادہ کوشش اس بات کی تھی کہ میں کنسٹرکشن بدل دوں مگر الفاظ آپ ہی کے رہیں۔"

وہ بہت دیر تک میری آنکھوں میں دیکھتے رہے، پھر سر ہلا کے بولے: "میں رش پرنٹ دیکھ چکا ہوں۔ آپ نے محمود سے میری عزت بچانے کی پوری کوشش کی، ورنہ وہ جاہل تو کچھ بھی کر سکتا ہے۔"

میں نے ایک لمبی سانس لی اور کہا: "پھر بھی میں اپنی گستاخی کی معافی چاہتا ہوں سر..."

"محمود نے بتایا، تم علی برادران کے خاندان سے ہو اور خلافت ہاؤس میں رہتے ہو؟"

"جی،" میں نے عرض کیا۔

ابرار صاحب بہت دیر تک کچھ سوچتے رہے اور میں اسی طرح کھڑا رہا۔ کھڑکی کے باہر پھولوں کو دیکھتے دیکھتے اچانک انھوں نے مڑ کر کہا: "یہ کرسی دیکھتے ہیں آپ؟"

میں نے اس میز کے پاس پڑی ہوئی بید کی لانگ چیئر کو دیکھا جس کا سفید رنگ جگہ جگہ سے اڑ گیا تھا اور جس پر ایک بڑا سا ریڈ کراس بنا ہوا تھا۔ کرسی کافی پرانی تھی اور اس پر گدا بھی نہیں تھا۔ کرسی کو غور سے دیکھ لینے کے بعد میں نے کہا: "جی..."

"یہ وہ کرسی ہے جس پر 'سلیم جاوید' والے سلیم خان بہت دنوں تک بیٹھتے رہے ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ بھی اس پر بیٹھ جائیں تاکہ میں دنیا سے کہہ سکوں کہ سلیم اور جاوید دونوں میرے اسسٹنٹ رہ چکے ہیں۔"

سلیم صاحب نے اس کرسی پر کتنے دن گزارے اور کیسے گزارے، معلوم نہیں۔ مگر مجھے چار ہی دن میں اندازہ ہو گیا کہ ابرار صاحب کے ساتھ کام کرنا مست ہاتھی کی سواری کرنے سے کم نہیں ہے۔ اس زمانے میں میرا قیام مشرقی بمبئی کی ایک کالونی نہرو نگر میں تھا۔ جوہو آنے کے لیے ایک لمبا سفر طے کرنا پڑتا تھا۔ پہلے ٹرین کے ذریعے کرلا سے دادر آیئے۔ دادر سے دوسری ٹرین بدل کے سانتا کروز پہنچیے۔ وہاں سے بس لیجیے اور جوہو کے آخری کونے پر اتر کے پیدل مارچ کرتے ہوئے

Scanned with CamScanner

جانکی کٹیر پہنچے۔ میں روزانہ نو بجے کے قریب گھر سے نکلتا اور گیارہ بجے تک ابرار صاحب کے بنگلے پر پہنچ جاتا تھا۔

ابرار صاحب دیر تک جاگتے تھے اس لیے اٹھتے بھی دیر سے تھے۔ اکثر ایسا ہوتا کہ میں پہنچتا تو وہ آرام میں ہوتے۔ کبھی جاگتے ہوئے بھی مل جاتے تو اس طرح کہ ٹوتھ برش منھ میں دبا ہوتا اور اپنے پھولوں سے ان کے احوال پوچھ رہے ہوتے۔ آگے آگے ابرار صاحب اور پیچھے پیچھے مالی۔ وہ ہر کیاری پر رک کے اس کا جائزہ لیتے، مالی کو کبھی سمجھاتے، کبھی ڈانٹتے، اور جب پھولوں کا طواف کر لیتے تو مجھ پر ایک نظر ڈالتے اور کہتے: "بس بھائی، میں نہا کر ابھی آیا۔ آپ تب تک چائے پیجیے۔" اور یہ کہہ کر وہ غائب ہو جاتے اور میں ابرار صاحب کے بچوں کے ساتھ، جو مجھے اپنے ہی گھر کا ایک فرد سمجھنے لگے تھے، گپیں مارنے لگتا۔ کوئی گھنٹے بھر بعد ایک دم سے دھلے دھلائے ابرار صاحب برآمد ہوتے اور ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھ کر آواز لگاتے:

"ارے کم بختو، کچھ کھانے کو ہے؟"

وہ ناشتہ کرتے جاتے اور زور زور سے بول کر باتیں کرتے جاتے۔ عام طور پر اس ناشتہ نما کھانے پر جن موضوعات پر اظہار خیال ہوتا وہ تین تھے: اچھے نوکروں کی کمی، بچوں کی بڑھتی ہوئی نالائقی اور گھٹیا فلموں کی بہتات۔

کوئی ایک بجے کے قریب ابرار صاحب اپنی کرسی سنبھالتے اور میں اپنی۔ وہ کھانستے کھنکارتے، دو تین گہری گہری سانسیں لیتے اور پھر ایک شیشی میں سے ایک ٹیبلٹ نکالتے، بڑی احتیاط سے اس کے دو ٹکڑے کرتے اور ایک ٹکڑا پانی سے نگل کر کرسی کی پشت سے سر ٹکا دیتے۔

"بھائی، اب ہم کوئی گھنٹے کی نیند کے بعد بات کریں گے۔ آپ جائیے، بچوں کے ساتھ کچھ کھا پی لیجیے..."

میرا لنچ ختم ہوتے ہوتے اور ان کی گولی کھائے کوئی تین بج جاتے، اور تب ابرار صاحب پوچھتے: "ہاں، تو ہم کہاں تھے؟" اور یہ وہ وقت ہوتا جب صحیح معنوں میں کام شروع ہوتا۔ میں نے ایک اچھی عادت یہ بنا لی تھی کہ پچھلے دن کا سارا ڈسکشن ایک نوٹ کی شکل میں لکھ لیا کرتا تھا۔ میں اپنا نوٹ پڑھ کر سناتا اور وہ بات کو وہیں سے شروع کر دیتے جہاں سے چھوڑی تھی۔ آپ کہیں گے، یہ تو

Scanned with CamScanner

ایسی صورت حال نہیں ہے جسے مست ہاتھی کی سواری کہا جائے۔ ذرا ٹھہریے، پہلے آگے کی سن لیجیے۔

اگر اسکرین پلے بن رہا ہوتا تو سین کی requirements پر بات ہوتی: سین کا موڈ کیا ہے۔ آگے کی کہانی پر اس سین کا کیا اثر پڑے گا۔ سین جو انفارمیشن دے رہا ہے وہ کتنی اہم یا غیر اہم ہے۔ یہ بحث دیر تک چلتی رہتی۔ ان کی بحث بھی یک طرفہ ہوتی تھی، یعنی خود ہی سوال کرتے، جواب بھی خود ہی دیتے اور جب جرح ختم کر کے کسی فیصلے پر پہنچتے تو پوچھتے:

"آپ کی کیا رائے ہے؟"

اور میرے سامنے "جی ٹھیک ہے" کہنے کے سوا کوئی رستہ نہ ہوتا۔

ڈائیلاگ لکھتے وقت تو اور بھی مشکل ہوتی۔ وہ جملے بناتے، ایک ایک لفظ کو تولتے ناپتے، اداکاری کے ساتھ بول کر دیکھتے اور پسند نہ آتا تو کاٹ کر پھینک دیتے۔

پھر نئے سرے سے وہی...

مجھے یاد ہے، لیلیٰ مجنوں کا ایک سین لکھ رہے تھے۔ سچویشن یہ تھی کہ ایک عرب (یہ کردار ابرار صاحب نے ہی ادا کیا تھا) صحرا میں نماز پڑھ رہا ہے اور مجنوں "لیلیٰ! لیلیٰ!" پکارتا ہوا اس کے سامنے سے گزر جاتا ہے۔ نمازی اپنی نماز چھوڑ کر مجنوں کو ڈانٹتا ہے کہ اس نے کتنا بڑا گناہ کیا ہے اور لیلیٰ کی محبت میں اپنا ہوش کھو دینے والا مجنوں اس کا جواب دیتا ہے۔

وہ چند سطروں کا ایک چھوٹا سا سین تھا، مگر ہم نے اسے لکھنے میں تین دن لگائے۔ چونکہ بات بڑی کہنی تھی اور لفاظ کم، یعنی کوزے میں سمندر کو اتارنا تھا۔

اس سین کا وہ کلیدی مکالمہ "... تو میں بھی محبت کا غلام ہوں..." کم سے کم ساٹھ الگ الگ ڈھنگ سے لکھا گیا۔ میرے خیال میں وہ مکالمہ بڑا معمولی سا ہے اور اس میں ایسی کوئی بات نظر نہیں آتی جس سے احساس ہو کہ اس پر دو آدمی تین دن تک سر کھپاتے رہے تھے۔ جملہ معمولی سہی مگر فنی تسکین کے لیے انتھک محنت کی غیر معمولی مثال ہے۔

ابرار صاحب کے یہاں جاتے ہوئے کچھ ہی دن ہوئے تھے کہ میں نے انھیں بتایا کہ ستیہ جیت رے کی فلم کے ڈائیلاگ لکھنے کو ملے ہیں تو بہت خوش ہوئے۔ کہنے لگے: "لگتا ہے، کہانی دہرائی جائے گی۔ مجھے بھی گرودت نے اسی طرح ڈھونڈ کے نکالا تھا..." اور پھر جب میں نے بتایا کہ کلکتہ جانا

Scanned with CamScanner

پڑے گا تو اچھل پڑے۔ "اس سے اچھا موقع نہیں ملے گا جاوید میاں، لکھو لکھو، سیکھ لو جو سیکھ سکتے ہو۔ ستیہ جیت رے بہت قابل ڈائریکٹر ہے!" میں نے کہا: "مگر میں محمود بھائی جان سے پیسے لے چکا ہوں اور شوٹنگ باقی ہیں۔ فلم ادھوری چھوڑ کے کیسے جا سکتا ہوں؟" کہا: "ارے آپ جائیے میاں، محمود کو میں سمجھا دوں گا، اور نہیں سمجھا تو جتنے روپے ایڈوانس لیے ہیں، میں لوٹا دوں گا۔"

میں شطرنج کے کھلاڑی کی شوٹنگ کے سلسلے میں کلکتہ، لکھنؤ، جے پور اور کئی مقامات پر گھومتا پھرا مگر جب بھی لوٹا، سیدھا ابرار صاحب کے پاس پہنچا اور جتنا وقت ملا ان کے ساتھ گزارا۔

یہ وہ زمانہ تھا جب ابرار صاحب بے حد مصروف تھے۔ آر کے فلمز کی بیوی او بیوی کی شوٹنگ چل رہی تھی۔ دیپ کمار سائرہ بانو کی فلم ماسٹر جی کا اسکرین پلے بن رہا تھا۔ امیش مہرہ کی فلم ہمارے تمہارے کے ڈائیلاگ لکھے جا رہے تھے، اور ایک بے نام فلم پر بھی کام ہو رہا تھا جو ایک کروڑپتی سیٹھ اپنی بیٹی کو ہیروئن بنانے کے لیے شروع کرنا چاہتے تھے۔ کام زیادہ ہوتا تھا تو ابرار صاحب بمبئی سے بھاگ جایا کرتے تھے۔ ماتھیران یا کھنڈالا کی پہاڑیوں میں ایک بنگلہ کرائے پر لے لیتے اور کئی کئی مہینے وہیں رہتے۔

عام طور پر ان پہاڑی بنگلوں میں تین افراد کے سوا کوئی نہ ہوتا۔ ابرار صاحب، میں اور ایک باورچی، جو ڈرائیور کا کام بھی کرتا تھا۔ اور ابرار صاحب بنگلہ بھی ایسا چنتے تھے جو آبادی سے دور ہو۔ ہر طرف ہریالی اور خاموشی۔

پہاڑوں کی خاموشی بڑی عجیب ہوتی ہے۔ بالکل ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے چاروں طرف کائی کی طرح ایک ہرے رنگ کا سناٹا جم گیا ہو۔

دن تو کام میں گزر جاتا، شام ہوتی تو ابرار صاحب کی بوتل طلوع ہوتی۔ بلانوش آدمی تھے۔ پینے پر آتے تھے تو اس طرح پیتے تھے کہ لگتا تھا، شراب سے کسی گستاخی کا بدلہ لے رہے ہیں۔ وہ کتنی بھی پی لیں، بہکتے نہیں تھے۔ کہتے تھے، انھیں ہینگ اوور (شراب کا درد سر) کبھی نہیں ہوا۔ میں بھی ساتھ بیٹھتا تھا مگر پیتا کم تھا، شرمندہ زیادہ ہوتا تھا۔ یہ بھی کوئی محفل ہوئی - ایک بلانوش دوسرا ابا نوش...

ان تنہا اور خاموش راتوں میں جو آدمی مجھے نظر آیا وہ اصلی ابرار علوی تھا۔ ایک اکیلا، اداس، اکتایا ہوا آدمی...

Scanned with CamScanner

ان کے پاس سب کچھ تھا مگر وہ اندر سے خالی تھے، اس ریگستان کی طرح جس سے قافلے گزرتے تو ہیں، رک کر گھر نہیں بساتے۔

ان کی زندگی میں کئی عورتیں آئی تھیں۔ ایک کال گرل تھی جسے وہ بہت چاہتے تھے۔ اس سے شادی کرنے کے لیے بھی تیار تھے مگر ایک چھوٹی سی بات پر رشتہ ٹوٹ گیا اور وہ عورت اس طرح گئی کہ پھر کبھی لوٹ کر نہیں آئی۔ وہ کہتے تھے کہ پیاسا کی گلابو کا کردار وہیں سے لیا گیا ہے۔

ابرار صاحب نے ایک مراٹھی لڑکی سے شادی کی تھی۔ پانچوں بچے انھیں کی اولاد ہیں۔ مگر مزاج اور کلچر کے فرق نے دیوار کھڑی کردی اور گھر ٹکڑوں میں بٹ گیا۔ ایک ایکٹریس تھیں جو بیوی سے علیحدگی کے بعد ایک عرصے تک ہمدم و دمساز بنی رہیں، مگر ان کی مجبوری یہ تھی کہ وہ محبوبہ تو رہنا چاہتی تھیں، ابرار صاحب کے بچوں کی ماں بننے کو تیار نہیں تھیں، اس لیے وہ رشتہ بھی ٹوٹ گیا۔ بڑی بہن نے بہت کوشش کی کہ کسی طرح اجڑا ہوا گھر بس جائے۔ نہ جانے کہاں کہاں سے جمع کرکے بہت سی کم عمر بیواؤں اور عمر رسیدہ کنواریوں کی تصویریں بھیجیں۔ ابرار صاحب وہ تصویریں دکھاتے تھے۔ ان خواتین کا بایوڈیٹا بتاتے تھے اور پوچھتے تھے، ''آپ بتائیے، کون سی مناسب رہے گی؟ یا پھر انکو ہیبے بو کروں؟''

وہ جس تنہائی کو بانٹنا چاہتے تھے وہ ان کے اندر بھی اور بہت گہرائی میں تھی۔ ڈر یہی تھا کہ اگر کوئی اس گہرائی تک نہ اتر پایا تو کیا ہوگا؟

ابرار صاحب کو اپنے بچوں سے بھی وہ نہ مل سکا جو ملنا چاہیے تھا۔ مگر اس کی پوری ذمہ داری خود ابرار صاحب کی تھی۔ وہ ایک جاگیردارانہ، بلکہ آمرانہ ماحول کی پیداوار تھے۔ ان کے والد الطاف علوی مدھیہ پردیش میں ڈی آئی جی تھے جن کی چار بیویاں اور سولہ بچے تھے۔ ابرار صاحب نے اپنے والد کو بیس آدمیوں کے کنبے، درجنوں نوکروں اور سیکڑوں سپاہیوں پر اس طرح حکومت کرتے دیکھا کہ کبھی کسی کو شکایت کی آواز بلند کرنے کا موقع بھی نہ ملا۔ ابرار صاحب بھی اپنے گھر میں کچھ ویسا ہی ماحول چاہتے تھے، مگر، ماڈرن اسکولوں اور کالجوں میں جانے والے بچے ان پرانی تہذیبی قدروں کو کیا سمجھتے اور انھیں بتانے والا بھی کون تھا؛ نوکر تو تربیت دینے سے رہے۔

ابرار صاحب کی ساری زندگی تین مورچوں پر لڑتے ہوئے گزری۔ ایک طرف ان کا تخلیقی

Scanned with CamScanner

عمل تھا، دوسری طرف ان کا گھر، اور تیسری طرف ان کی اپنی آرزوئیں، امیدیں اور ضرورتیں۔

ماتھیران کی پہاڑی پر ایک ویران بنگلے میں اپنی پرچھائیوں کے بیچ بیٹھے ہوئے ابرار صاحب مجھے ایک موم بتی کی طرح دکھائی دیتے جو دونوں سروں پر جل رہی ہو اور جگہ جگہ سے پگھل رہی ہو۔ میں ان سے ہمدردی بھی نہیں کرسکتا تھا کیونکہ انہیں لفظ ہمدردی سے چڑ تھی۔

پھر ایک دن اچانک وہ مجھ سے ناراض ہوگئے۔

ہوا یوں کہ امیش مہرہ کی فلم ہمارے تمہارے 26 جنوری 1978 کو ریلیز ہوئی اور کافی پسند کی گئی۔ وہ دن امیش کے لیے دوہری خوشی کا دن تھا کیونکہ اسی دن اس کی بیٹی شیتل بھی پیدا ہوئی تھی۔ اس دوہری خوشی کے موقعے پر ایک شاندار پارٹی دی گئی جس میں امیش نے اچانک مجھ سے پوچھا، ''تو میری اگلی پکچر لکھے گا؟'' مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے اس ہال کی مدھم روشنیاں اچانک بہت تیز ہوگئی ہوں۔ میں نے بالکنی کے باہر دور تک پھیلے ہوئے سمندر کو دیکھا تو ایک بڑا سا اسکرین دکھائی دیا جس پر میرا نام لہروں کے ساتھ ہچکولے لے رہا تھا۔

کچھ دن بعد مجھے ایگل فلمز کے دفتر میں بلایا گیا اور علی بابا چالیس چور کی کہانی سنائی گئی۔ پتا چلا کہ فلم روسی اشتراک کے ساتھ بنائی جا رہی ہے اور اس میں ہندوستانی اداکاروں کے ساتھ روسی ستارے بھی ہوں گے۔ ایک ایسی فلم جس میں اس وقت کی سب سے زیادہ کامیاب جوڑی دھرمیندر اور ہیما مالنی ہوں، اور ساتھ میں زینت امان بھی، اور وہ مجھ جیسے نوسکھیے کو مل جائے تو جو حالت ہونی چاہیے وہ میری بھی ہوئی۔

میں یہ خبر سب سے پہلے ابرار صاحب کو سنانا چاہتا تھا، اس لیے مٹھائی کا ایک ڈبا لیا اور ان کے گھر پہنچ گیا۔ ابرار صاحب کی بڑی بیٹی شبنم باہر ہی مل گئی۔ اس نے مجھے دیکھتے ہی کہا، ''ابا سے مت ملنا، بہت غصے میں ہیں اور آپ سے بہت زیادہ ناراض ہیں۔''

''مجھ سے ناراض ہیں؟'' میں حیران ہوگیا۔

شبنم نے بتایا کہ ابرار صاحب مجھے دھوکے باز، دغاباز، آستین کا سانپ اور نہ جانے کیا کیا کہہ رہے ہیں۔ ''ان کا خیال ہے کہ آپ نے جان بوجھ کر ابا کا پتا کٹوایا اور اتنی بڑی فلم حاصل کر لی۔''

میں نے کہا، ''ایسی صورت میں تو ان سے ملنا بہت ضروری ہے تاکہ میں انہیں اصلیت بتا سکوں۔''

Scanned with CamScanner

مگر شبنم نے منع کر دیا۔ ’’آپ تو ابا کو جانتے ہیں، جو بات ان کے دماغ میں آجاتی ہے اسے کوئی نہیں نکال سکتا۔ آپ ملیں گے تو سمجھیں گے کہ جلے پر نمک چھڑکنے آیا ہے۔‘‘

مجھے اتنی تکلیف پہنچی کہ آنکھیں جلنے لگیں۔ مگر شبو ٹھیک کہہ رہی تھی۔ ابرار علوی کو قائل کرنا پتھر سے دودھ نکالنے کی طرح ناممکن تھا۔ میں سر جھکا کے لوٹنے لگا تو شبنم نے روک لیا۔

’’یہ مٹھائی کہاں سے لے جا رہے ہیں؟ یہ تو دیتے جائیے۔ ابا ناراض ہیں تو کیا ہوا، ہم تو بہت خوش ہیں کہ آپ کو اتنی بڑی فلم ملی ہے۔ وِش یو آل دی بیسٹ...‘‘

میں ڈبا دے کے چلا آیا، مگر جو خوشی اور جوش تھا وہ ختم ہو چکا تھا۔ اس واقعے کے برسوں بعد تک ابرار صاحب نے مجھ سے بات نہیں کی۔ کبھی کسی جگہ آمنا سامنا ہو بھی جاتا تو منھ پھیر لیتے تھے۔

ایک طریقے سے ان کا غصہ حق بجانب تھا۔

جس آدمی نے ایگل فلمز کے لیے آدھی درجن کامیاب فلمیں لکھی ہوں اسے یوں وجہ بتائے بغیر نکال دیا جائے تو اپنی بے عزتی پر کیسے غصہ نہیں آئے گا۔ مگر میری ناراضگی بھی غلط نہیں تھی۔ ابرار صاحب جیسا انسان میرے بارے میں اتنا غلط فہم کیسے ہو سکتا ہے۔ اس لیے میں بھی دور دور ہی رہا۔

’سبک سر بن کے کیا پوچھیں کہ ہم سے سرگراں کیوں ہو؟‘

اچانک ایک دن انور کا فون آیا۔ ’’ابا آپ سے بات کرنا چاہتے ہیں...‘‘

برسوں بعد پھر ایک بار وہی کھرج دار آواز کانوں سے ٹکرائی تو دل بہت زور سے دھڑکا۔ کہانی میں کوئی اور موڑ نہ آ گیا ہو۔ مگر ان کا لہجہ وہی پرانا والا تھا، وہی محبت شفقت اور اپنا پن۔ ’’بھئی جاوید میاں، کل رات ٹی وی پہ ایک فلم آ رہی تھی۔ ڈائیلاگ سن کے لگا جیسے میں نے ہی لکھے ہوں۔ مگر بچوں نے بتایا کہ وہ فلم آپ نے لکھی ہے۔‘‘ وہ فلم گرو کا ذکر کر رہے تھے۔ میں ہنسا۔ عرض کیا، ’’چیلے میں گرو کے گن نہ آئیں تو چیلا کا ہے کا؟‘‘

بڑے پیار سے بولے، ’’ہاں، یہ تو ہے۔ کسی دن وقت ملے تو آئیے۔ بہت دن سے ملاقات نہیں ہوئی...‘‘

میں دوسرے دن ہی پہنچ گیا۔ بالکل اسی طرح ملے جیسے ملتے تھے۔ ایسا لگا ہی نہیں کہ اس رشتے میں کبھی کوئی دراڑ بھی آئی تھی۔

Scanned with CamScanner

میں نے ان سے کبھی نہیں پوچھا کہ حضور آپ کی غلط فہمی کیسے دور ہوگئی، اور نہ انھوں نے بتایا، مگر دوسرے ذرائع سے معلوم ہوا کہ ابرار صاحب کو ائیگل فلمز سے نکالے جانے اور ایک نئے رائٹر کو لینے کی وجوہات دو تھیں۔ ایک تو ابرار صاحب کی ضدی طبیعت اور دوسری یہ کہ انھوں نے کہا تھا: "اگلی فلم کے 75 ہزار روپے لوں گا۔" (مجھے علی بابا چالیس چور لکھنے کے 12 ہزار روپے دیے گئے تھے۔)

ابرار صاحب کے پاس آنا جانا تو پہلے کی طرح ہوگیا مگر میں ان کے ساتھ کوئی کام نہیں کر سکا، کیونکہ میرے اپنے پاس بہت زیادہ کام تھا، میں ان کو اسسٹ کرنے کا وقت نکال ہی نہیں سکتا تھا۔ ابرار صاحب میری ترقی سے خوش تھے۔ وہ اسے اپنی کامیابی مانتے تھے۔ اکثر کہا کرتے تھے، "آپ لمبی ریس کے گھوڑے ہیں میاں، بس ذرا دھیان رکھنا، ہٹ ہو جائے تو دماغ نہ خراب کرنا، اور فلاپ ہو جائے تو الزام کسی اور کو مت دینا۔ کامیابی اور ناکامی ایک ہی سکے کے دو پہلو ہیں، اور یہ سکہ آپ کا ہے۔"

اسی زمانے کی بات ہے کہ ایک دن مجھے حکم ملا: "شام کو ضرور آیئے، کچھ بات کرنی ہے۔" میں پہنچا تو بہت تھکے تھکے سے لگ رہے تھے۔ آداب سلام کے بعد دیر تک چپ بیٹھے رہے۔ پھر بولے، "میاں، آپ تو جانتے ہیں میں حجرے کا فقیر ہوں۔ نہ کہیں جاتا ہوں، نہ کسی کو بلاتا ہوں۔ نئی نسل مجھے جانتی نہیں، اور جاننے والے ختم ہوتے جا رہے ہیں۔ اور یہ فلم انڈسٹری تعلقات کی دنیا ہے۔ آپ ہوشیار آدمی ہیں، بات کرنے کا فن جانتے ہیں، رائٹر بھی اچھے ہیں۔ کیوں نہ ہم دونوں مل کر کام کریں۔ میں ڈکٹیٹ کرتا ہوں، آپ ہینڈل کیجیے۔ کیا خیال ہے؟"

ایک آسمان جھک کر زمین کو ساتھ آنے کی دعوت دے رہا تھا... ابرار علوی اور جاوید صدیقی کی پارٹنرشپ؟... میری صلاحیت کو اس سے بڑا سرٹیفکیٹ نہیں مل سکتا تھا۔

میں جانتا تھا کہ وہ جو کچھ کہہ رہے ہیں اس میں خلوص اور ایمانداری ہے۔ میں یہ بھی جانتا تھا کہ ان کے پاس کام بہت کم ہے اور صحت بھی گرتی جا رہی ہے۔ بلغمی کھانسی اور ذیابیطس جیسی بیماریاں انھیں کھوکھلا کر رہی ہیں۔ انھیں میری ضرورت ہے مگر یہ بھی جانتا تھا کہ برگد کے عظیم اور تناور درخت کے نیچے اگے ہوئے پودوں پر کسی کی نظر نہیں جاتی۔

بہت دیر سوچنے کے بعد ڈرتے ڈرتے وہ بات کہہ دی جو سوچ رہا تھا۔ وہ بہت دیر تک میری آنکھوں میں دیکھتے رہے۔ پھر اچانک مسکرا دیے اور میرے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ کر بولے، ''ٹھیک کہتے ہو، کریڈٹ اسی کو ملتا ہے جس کا نام ہوتا ہے... میرے ساتھ بھی یہی ہوا، میری محنت کا کریڈٹ کسی اور کو دیا گیا۔ بہت سے لوگ آج تک یہی سمجھتے ہیں کہ صاحب، بی بی اور غلام میں نے نہیں ڈائریکٹ کی تھی...''

اس دن پہلی بار مجھے معلوم ہوا کہ لفظ بھی ڈنک مار سکتے ہیں۔ برسیں گزر چکی ہیں مگر آج بھی ابرار صاحب کی اس بات کا درد محسوس کر سکتا ہوں۔

ابرار صاحب کی دلچسپیاں بہت محدود تھیں۔ انھیں صرف تین چیزیں پسند تھیں: پھول، مہدی حسن اور کرکٹ۔ پھولوں کے بارے میں تو میں بتا چکا ہوں۔ نہ جانے کہاں کہاں سے پودے منگوا کے لگواتے، اور جب ان میں پھول آتے تو چہرے کی چمک دیکھنے کے قابل ہوتی۔ پھولوں سے اتنا پیار کرتے تھے، مگر ایک اچھی عادت یہ تھی کہ کبھی توڑ کر میزیں نہیں سجاتے تھے۔ مجھے بھی گلدانوں میں لگے ہوئے پھول دیکھ کر بہت تکلیف ہوتی ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے قتل عام کے بعد سر چن دیے گئے ہوں۔

کرکٹ سے دلچسپی کا عالم یہ تھا کہ اگر میچ آسٹریلیا میں ہوتا تھا تو صبح تین بجے اٹھ کر بیٹھ جاتے اور اپنے ٹرانزسٹر سے کان لگا کر جم جاتے جس میں سے کمنٹری تو کم سنائی دیتی تھی، کھڑ کھڑ کھٹ کھٹ کی آوازیں زیادہ آیا کرتی تھیں۔ انڈیا پاکستان کا شاید ہی کوئی ٹیسٹ ہو جس کی تفصیل انھیں یاد نہ ہو۔

جہاں تک مجھے معلوم ہے، ابرار صاحب کو موسیقی سے کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی، مگر نہ جانے کیسے انھیں غزل، اور وہ بھی مہدی حسن کی غزل کا چسکا لگ گیا۔ بس پھر کیا تھا۔ مہدی کا وہ کون سا کیسٹ تھا جو ابرار صاحب نے حاصل نہ کر لیا ہو۔ زیادہ تر ایسا ہوتا کہ شام ہوتی، بوتل کھلتی اور مہدی کی سحر کار آواز ساتھ دیتی تو دنیا کی ہر مصیبت بے حقیقت معلوم ہونے لگتی۔

آئے کچھ ابر کچھ شراب آئے
اس کے بعد آئے جو عذاب آئے

یہاں میں ایک راز کی بات بتا دوں۔ ابرار صاحب کی انگلش اور ہندی جتنی اچھی تھی، اردو ان کے مقابلے میں کمزور تھی۔ بول چال کی زبان کے بادشاہ تھے مگر ادب و شعر کے معاملات میں اچھے

جاتے تھے۔ کوئی مشکل لفظ آجائے یا کوئی شعری ترکیب سمجھ میں نہ آئے تو پریشان ہوجاتے تھے۔ اکثر رات گئے فون آجاتا: ''ارے بھئی، اس لفظ کا کیا مطلب ہے؟'' یا ''اس شعر کا مفہوم کیا ہے؟'' وہ میرے بزرگ بھی تھے اور استاد بھی، مگر اردو کے معاملے میں شاگرد بن جاتے تھے، اور اس رشتے پر انھوں نے کبھی شرمندگی کا اظہار نہیں کیا۔

فلمی دنیا کے علاوہ ایسی کوئی جگہ نہیں ہے جہاں آرٹ اور بزنس ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑ کر چلتے ہوں، مگر اس کے باوجود آرٹسٹ اور بزنس مین کی دوری برقرار رہتی ہے۔ ابرار صاحب آرٹسٹ تھے۔ وہ اس شخص کا ذکر بڑے ہی والہانہ انداز میں کرتے تھے جو ان سے بڑا آرٹسٹ تھا، اور یہ ایک ایماندار فنکار کی پہچان ہے۔ مگر وہ لوگ جو ابرار صاحب سے اپنے کام کی غرض سے ملا کرتے تھے، اس رشتے کو سمجھ ہی نہیں سکتے تھے جو ابرار صاحب اور گرودت کے درمیان تھا، اس لیے بور ہوکر چلے جاتے اور دوسرے دروازے ڈھونڈنے لگتے۔

ابرار صاحب کی گرودت نوازی نے انھیں جتنا نقصان پہنچایا، ان کی اور کسی کمزوری نے نہیں پہنچایا۔

گرودت ان کی طاقت بھی تھے اور ان کی سب سے بڑی کمزوری بھی۔ عربی شاعر معری نے کہا تھا، عشق کی سات منزلیں ہوتی ہیں: انس، حب، عشق، عقیدت، عبادت، جنون اور موت۔ گرودت کے لیے ابرار صاحب کی محبت عقیدت سے کچھ زیادہ تھی۔ وہ جب گرودت کا ذکر کرتے تو ان کے تھکے تھکے اکتائے ہوئے لہجے میں پتا نہیں کہاں سے اچانک ایسی تیزی اور تندی آجاتی جیسے سویا ہوا جنگل آندھی سے جاگ جاتا ہے۔ ان کا پورا وجود زندہ ہوجاتا۔ آواز اونچی ہوجاتی، آنکھوں کی چمک اور ہاتھوں کی جنبش تیز ہوجاتی۔

انھیں گرودت کی ایک ایک بات اور ایک ایک ادا یاد تھی۔ اپنی پہلی بار کے ہائے ہیلو سے لے کر آخری ملاقات تک وہ کون سا لمحہ تھا جو وہ بھول گئے ہوں۔

ناگپور سے ایل ایل بی کرنے کے بعد بمبئی اس لیے آئے تھے کہ بڑا شہر ہے۔ کورٹ کچہریاں بھی بہت سی ہیں، کہیں نہ کہیں تو ایک اور کالے کوٹ والے کی جگہ نکل ہی آئے گی۔ بمبئی میں ایک رشتے کے بھائی کے گھر ٹھہرے جن کا فلمی نام جسونت تھا۔ گیتا بالی کے بہنوئی تھے اور چھوٹے

Scanned with CamScanner

موٹے رول کرنے کے علاوہ گرودت کے پروڈکشن ڈپارٹمنٹ میں بھی کام کرتے تھے۔ انھی جسونت جی کے ذریعے فلم بازی کے سیٹ پر گرودت سے ملاقات ہوئی اور گرودت نے اس نوجوان وکیل میں نہ جانے کیا دیکھا کہ پوچھا: ''میری فلم کے ڈائیلاگ لکھوگے؟''

ابرار علوی نے کہا: ''ضرور لکھوں گا۔''

اور پھر یوں ہوا کہ اس دن سے لے کر آخری فلم تک گرودت کی تمام فلموں کے ڈائیلاگ صرف اور صرف ابرار علوی نے لکھے۔

ابرار صاحب گرودت کے رائٹر بھی تھے، اسسٹنٹ بھی، ڈائیلاگ ڈائریکٹر بھی، دوست بھی اور راز دار بھی۔ گرودت کی زندگی میں بہت سے ایسے گوشے تھے جن تک ابرار صاحب کے سوا اور کوئی نہیں گیا۔ گرودت کی زندگی اور موت پر بہت سی جھوٹی سچی کہانیاں بنائی گئیں مگر حقیقت کیا تھی، یہ صرف ابرار صاحب جانتے تھے، یا اب میں جانتا ہوں؛ مگر میری زبان بھی ابرار صاحب سے کیے ہوئے وعدے نے بند کر رکھی ہے۔ وہ اپنے گرو کے بھید نہیں کھولنا چاہتے تھے تو میں اپنے گرو کے راز کیوں کھولوں؟

ابرار صاحب انسانی سیرت کو بہت اچھی طرح سمجھتے تھے۔ ان کے چھوٹے چھوٹے نکھرے ہوئے جملے انھیں مکالمہ نگاروں میں ایک الگ اور ممتاز مقام دیتے ہیں۔ جو ظرافت اور ہلکی پھلکی شرارت ان کے مکالموں میں ملتی ہے ویسی ہی ظرافت ان کے روزمرہ میں بھی تھی۔

ای ٹی وی اردو کے لیے میں ایک سیریل کرتا تھا جس کا نام تھا: ''جاوید صدیقی کے مہمان۔'' آدھے گھنٹے کا یہ ہفتہ وار پروگرام بہت ہی مقبول تھا اور شعر و ادب، فلم، ثقافت اور مصوری سے جڑے نامور لوگ انٹرویو دینے آ چکے تھے۔ میں نے ابرار صاحب کو دعوت دی تو کہنے لگے: ''میں ضرور آؤں گا اور اپنی تشریف بھی لے کر آؤں گا۔'' بات ہنسی میں ٹل گئی مگر جب ابرار صاحب اسٹوڈیو آئے تو ان کے ہاتھ میں اسکوٹر کے پہیے کے سائز کا ایک ٹیوب تھا جس میں ہوا بھری ہوئی تھی۔ میں نے پوچھا، ''یہ کیا ہے؟'' فرمایا: ''یہ میری تشریف ہے۔ پہلے یہ رکھی جائے گی، پھر میں بیٹھوں گا۔'' پتا چلا کہ ان کی ریڑھ کی ہڈی بڑھ گئی ہے اور بیٹھنے میں تکلیف ہوتی ہے، اس لیے ٹیوب کا استعمال کرتے ہیں۔ کہنے لگے: ''میاں، میری بیماری سے ثابت ہوتا ہے کہ انسان واقعی بندر کی اولاد ہے۔ مگر اللہ کا شکر ہے کہ دم زیادہ نہیں بڑھی ہے، ورنہ ایک زِپ پیچھے بھی لگانی پڑتی۔''

Scanned with CamScanner

جملہ چست کرنے میں بھی تکلف سے کام نہیں لیتے تھے۔ چاہے سامنے والے کو اچھا لگے یا برا، وہ اپنے دل کی بات کہہ دیا کرتے تھے۔ ایک مشہور ڈائریکٹر تھے۔ ان کی ایک فلم بہت کامیاب ہوئی اور ڈائریکشن کے لیے فلم فیئر ایوارڈ ملا۔ کچھ دن بعد معلوم ہوا کہ اپنی اگلی فلم وہ خود ہی لکھ رہے ہیں تو ابرار صاحب سے رہا نہ گیا۔ ایک پارٹی میں ملاقات ہوئی تو ڈائریکٹر صاحب کے کندھے پہ ہاتھ رکھا اور بڑے پیار سے بولے: "یہ لوہے کی گڑیا بھی عجیب چیز ہے۔ سنا ہے، جسے ملتی ہے وہ رائٹر بھی بن جاتا ہے۔" ڈائریکٹر صاحب پر جو گزری ہوگی اس کا اندازہ کیا جاسکتا ہے، مگر اس کا فائدہ یہ ہوا کہ انھوں نے فلم لکھنے کا ارادہ ترک کردیا۔ ایسا ہی ایک مزے دار قصہ اور بھی یاد آتا ہے۔ ایک دن میں اور ابرار صاحب کسی بحث میں الجھے ہوئے تھے کہ ان کے ایک رشتے دار آگئے۔ ابرار صاحب نے فائل بند کیا اور بہت دیر تک عزیزوں رشتے داروں کی خیر و عافیت معلوم کرتے رہے۔ جب کافی دیر ہوگئی اور یہ سمجھ میں نہیں آیا کہ ان حضرت کی آمد کی وجہ کیا تھی تو رہا نہ گیا۔ پوچھا: "اچھا میاں، یہ تو بتایئے کہ یہاں میرے پاس کس کام سے آنا ہوا؟" وہ صاحب مسکرائے اور کہنے لگے: "جی کام وام تو کچھ نہیں۔ جوہو آیا تھا، سوچا آپ کو بھی دیکھتا چلوں۔" ابرار صاحب اپنے وقت کی بربادی پر بھنا کر بولے: "میاں، میں کوئی قطب مینار ہوں کہ دلی آیا تھا، دیکھتا چلوں؟ اگلی دفعہ کوئی کام ہو تبھی آیئے گا۔"

ان کا بے باک اور بے لاگ ہونا کبھی کبھی خطرناک صورت حال بھی پیدا کردیتا تھا۔ جب جانکی کٹیر کا بنگلہ چھوڑ کر اوشیوارہ اندھیری میں رہنے آئے تو پاس ہی میں ملت نگر تھا جس کی مسجد میں کچھ جوشیلے مسلمانوں نے ایسے لاؤڈ اسپیکر لگا رکھے تھے کہ اذان کے وقت ملت نگر تو چھوڑیے، آس پاس کا علاقہ بھی تھرا اٹھتا تھا۔ ابرار صاحب نے ٹرسٹی صاحبان کو سمجھانے کی کوشش کی تو وہ سمجھنا تو دور کی بات ہے، سننے کے لیے بھی تیار نہیں ہوئے۔ ابرار صاحب سیدھے پولیس اسٹیشن پہنچے اور کمپلینٹ لکھوائی کہ شہر میں جتنی اونچی آواز کی اجازت ہے یہ اذان اس سے کہیں زیادہ ہے۔ پولیس مسجد پہنچی اور لاؤڈ اسپیکر کی اونچی آواز مدھم کردی گئی۔ کچھ دن میں لوگوں کو معلوم ہوگیا کہ شکایت کس نے کی تھی، اس لیے ایک جمعے کو جب ابرار صاحب نماز پڑھ کے نکلے تو بہت سے لڑکوں نے گھیر لیا۔ ایک نے کڑک کے کہا: "ارے تو کیسا مسلمان ہے، اذان کے خلاف پولیس میں شکایت کرتا ہے؟"

ابرار صاحب نے اس کا اٹھا ہوا ہاتھ پکڑ لیا اور اس سے اونچی آواز میں گرجے: "جاہلو، شکر کرو

Scanned with CamScanner

کہ شکایت ایک مسلمان نے کی تھی۔ کوئی ہندو کرتا تو فسادہو جاتا۔ چلو جاؤ، اپنا کام کرو۔" اس دن سے آج تک اذان کی آواز اتنی ہی بلند ہے جتنی ہونی چاہیے۔

وقت اور حالات نے ابرار صاحب کی ظرافت کو طنز اور تعریض میں اور پھر بدمزاجی میں تبدیل کر دیا تھا۔ جب ان کے پاس فلمیں نہیں رہیں تو سیریل لکھنے لگے۔ ہندوستانی سیریلز کے گھٹیا اور غیر معیاری ہونے کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ ڈائریکٹر سے لے کر چینل کا چپراسی تک یہ سمجھتا ہے کہ اس کی انگلیاں دیکھنے والوں کی نبض پر رکھی ہوئی ہیں۔ نتیجے میں لکھنے والوں کے سامنے ایسے ایسے مشورے تک آتے ہیں کہ عقل کا منھ کھلا رہ جاتا ہے۔ ابرار صاحب بہت دن تک 'دخل در معقولات' کو برداشت کرتے رہے، مگر ایک دن پیمانہ چھلک ہی گیا۔ سیریل کے اسسٹنٹ ڈائریکٹر کا فون آیا اور اس نے اسکرپٹ میں کسی تبدیلی کی درخواست کی۔ ابرار صاحب نے بڑے اطمینان سے اس کی بات سنی اور پھر بہت پیار سے بولے۔ "اپنے جاہل ڈائریکٹر سے کہہ دینا، میں اس کا سیریل نہیں لکھ رہا ہوں۔" اور فون بند کر دیا۔ مجھ تک خبر پہنچی تو حسبِ معمول سمجھانے کی کوشش کی۔ "ارے ابرار صاحب! آپ نے دنیا کو سنوارنے کا ٹھیکہ لیا ہے کیا؟ اگر کچھ لوگ اپنی جہالت میں خوش ہیں تو رہنے دیجیے۔ وہ جو کہتے ہیں، کر دیجیے۔ عذاب ثواب ان کے سر۔" فرمایا۔ "ضرور کر دیتا میاں، مگر ہر ایپی سوڈ میں میرا نام بھی آتا ہے۔ میں اپنے نام کو کیا جواب دوں گا؟"

18 نومبر 2009 کی رات کو دس بجے انور کا فون آیا۔ "ابا چلے گئے، جاوید صاحب..."

میں اسی وقت ان کے گھر پہنچا، مگر کمرے کے اندر نہیں گیا بلکہ باہر ہی بیٹھ گیا۔ میری ایک بری یا اچھی عادت یہ ہے کہ میں مرنے والوں کا چہرہ نہیں دیکھتا، تاکہ وہ جب بھی تصور میں آئیں، زندگی کے ساتھ آئیں۔ ابرار صاحب کے سٹنگ روم میں بیٹھے بیٹھے میں انھیں یاد کرتا رہا اور میری نظریں گرودت کی تصویر پر رک گئیں جو ایک سائیڈ ٹیبل پہ رکھی ہوئی تھی۔ کتنی مماثلت تھی ابرار علوی اور گرودت کی زندگی میں۔ دونوں نے اپنا عروج دیکھا اور زوال بھی۔ دونوں کو اپنی ذاتی زندگی میں کبھی سکون نہیں مل سکا۔ دونوں زندگی کے ریگستان میں چھاؤں ڈھونڈتے ڈھونڈتے تھک گئے تو ہار کر بیٹھ گئے۔ ایک نے اپنی ہار دسمبر 1964 میں قبول کی تھی اور دوسرے نے نومبر 2009 میں۔ میں بہت دیر تک ان ہارے ہوئے بہادروں کے بارے میں سوچتا رہا، مگر سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کس سے

ہارے تھے: وقت سے یا خود سے۔

دوسرے دن صبح اوشیوارہ کے قبرستان میں دفن کر دیا گیا۔ جنازے میں صرف نو آدمی تھے، اور اگر ان کے تین بیٹوں کو بھی شامل کر لیا جائے تو بارہ۔ یہ اس آدمی کا آخری سفر تھا جس کے ایک ایک لفظ پر لاکھوں ہاتھ تالیاں بجانے کے لیے اٹھ جایا کرتے تھے۔ اس دن فاتحہ کے لیے بھی کوئی ہاتھ اٹھانے والا نہیں تھا۔ افسوس۔۔۔

برسوں تکی رہیں ہیں جب مہر و مہ کی آنکھیں
تب کوئی ہم سا صاحب، صاحب نظر بنے ہے

❁❁

Scanned with CamScanner

ممّا اور بجیا

سر پر ہوائے ظلم چلے، سو جتن کے ساتھ
اپنی کلاہ کج ہے اسی بانکپن کے ساتھ

مجھے یقین ہے کہ مجروح سلطانپوری شمو ممّا یا بجیا جیسی کسی ہستی سے ضرور ملے ہوں گے ورنہ اس تیور کا شعر نہیں کہہ سکتے تھے۔

شمو ممّا اور بجیا میری دادی کے سگے بہن بھائی تھے مگر عمر میں دونوں ہی میرے والد سے چھوٹے تھے، اس لیے دادا اور دادی والا رشتہ تو قائم نہیں ہو سکا۔ شمشاد علی چونکہ جگت ممّا تھے اس لیے میرے لیے بھی ہمیشہ شمو ممّا ہی رہے۔ زیتون بیگم کا بھی کچھ ایسا ہی حال تھا۔ سب انھیں بجیا کہتے تھے اس لیے میں کوئی الگ رشتہ کیوں جوڑتا۔

دونوں بہن بھائی اپنے پرانے آبائی مکان میں بڑی شان سے رہتے تھے۔

کچھ لوگ غریبی کو اس طرح جیتے ہیں کہ دولت بیچاری شرمندہ ہو کر دور سے ہی دیکھتی رہ جاتی ہے۔ شمو ممّا بھی ایسی ہی ایک ہستی تھے۔ رسول اللہؐ کی حدیث ''الفقر فخری'' (فقیری میرا فخر ہے) پر ایسا زوردار عمل شاید ہی کسی نے کیا ہو۔

شمو ممّا اپنی چھ بہنوں کی تئیس اولادوں کے ماموں تھے۔ بھانجوں کے دوست اور بھانجیوں کی سہیلیاں بھی اسی رشتے کو مانتے تھے۔ اب اگر اتنے بہت سے ماموں کہنے والے ہوں تو شمشاد ممّا کا جگت ممّا ہو جانا ایک قدرتی عمل ہے اور اس میں کسی بندہ بشر کی کوئی شرارت شامل نہیں۔ اور تو اور، ممّا کے بھانجے بھانجیوں کی اولادیں یعنی ہم لوگ بھی ممّا ہی کہنے لگے۔

شمو ممّا چھوٹے سے پتلے دبلے، نازک سے آدمی تھے۔ جب ہم نے دیکھا تو سر کے بال

Scanned with CamScanner

اڑ چکے تھے اور بقول ان کے ''اس فارغ البالی کی وجہ سے وضو کرتے وقت یہ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ منھ کہاں تک دھونا ہے؟'' جسم پر ایک پرانی شیروانی، جو گرمیوں میں کریم کلر کی ہوتی تھی اور سردیوں میں ڈارک براؤن ہو جاتی تھی۔ اونچی مہری کا علی گڑھ پاجامہ، پاؤں میں سلیم شاہی یا باٹا کے سینڈل۔ پھرتیلے آدمی تھے۔ چلتے تھے تو معلوم ہوتا تھا لپک رہے ہیں۔ کسی کے گھر جائیں گے تو اس طرح جیسے کرنٹ پیچھے لگا ہو۔ بولتے بولتے اندر آئے، چلتے چلتے بات کی اور غائب ہو گئے۔ سننے والے ''ممتا... ممتا... ارے شمو... ارے شمشاد'' کر کے رہ گئے۔

اب بجیا کا حال سنیے۔ تحصیلدار امتیاز علی خاں کے گھر میں جب نویں اولاد ہوئی تو سب کی چیخیں نکل گئیں۔ چار خوبصورت بیٹوں اور چار حسین بیٹیوں کو پیدا کرنے والی رقیہ بیگم نے خدا جانے کس چیز کو جنم دیا تھا۔ کہنے کو تو وہ لڑکی تھی، مگر کیا لڑکی تھی، اللہ توبہ! بڑا سا سر، کالا رنگ، کمر میں کُب، پتلے پتلے ہاتھ اور ٹانگوں کی جگہ دو سوکھی ہوئی ٹیڑھی ٹہنیوں جیسی ٹانگیں۔ ایک پیر کا تو پنجہ بھی گھوما ہوا تھا۔ اسے دیکھ کر ایسا لگتا تھا جیسے اللہ میاں نے کسی ادھوری جلیبی کے سر لگا دیا ہو۔

کسی دوسرے کی اولاد ہوتی تو چڑیل، بھوتنی، چھلاوہ پیری نہ جانے کیا کیا کہا جاتا اور خدا جانے کیا سلوک کیا جاتا۔ شاید کہیں پھنکوا دی جاتی یا ٹینٹوا دبا کے ختم کر دی جاتی۔ مگر رقیہ بیگم جیسی نیک بیوی نے آنکھوں میں آنسو بھر کے اللہ کا شکر ادا کیا۔ ''وہ مالک ہے، جانوروں کو انسان بنا سکتا ہے اور انسان کے پیٹ سے جانور پیدا کر سکتا ہے۔''

نام زیتون رکھا گیا۔ زیتون کی شاخ صلح اور امن کا نشان ہوتی ہے، مگر زیتون...

سنا ہے، بچپن میں بھی تیز مرچ تھیں۔ سیدھی تو ہو نہیں سکتی تھیں مگر دو ہاتھ اور ایک پیر کے سہارے لنگڑی بلی کی طرح اچھل اچھل کر ہر جگہ پہنچ جاتی تھیں۔ ہر کھیل میں حصہ لینا چاہتی تھیں اور جب ان کی مجبوری کی وجہ سے نہ کھلایا جاتا تو زبان سے زہر کی ایسی بارش ہوتی کہ جو سنتا اس کے کان میں چھالے پڑ جاتے۔

میں نے جب سے ہوش سنبھالا، بجیا شمو کے ساتھ ہی رہتی تھیں۔ گھر کے بیچ میں ایک اینٹ کی پتلی سی دیوار کھڑی کر دی گئی تھی جس کے دونوں طرف سے جانے آنے کا راستہ تھا۔ اوپر سے جھانکا بھی جا سکتا تھا اور چھلانگ بھی لگائی جا سکتی تھی۔ خدا جانے اس دیوار کا مقصد کیا تھا۔ اس کے

Scanned with CamScanner

ایک طرف ممّو ممّا کی حکومت، دوسری طرف بجیا کا علاقہ تھا۔ بجیا کے حصے کو گھر کہنا ذرا زیادتی ہوگی، لکڑی کے دروں پر کھڑی ایک نیچی سی کھپریل تھی جس کے آخر میں ایک چھوٹی سی کوٹھری تھی، جو بجیا کا گودام تھا۔ ساری دنیا کا الم غلم اس میں بھرا رہتا تھا۔ بجیا خود دیوار سے لگے ایک پلنگ پر براجمان رہتیں۔ پلنگ کے پیچھے ایک میز جیسی تھی جس پر ان کے برتن، چائے کا سامان رکھا رہتا۔ میز کے نیچے کچھ ڈبے تھے، جہاں آٹا، چاول، دال اور مسالوں کا اسٹاک رہتا۔

پلنگ کے دوسری طرف ایک اونچی سی انگیٹھی رکھی رہتی، جس پر وہ پلنگ پر بیٹھے بیٹھے کھانا بنایا کرتی تھیں۔ ایک چھوٹا سا صحن تھا جس کے دو پیڑ میں کبھی نہیں بھولتا۔ ایک بہت خوبصورت پام ٹری جس کے پتے اس طرح پھیلے رہتے تھے جیسے مور نے دم پھیلا دی ہو، اور ایک ان کی بیری، بیر بڑے بڑے میٹھے قلمی بیروں سے لدی ہوئی۔ پکے تو چھوڑیے، اس کے کچے بیر بھی میٹھے ہوتے تھے۔

پام کے پاس ایک چبوترا تھا جس کے کونے پر بیٹھ کر ممّا وضو کرتے اور پھر اسی چبوترے پر نماز پڑھتے۔ یہی چبوترا ان بچیوں کے کام بھی آتا جو بجیا سے قرآن شریف پڑھنے آتی تھیں۔ بجیا نے اس بات کو کبھی تسلیم نہیں کیا کہ وہ اپاہج ہیں۔ پاؤں نہیں ہیں نہ سہی، ہاتھ تو ہیں۔

بجیا سلائی میں ماہر تھیں۔ کپڑے تو ایسے سیتی تھیں کہ جو ایک بار پہن لے، پھر کبھی کسی دوسرے کے ہاتھ کا سلا نہ پہنے۔ ترپائی ایسی ہوتی تھی کہ کھونپ دکھائی ہی نہیں دیتی تھی۔ چکن کا کام، آری، شیڈو ورک، اپلیک ورک، اور خدا جانے کیا کیا۔ ان کا کام اتنا مشہور ہو گیا تھا کہ لوگ دیکھتے ہی پہچان لیا کرتے تھے: ''یہ تو زیتون کے ہاتھ کا سلا کرتا ہے۔''

وہ کافی مہنگی بھی تھیں۔ جب کرتے کی سلائی چودہ آنے یا ایک روپیہ تھی، بجیا ڈھائی روپے اور تین روپے لیا کرتی تھیں۔

صبح سویرے ان کے گھر جایئے تو دیکھنے کا منظر ہوتا تھا۔ بجیا اپنا پلنگ آدھا دالان میں، آدھا صحن میں کر کے اس طرح بیٹھی ہوتی تھیں کہ روشنی تو آئے مگر دھوپ نہ آئے۔ پلنگ کے پاس رکھی انگیٹھی پر چڑھی پتیلی، جسے وہ چلاتی بھی جاتی تھیں اور سلائی بھی کرتی جاتی تھیں۔ آنکھیں کرتے پر اور کان بچیوں کی آوازوں پر۔ جہاں تک مجھے یاد ہے وہ حافظ قرآن نہیں تھیں، مگر کسی لڑکی نے غلطی کی نہیں کہ بجیا گرجیں: ''کیا بولی؟'' اور بچی سہم کر صحیح پڑھنے لگی یا بجیا نے صحیح لفظ بتا دیا۔

Scanned with CamScanner

ممّن نے کہاں تک پڑھا تھا، معلوم نہیں۔ شاید ایف اے پاس کیا تھا یا میٹرک تھے، مگر اردو، فارسی اور انگلش پر عبور تھا۔ باقی سارے مضامین بھی آسانی سے پڑھ لیا کرتے تھے۔ ان کے دروازے کے باہر ایک گلی تھی، جس میں کرسیاں لگ جاتی تھیں۔ سردیوں کی ٹھٹھری ہوئی بھاپ اڑتی ہوئی صبحیں، شامیں اور چادریں لپیٹے اسٹوڈنٹس اور بیچ میں ممّن۔ مجھے آج تک یاد ہے۔

ہم میں سے کسی بچے کو پڑھتے دیکھتے تو رک جاتے۔ ''کیا پڑھ رہے ہو؟''

ہم بتا دیتے۔

اگر ہم میں سے کسی کو کوئی پرابلم ہوتا تو وہ کھڑے کھڑے ایک پاؤں چارپائی کی پٹی پر رکھتے، گردن لمبی کر کے کتاب میں جھانکتے اور شروع ہو جاتے۔ ایسا لگتا تھا جیسے رٹ کے آئے ہوں۔ کبھی کبھار تو لگتا تھا کہ چلتی پھرتی انسائیکلوپیڈیا ہیں، ننھی منی پاکٹ سائز انسائیکلوپیڈیا۔

ممّن کی ایک عجیب عادت تھی۔ جب بازار جاتے ہوتے تھے تو راستے کے دو چار گھروں میں ضرور جھانک لیتے۔ ''بڑی آپا، بازار سے کچھ منگوانا ہے؟''

''ارے بچے، جیتے رہو! ایک پاؤ بھر شلجم لیتا آئیو۔ رات کو شلجم گوشت بناؤں گی۔'' اور ممّن غائب۔ ''ارے پیسے تو لیتا جا... ممّو... ممّو...''

دور سے کہیں آواز سنائی دیتی: ''بعد میں... بعد میں...''

کبھی وہ دھڑ دھڑاتے ہوئے داخل ہوتے۔ ''بڑی آپا، کیا پک رہا ہے تمھارے یہاں؟''

''مولی کی بھجیا ہے... کھاؤ گے؟''

''لاؤ، دے دو۔''

''روٹی بھی گرم ہے... یہیں بیٹھ کر کھا لو نا۔''

''نہیں تمھاری روٹی ووٹی نہیں چاہیے، ہمارے پاس رات کی دو چپاتیاں رکھی ہیں۔''

''ارے دو چپاتیوں سے کیا ہوگا... یہ لے، اور دو رکھ لے۔''

''بالکل نہیں، بالکل نہیں، بچ کے جائے گی۔ بس مولی کی بھاجی دے دو۔'' اور ممّن یہ گئے وہ گئے۔

بجیا کا پلنگ اس کا بیڈ روم بھی تھا، ڈرائنگ روم بھی، باورچی خانہ بھی اور کارخانہ بھی۔ پلنگ کیا

Scanned with CamScanner

تھا، عمرو عیار کی زنبیل تھی۔ تکیے کے ایک طرف ان کا پنج سورہ اور تسبیح، دوسری طرف ان کا بٹوا۔ کھلے پیسے تکیے کے نیچے، دری کے نیچے کچھ کتابیں، کچھ کاغذ، ایک پرانی کاپی جس پر وہ اپنا حساب کتاب لکھا کرتی تھیں، کاپی کے اندر رکھا ہوا ایک موٹا سا قلم، پیروں کے پاس بید کی ایک پٹاری اور اس کے پاس ایک چھوٹا سا قلعی اترا ہوا نقشین پاندان۔ بجیا کے پان کی شہرت دور دور تک تھی۔ جہاں تک مجھے یاد ہے وہ خود کبھی کسی کو پان آفر نہیں کرتی تھیں، مگر کوئی منہ چڑھا مانگ بیٹھے تو انکار بھی نہیں کرتی تھیں۔

''بجیا، پان کھلاؤ۔''

''چلو ہوا کھاؤ، پان بہت مہنگے ہو گئے ہیں۔''

''اب کھلا بھی دو بجیا۔ گھر آئے مہمان کو ایک پان کی کتر بھی نصیب نہ ہو تو دنیا کیا کہے؟''

''چلے آتے ہیں نامراد منہ اٹھائے ہوئے، جیسے ان کے باپ پان کی ڈھولی بھجوا گئے ہوں۔''

بجیا ایک جھٹکے سے ادھ سلا کرتا ایک طرف ہٹاتیں، پاندان اپنی طرف کھسکاتیں۔ گیلے کپڑے میں رکھا ہوا ایک پان نکالتیں۔ بڑے سے پان کی نوک اور دم نوچ کر پھینکتیں۔ پھر اس کے چار برابر کے ٹکڑے کرتیں اور دو ٹکڑوں پہ کتھا چونا لگا کر اس میں دو دانے سپاری کے اور دو دانے الائچی کے ڈالتیں۔ پتلی پتلی لمبی انگلی پہ لپیٹ کے ایک چھوٹی سی گلوری بنا کے اپنی داڑھ میں ڈالتیں اور دوسری گلوری مانگنے والے کو پیش کر دیتیں۔ نیچے جھک کر بالٹی میں رکھے پانی میں اپنی انگلیاں دھوتیں اور پھر پتلی سلائی میں لگ جاتیں۔ انچ بھر کی گلوری منٹ دو منٹ میں گھل جاتی مگر عجیب مزہ تھا اس پان میں کہ آج بھی آنکھیں بند کرو تو ذائقہ زبان پر آ جاتا ہے۔

ممّا خود بہت کم ہنستے تھے، مگر ہنساتے بہت تھے۔ لطیفے سنانا، One Liner مارنا تو ہر روز کا کام تھا۔ پریکٹیکل چٹکلے بھی چھوڑتے رہتے تھے۔ ممّا کے گھر میں کافی مرغیاں تھیں۔ تھیں تو وہ شاید زیتون باجی کی، مگر ممّا بھی ان کا کافی لاڈ کرتے تھے۔ سب کے نام تھے، اور ممّا ہر مرغی کو اس کے نام سے مخاطب کرتے تھے۔ اور نام تو یاد نہیں، مگر ایک مرغا اور اس کا نام یاد ہے۔ بڑا خوبصورت مرغا تھا۔ سر پر اونچی لال کلغی، گردن پہ ہرے سرخ چمکتے ہوئے پر اور زمین پہ لٹکتی ہوئی دم۔ ممّا نے اس کا نام مرزا بیدار بخت رکھا تھا، کیونکہ سب سے پہلے وہی اٹھتا تھا اور بانگ دے کر سب کو اٹھایا کرتا تھا۔ اپنے ہاتھوں سے مرغیوں کی ڈھابلی بنائی تھی۔ خود اینٹ رکھ کے دیواریں اٹھائی تھیں، بانس، پھوس

Scanned with CamScanner

اور ٹھیکریاں رکھ کے کھپریل ڈالی تھی اور اس میں لکڑی کا دروازہ لگایا تھا۔ ہوا جانے کے لیے دیواروں میں سوراخ بھی چھوڑ دیے گئے تھے۔ ڈھابلی اتنی مضبوط تھی کہ گرمی، سردی، برسات ہر موسم جھیل لیتی تھی۔ بلی بھی حسرت سے دیکھتی تھی اور چلی جاتی تھی۔

ایک دن کہیں سے گیرو لے آئے۔ اسے پانی میں گھولا۔ بانس کے ایک پتلے سے ٹکڑے کا ایک سرا اتنا کوٹا گیا کہ بانس کا ایک ایک ریشہ الگ ہو گیا۔ یہ بن گیا برش۔ ممتا نے ڈھابلی کے اوپر بڑے بڑے حروف میں پینٹ کیا: "مرغ منزل۔" جس نے بھی اس مرغ منزل کو دیکھا، اپنی ہنسی نہیں روک سکا۔ وجہ پوچھنے پر ممتا نے بہت سنجیدگی سے بتایا: "کم بختوں کو جب بھی بند کرو، ادھر ادھر بھاگ نکلتی ہیں۔ اب سیدھی اپنے گھر جائیں گی۔ پہچاننے میں دشواری نہیں ہوگی۔"

ایک زمانے تک ممتا کے پاس کوئی کام نہیں تھا۔ لڑکے پڑھنے آتے تھے، مگر وہ کیا دیتے ہوں گے اور ممتا کیا لیتے ہوں گے؟ کرتے کے رفو اور شیروانی کے پھٹے کالر سے پتا چلتا تھا کہ کیا گزر رہی ہے، مگر ممتا کے تیور سے اندازہ کرنا محال تھا۔ انھوں نے کبھی کسی سے کسی قسم کی مدد نہیں لی، اور اگر کسی عزیز رشتے دار نے ہمدردی دکھانے کی کوشش کی تو ممتا نے ایسے آڑے ہاتھوں لیا کہ لینے کے دینے پڑ گئے۔

ایک قصہ مجھے یاد ہے۔ ممتا اپنے کمرے میں لیٹے کھڑکی سے آتی ہوئی روشنی میں کتاب پڑھ رہے تھے۔ مجھے دیکھا تو کتاب بند کر دی۔ "آؤ میاں، بیٹھو... پانی پینا ہے تو گھڑا سامنے ہے، پی لو... ذرا سا مجھے بھی دینا۔"

"یہ تو چائے کا وقت ہے ممتا۔"

"ہاں، ہے تو۔"

"میں بناؤں آپ کے لیے چائے؟"

"نہیں بھائی، میں یہ خطرہ نہیں مول لے سکتا۔"

"ارے، میں بہت اچھی چائے بناتا ہوں ممتا!"

"لگتا ہے، تمھارا دل چائے کو چاہ رہا ہے؟"

"جی۔"

Scanned with CamScanner

ممّا اٹھے۔ کھونٹی پر لٹکی شیروانی کی جیب میں ہاتھ ڈال کر کچھ ڈھونڈتے رہے، پھر بولے، ''یہ لو اکنی۔۔۔ دودھ لے آؤ۔''

''اکنی کا دودھ؟ اتنا سا ہوگا۔''

''بھئی اس گھر کا کل سرمایہ یہ اکنی ہے۔۔۔ بچانا چاہتے ہو تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ لیکن چائے ہم نے بھی نہیں پی ہے۔ اس لیے تم دودھ لے ہی آؤ۔ اور زیتون سے مانگیں گے نہیں، ان کا موڈ بہت خراب ہے۔''

بجیا کا موڈ ایسا ہی تھا، موسم کے ساتھ بدل جاتا تھا۔ اور کب کیا موسم ہوگا یہ تو ماہرین بھی نہیں بتا سکتے۔ ان کے لکڑی کے پرانے دروازے پر گھنٹی وَنٹی تو تھی نہیں۔ یا تو زور سے ہاتھ ماریے یا پھر آواز لگایئے۔ دروازہ عام طور پر کھلا ہی رہتا تھا، مگر اس کے سامنے لکڑی کا ایک اوٹا سا کھڑا کر دیا گیا تھا تاکہ بے پردگی نہ ہو۔ کھٹ ہوئی نہیں کہ بجیا کی آواز آئی:

''کون؟''

''جی میں۔۔۔''

بجیا نے جیسے ہی آواز پہچانی، لہجہ بدل گیا۔

''ارے آؤ آؤ، حرامی پلے۔۔۔ خدا تمھیں غارت کرے، کہاں مر گئے تھے اتنے دن سے؟ ۔۔۔ اب کھڑے کیا ہو؟ اپنا جنازہ ادھر لاؤ۔''

بجیا کا بات کرنے کا یہ انداز یونیک تھا اور اس پر بجیا کا کاپی رائٹ تھا۔ میں نے کسی کو اس طرح اتنے پیار سے گالی کوسنے دیتے کبھی نہیں سنا۔ ان کے منھ سے برا بھی بھلا لگتا تھا۔ باجی اپنے ہاتھ پھیلا دیتیں اور گلے لگا لیتیں۔

زیتون باجی کے چار بھائی اور پانچ بہنیں تھیں۔ سب سے بڑی بہن میری دادی مرتضائی بیگم، جو مدارالمہام سردار ڈیوڑھی حافظ احمد علی خان شوق کی بہو تھیں۔ تیسری فیاضی بیگم جو کپتان واجد علی خاں کی بیگم تھیں اور آخر وقت تک سارے خاندان میں سب سے زیادہ مقبول اور سب سے زیادہ مالدار گنی جاتی رہیں۔ بھائیوں میں صدیق صاحب سب سے بڑے تھے اور بہت بڑے آدمی تھے۔ ایک زمانے میں ریاست کے ہوم سیکرٹری بھی ہو گئے تھے۔ رام پور میں الیکٹریسٹی لانے کا سہرا انھی

Scanned with CamScanner

کے سر ہے۔ پہلا بجلی گھر بھی انھوں نے ہی بنوایا تھا اور شہر کے باہر ان کی شاندار کوٹھی اور آم کا باغ ہزاروں گز پر پھیلے ہوئے تھے۔ باقی بھائی بہن بھی کھاتے پیتے لوگ تھے۔ سب کے اپنے گھر، اپنی جائدادیں اور اپنی دنیا ئیں تھیں۔

اس تفصیل میں جانے کا مقصد یہ ہے کہ بجیا اگر چاہتیں تو ڈھائی روپے میں کپڑے سیے بغیر بھی آرام سے رہ سکتی تھیں۔ مگر ان کی زبان جتنی لمبی تھی، اس سے زیادہ لمبی ان کی ناک تھی۔ کسی کا احسان لینا تو بہت دور کی بات ہے، کوئی ہمدردی بھی کرے تو بخیے ادھیڑ ڈالتی تھیں۔ بہت ناپ تول کے بات کرنی پڑتی تھی۔ کیا پتا کون سا لفظ طبع نازک پر گراں گزر جائے، اس لیے بہت کم لوگوں سے بنتی تھی۔ اگر کسی سے کسی حد تک بنتی تھی تو ممتا سے، مگر بجیا ان کا احسان لینا بھی پسند نہیں کرتی تھیں۔ گھر کے سارے خرچ کا حساب رکھتی تھیں اور مہینے کے آخر میں مما کو بتا دیا کرتی تھیں کہ کس نے کتنا خرچ کیا تاکہ حساب صاف رہے۔

ممتا اور بجیا اوپر تلے کے بھائی بہن تھے، اس لیے دوسروں کے مقابلے میں لگاؤ کچھ زیادہ ہی تھا۔ دونوں کی عادتیں بھی ایک جیسی تھیں اور تیور بھی۔ دونوں کے حالات خراب تھے مگر اپنی غریبی پر شرمندہ نہیں تھے۔ ایک عجیب سا غرور تھا دونوں کے اندر: شاید یہی غرور ان دونوں کو آپس میں باندھے ہوئے تھا۔

ایک دفعہ ایسا ہوا کہ ممتا کو گورنمنٹ کاٹیج انڈسٹریز میں نوکری مل گئی۔ برسوں کے بعد تھوڑی سی خوشحالی کا منھ دکھائی دیا تو سب ہی خوش ہو گئے۔ پھر ایک دن پتا چلا کہ انھوں نے نوکری سے استعفیٰ دے دیا۔ وجہ یہ تھی کہ کسی بات پر اطافت بچیا سے، جو کاٹیج انڈسٹریز کے سپرنٹنڈنٹ تھے اور جنھوں نے ممتا کو نوکری دلائی تھی، ناراضگی ہو گئی تھی۔ اب جس سے بات چیت بند ہو جائے، اس کے احکامات سننے کا تو سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ اس لیے خدا حافظ!

مما کا ایک مزے دار قصہ اور بھی ہے جو ان کے انوکھے کردار کی عکاسی کرتا ہے۔ ممتا کے گھر کے سامنے سڑک پار کر کے جو مکان تھا، وہ لمبی استانی کا گھر کہلاتا تھا، کیونکہ اس میں ایک پتلی دبلی، لمبی جٹنگے والی استانی رہا کرتی تھیں۔ دور سے دیکھنے پر ایسی لگتی تھیں جیسے بند چھتری چلی آ رہی ہو۔

ایک دن استانی جی سب سے مل کر رخصت ہو گئیں۔ پتا چلا کہ انھوں نے گھر پاکستان سے آئی

Scanned with CamScanner

ہوئی ایک فیملی کو دے دیا ہے۔ ہم سب بچے جھانک جھانک کر دیکھا کرتے تھے، کیونکہ ہم نے اس سے پہلے بڑی بڑی شلواروں والے مرد نہیں دیکھے تھے۔

شرنارتھیوں کے اس خاندان میں میری عمر کے دو لڑکے بھی تھے، ہریش اور رمیش۔ ان لوگوں نے گھر تو لے لیا تھا مسلم محلے میں مگر مسلمانوں سے بچ کر ہی رہتے تھے۔ نہ سلام نہ دعا۔ قریب قریب سبھی لوگ اپنے کاموں پر نکل جاتے اور شام کو ان کی موجودگی کا پتا اس طرح چلتا جب تکیجے اندھیرے میں آرتی سنائی دیتی:

''اوم جے جگدیش ہرے / بھکت جنوں کے سنکٹ / اشنو میں دور کرے۔''

اب بچے تو بچے ہی ہوتے ہیں، ہماری دوستی ہو گئی۔ ہریش کرکٹ بہت اچھی کھیلتا تھا، اور رمیش بالکل میری طرح تھا، یعنی کسی بھی کام میں ایکسپرٹ نہیں تھا۔ وہ پڑھائی میں بھی کافی کمزور تھا۔ ہریش کا داخلہ تو ہو گیا مگر رمیش ٹسٹ میں فیل ہو گیا۔ ممّا کو پتا لگا تو مجھ سے کہا، ''جاؤ، رمیش کو بلا کے لاؤ۔'' پہلے تو وہ بہت ڈرا، پھر سمجھانے بجھانے پر آیا تو سہا ہوا۔ ممّا نے کہا: ''کل سویرے اپنی ساری کتابیں لے کر آجانا۔ میں دیکھتا ہوں اسکول والے تمھیں داخلہ کیسے نہیں دیتے۔ میں تمھیں پڑھاؤں گا۔''

ہم سمجھے، ممّا جیسے دوسروں کو پڑھاتے ہیں ویسے اس کو بھی پڑھائیں گے، مگر وہ تو رمیش کے پیچھے ہی پڑ گئے۔ جب دیکھو، ممّا کے گھر میں آیا ہوا ہے۔ ممّا اپنا کام کر رہے ہیں، وضو کر رہے ہیں، نماز پڑھ رہے ہیں، مرغیوں کو دانہ ڈال رہے ہیں، مگر بیچ بیچ میں رمیش کی خیر خبر بھی لی جا رہی ہے۔ ایک دن صبح صبح ممّا رمیش کو لے کر غائب ہو گئے۔ جب دوپہر بعد لوٹے تو دونوں کے چہرے چمک رہے تھے۔ دروازے پہ پہنچ کے ممّا نے رمیش سے کہا، ''اب جاؤ، مگر شام کو خالی ہاتھ مت آنا۔ چوا‌ل کے ہاں سے بالوشاہی لے کر آنا۔''

شام کو میں نے دیکھا، ممّا کے گھر میں رمیش ہی نہیں، اس کا سارا خاندان جمع تھا۔ رمیش کی ماں کی آنکھوں میں آنسو تھے اور وہ اپنے ٹھیٹ پنجابی لہجے میں کہہ رہی تھی، ''یہ تو میٹو پتا ہی نہیں تھا، مسلمان ایسے بھی ہوتے ہیں۔''

رمیش کو داخلہ مل گیا تھا اور ممّا نے فیس بھر دی تھی۔

ممّا جب تک جیے اپنے ٹرمز (Terms) پر جیے۔ ان رشتے داروں نے جو پاکستان چلے

گئے تھے اور بہت اچھے حالات میں تھے، منا پر بہت زور ڈالا کہ پاکستان چلے چلیں، اتنے قابل آدمی کو نوکری اور سٹیزن شپ ملنے میں دیر نہیں لگے گی مگر منا کس کو کندھے پر ہاتھ رکھنے دیتے ہیں!

"بھئی سنا ہے تمھارے پاکستان میں سندھی بولنی پڑتی ہے؟"

"نہیں تو۔ کس نے کہا؟"

"اچھا، پنجابی پڑھنا تو لازمی ہے نا؟"

"ارے کس نے یہ بے تکی اڑا دی، تمھیں پتا ہی نہیں؟... ہمارے پاکستان میں ہم سب اردو بولتے ہیں۔"

"اردو؟ تو پھر جانے کی کیا ضرورت ہے؟ وہ تو ہم یہاں بھی بولتے ہیں۔"

ایسا ہی معاملہ شادی کا تھا۔

"ارے شمو! اللہ کے واسطے شادی کر لے بچے! کوئی دو روٹی سینک کے دینے والی تو ہو۔"

"میں تو کر لوں آپا... مگر گورنمنٹ نے قانون بنا دیا ہے... گنجوں کا شادی کرنا جرم ہے۔"

"ارے ہٹ! ایسا کوئی قانون وانون نہیں ہے۔"

"ہماری گورنمنٹ میں پہلے گنجوں کی شادی پر پابندی ہے۔ شادی ہوتے ہی بال اڑ جائیں تو کوئی حرج نہیں۔"

لیکن جاننے والے جانتے ہیں کہ وہ دراصل اس لیے وہاں رہے کہ اپنی پاگل بہن کو لاوارث نہیں چھوڑنا چاہتے تھے۔

جب ہمارا گھر بک رہا تھا تو منا دادی کے پاس آئے۔

"آپا! میرے گھر کی حالت تو تمھیں معلوم ہے۔ ابا میاں کی موت سے آج تک کبھی مرمت نہیں ہوئی۔ انھوں نے گارا چھوڑ دیا ہے۔ دیواریں بھی کبھی گر سکتی ہیں۔ مگر جب تک نہ گریں، تم اس میں رہ سکتی ہو۔"

میں جب بمبئی آ رہا تھا تو منا ملنے کو آئے۔

"چاندی کا ایک روپیہ ہے تمھارے پاس؟"

"ہاں ہے... کیوں؟"

Scanned with CamScanner

''ہماری طرف سے امام ضامن باندھ لو۔ بمبئی پہنچ کے کچھ کھالینا۔ تم بھی تو آدھے سید ہو، ثواب کہیں نہیں جائے گا۔''

شروع شروع میں انھوں نے کچھ خط بھی لکھے۔ صاف ستھری شفاف تحریر، موتیوں جیسے الفاظ، بے لوث، بے غرض محبت سے لبریز خط۔

ایک دن سنا کہ نمونیا ہوا۔ دو دن بیمار رہے، تیسرے دن چل دیے۔ وہ ہمیشہ جلدی میں رہتے تھے، اس لیے جلدی سے چلے بھی گئے۔

شادی کے بعد جب میں پہلی بار فریدہ اور دو سال کی لبنیٰ کو لے کر رامپور گیا تو بجیا سے ملنے ان کے گھر بھی گیا۔

میں نے آواز دی:

''بجیا!''

بجیا نے آواز فوراً پہچان لی اور وہیں سے چلائیں:

''ارے آؤ آؤ میرے حرامی پلّے! کہاں مرے ہوئے تھے اتنے دنوں سے؟ بمبئی میں تھے کہ کسی قبرستان میں؟ میں تو فاتحہ بھی پڑھ چکی تھی۔ ایک خط بھی نہیں بھیجا۔ ہاتھ ٹوٹ گئے تھے کیا؟''

فریدہ کا منھ حیرت سے کھل گیا۔ ''یہ کیسا استقبال ہے؟''

میں نے سمجھایا: ''یہ بجیا ہیں اور یہ انداز ان کا ٹریڈ مارک ہے۔ چلو سلام کرو۔''

بجیا ویسی کی ویسی ہی تھیں جیسی چھوڑ کر گیا تھا، بس کنپٹی کے بال کچھ زیادہ سفید ہو گئے تھے۔ بہو اور بچی سے مل کر بہت خوش ہوئیں۔ میں نے ایک لفافہ ڈرتے ڈرتے بڑھایا اور کہا، ''بجیا، ہم لوگ آپ کے لیے کوئی تحفہ نہ لا سکے۔ سمجھ ہی میں نہیں آیا کہ آپ کو کیا اچھا لگے گا، اس لیے...''

باجی نے سر ٹیڑھا کر کے لفافہ کھولا، اس میں رکھے نوٹ دیکھے اور فریدہ سے بولیں: ''دیکھو... دیکھو اس بے غیرت کو! دس سال کے بعد لوٹا ہے اور پانچ سو روپلّی تھما رہا ہے حرامی پلّا۔ ارے کم سے کم پانچ ہزار تو لایا ہوتا مردار!''

''وہ دن بھی آئے گا۔''

''جب وہ دن آئے تو تم بھی اپنا کالا منھ لے کر آجانا۔''

Scanned with CamScanner

انھوں نے لفافہ میرے اوپر پھینک دیا۔ اس دن بہت اچھے موڈ میں تھیں، شاید لبنیٰ کو دیکھ کر، اس لیے تھوڑی خوشامد پر راضی ہو گئیں اور لفافہ تکیے کے نیچے رکھ لیا۔

کچھ دن بعد جب ہم بمبئی واپس جانے والے تھے تو کھانے پر بلایا۔ بڑے پیار سے کھلایا اور چلتے وقت فریدہ کو جوڑا دیا اور لبنیٰ کے ہاتھ پر ایک لفافہ رکھ دیا۔ جب میں نے کھول کر دیکھا تو اس میں پانچ سو اکیاون روپے رکھے تھے۔

تو ایسے تھے ہمارے شمو ماما اور زیتون بجیا۔ خود مٹ گئے، مگر اپنے بانکپن اور کج کلاہی کے نشان دلوں پر چھوڑ گئے۔

پیدا کہاں ہیں ایسے پراگندہ طبع لوگ

ہارے ہوئے لشکر کا سپاہی

وہ سڑک جو بائیکلہ پل سے مجگاؤں کی طرف جاتی ہے اور موتی شالین کہلاتی ہے، اس وقت بھی ایسی ہی تھی جب اس کا نام "لولین" (Love-lane) ہوا کرتا تھا۔ کچرے کے ڈھیر، ٹوٹے فٹ پاتھ، بائیکلہ مارکیٹ میں سامان لانے والے ٹرک اور ہاتھ گاڑیوں کے قافلوں کے بیچ سے اپنی جان اور کپڑے بچا کر گزرتے ہوئے راہگیر۔

گلی کیا تھی، شور وغل کا ایک صحرا تھا جو دور تک پھیلا ہوا تھا، لیکن ہر صحرا کی طرح اس میں دو تین نخلستان بھی تھے۔ کونے میں کھڑا جین مندر، جو اپنے وقار، سادگی اور خاموشی کے ساتھ کسی دوسری دنیا کا علاقہ معلوم ہوتا تھا، اور اس کے آگے دائیں طرف تھا "خلافت ہاؤس"...

کہنے کو خلافت ہاؤس اب بھی ہے، مگر وہ نہیں ہے جو تھا۔

جس جگہ کبھی چھوٹی اینٹوں اور لکڑی کا بنا ہوا پرانی وضع کا ایک بہت ہی خوبصورت بنگلہ ہوا کرتا تھا، وہاں اب سیمنٹ کی ایک بدصورت عمارت کھڑی ہوئی ہے۔ ایک جامن کو چھوڑ کر باقی سارے درخت کہیں کوئلہ اور کہیں راکھ بن چکے ہیں۔ صحن کی وہ کچی مٹی جس پر جنگ آزادی کے عظیم سپہ سالاروں کے پیروں کے نشان ہوا کرتے تھے، اب ایک گندے میلے پتھر یلے فرش کے نیچے دفن کر دی گئی ہے۔ عبرت کا مقام ہے کہ اس مزار کو بھی توڑ دیا گیا ہے جو رئیس الاحرار مولانا محمد علی کی شریک حیات امجدی بیگم کا ہے۔ حد یہ ہے کہ اس پر لگی ہوئی پتھر کی تختی بھی نکال دی گئی ہے جس پر جنگ آزادی کی اس خاموش مجاہد کا نام کندہ تھا۔ آثار کہتے ہیں کہ ایک دن مزار کے نشان کو بھی یہ کہہ کر مٹی میں ملا دیا جائے گا کہ نہ جانے کس گمنام کی قبر ہے...

مٹے ناميوں کے نشاں کیسے کیسے

خلافت ہاؤس کے گیٹ پر، جس کا نام باب عمر ہے کھڑے ہو کر دیکھیے تو ماضی کی سیاہ دیوار میں نور کا ایک دریچہ سا کھلتا دکھائی دیتا ہے۔ کسی زمانے میں یہ خلافت ہاؤس تحریک خلافت کا مرکز تھا اور روزنامہ خلافت کا دفتر بھی۔ یہی وہ جگہ ہے جہاں سے ہندو مسلم یکجہتی کی وہ لہر اٹھی تھی جس کی مثال تاریخ کے کسی دور میں نہیں ملتی۔ یہی وہ مقام ہے جہاں سے مولانا محمد علی اور مولانا شوکت علی نے ملک کی آزادی میں ہندوستانی مسلمانوں کا کردار طے کیا۔ یہیں سے وہ اخبارات نکلے جنھوں نے ہندوستان کی سیاست اور صحافت میں انقلاب کی بنیاد رکھی۔

کبھی یہ جگہ اتنی بے رونق اور بے رنگ نہیں تھی۔ یہ پرانی محراب، جو کسی بے نور آنکھ کی طرح وقت کو بدلتے ہوئے دیکھتی رہی ہے، پہلے اتنی اداس نہیں تھی۔ اس کے اوپر ایک بڑا سا ہلالی پرچم لہرایا کرتا تھا جس پر سفید رنگ کا چاند تارا بنا ہوا ہوتا تھا، جو خلافت کا نشان تھا۔ جہاں اب لوہے کا گیٹ لگا ہے وہاں کسی وقت لکڑی کا پھاٹک ہوا کرتا تھا جس کے اوپر لوہے کے چھوٹے چھوٹے بھالوں کی قطار دکھائی دیتی تھی۔ پھاٹک سے اندر آتے ہی موگرے، رات کی رانی اور چمپا کی خوشبو بڑھ کے استقبال کرتی تھی۔ آم، جامن، امرود، کٹھل اور گل مہر کے بڑے بڑے سایہ دار درختوں سے پورا کمپاؤنڈ بھرا ہوا تھا۔ بنگلے کے اگلے حصے میں ایک برآمدہ جیسا تھا جس میں جانے کے لیے تین سیڑھیاں چڑھنی پڑتی تھیں۔ یہ برآمدہ لکڑی کے ستونوں پر ٹکا ہوا تھا جن پر کسی زمانے میں نقش و نگار کھدے ہوئے رہے ہوں گے مگر بار بار رنگ روغن ہونے سے بھر گئے تھے۔ اس کے اندر لکڑی کی جالی کے پیچھے جو کمرہ استقبالیہ تھا وہاں روزنامہ خلافت کے کاتب بیٹھا کرتے تھے۔ اس کے پیچھے ایک بہت بڑا ہال تھا جو روزنامہ خلافت کا دفتر تھا۔ اس میں چھ بڑی بڑی میزیں تھیں اور دیواروں سے لگی ہوئی کوئی درجن بھر الماریاں تھیں جن کے کونوں میں کاغذ ٹھنسے ہوئے تھے۔ دفتر کے پیچھے ایک اور بڑا سا ہال تھا جس میں ایک بہت بڑی سی ڈائننگ ٹیبل پڑی رہتی تھی۔ وہ ٹیبل اتنی بڑی تھی کہ اس پر پچیس تیس آدمی ایک ساتھ بیٹھ کر آسانی سے کھانا کھا سکتے تھے۔ بنگلے کے پچھلے حصے میں دو بڑے بڑے کمرے تھے اور ایک کوریڈور تھا جس کے دونوں طرف پاخانہ اور غسل خانہ بنے ہوئے تھے۔

ہال کے باہر لکڑی کا ایک زینہ تھا جو پہلی منزل پر پہنچاتا تھا۔ اوپر کا نقشہ تقریباً وہی تھا جیسا نیچے تھا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ برآمدے کی چھت پر سائبان نہیں تھا اور اس پر کھلی ہوا میں بیٹھنے کا بندوبست

Scanned with CamScanner

تھا۔ پہلی منزل کے ہال میں ایسی یادگار تصویریں لگی ہوئی تھیں کہ اس پر کسی میوزیم کا گمان ہوتا تھا۔ یہ تمام تصویریں، جواب پتا نہیں کس گودام میں پڑی سڑ رہی ہوں گی، نادر و نایاب تصویریں تھیں۔ یہ وہ انمول لمحے تھے جو کاغذ پر جم گئے تھے۔ ان تصویروں میں علی برادران کے جدامجد حافظ علی بخش کی ایک پینٹنگ بھی تھی جس میں وہ ریاست رام پور کے نواب یوسف علی خاں کے ساتھ بیٹھے ہیں۔ یہ وہی نواب یوسف علی خاں ناظم ہیں جو غالب کے شاگرد تھے اور جن کا ذکر غالب کے درجنوں خطوط میں ملتا ہے۔ مولانا شوکت علی اور مولانا محمد علی کی قد آدم تصویریں تھیں۔ اس کے علاوہ ان تمام بزرگوں کی سینکڑوں تصاویر تھیں جو کبھی نہ کبھی، کسی نہ کسی حیثیت سے خلافت کی تحریک سے وابستہ رہے۔ ان میں مولانا محمد علی کی وہ تصویریں بھی تھیں جب وہ کانگریس کے صدر تھے۔ گاندھی جی، پنڈت نہرو، سروجنی نائیڈو، ڈاکٹر مختار احمد انصاری، سیف الدین کچلو وغیرہ۔ ان میں مولانا محمد علی کے آخری سفر کی بھی بہت سی تصویریں تھیں۔ مولانا کا انتقال لندن میں ہوا تھا اور ان کی وصیت تھی کہ انھیں ایک غلام ملک میں دفن نہ کیا جائے، اس لیے مسلمانوں نے اپنے محسن کو بیت المقدس میں جگہ دی تھی۔ ان تصویروں میں مولانا کا جنازہ، ان میں لاکھوں روتے بلکتے ہوئے فلسطینی، اردنی، شامی اور مصری عربوں کے ساتھ ساتھ ہندوستانی سوگوار، اور مولانا کی تدفین ایسے مناظر تھے جنھیں دیکھ کر سر خود بخود ادب سے جھک جاتا تھا۔

آج جب محمد علی کو ایک ایسا لیڈر کہا جاتا ہے جس نے ایک ڈوبتی ہوئی کشتی کو بچانے کی کوشش کی تھی اور ایک ایسی تحریک شروع کی تھی جس کی تقدیر میں پہلے ہی سے شکست لکھی تھی، تو مجھے بہت افسوس ہوتا ہے۔ کیونکہ میرا مطالعہ یہ کہتا ہے کہ محمد علی کو ترکی کے اس نام نہاد فرمانروا سے، جو خلیفہ کہلاتا تھا، کوئی ہمدردی نہیں تھی بلکہ وہ مسلمانوں کے اس مستقبل کو دیکھ رہے تھے جو آج دھیرے دھیرے ہمارے سامنے آتا جا رہا ہے۔ اگر آج وہ خلافت جو ملوکیت اور آمریت کی بھینٹ چڑھ گئی، باقی ہوتی تو مسلمانوں میں مرکزیت ہوتی، ان کا ایک خلیفہ ہوتا جس کی حیثیت و ہیبت کچھ ہی عیسائیوں کے پوپ جیسی ہوتی، تو ملت اسلامیہ کی وہ شکل نہ ہوتی جو آج ہے۔ مسلمانوں کی سب سے بڑی بدنصیبی یہ ہے کہ ان کے پاس کوئی ایسا رہنما نہیں ہے جو انھیں ایک مرکز پر لا سکے۔ اگر خلافت کمیٹی کی تحریک کسی صورت سے خلافت کی روایت کو بچا سکتی تو مجھے یقین ہے کہ مسلمان تعلیمی، تہذیبی اور سیاسی میدانوں میں اتنے پیچھے نہیں ہوتے جتنے آج ہیں۔ خیر، چھوڑیے ان باتوں کو۔ ہمارے بزرگوں نے جو سیاسی

Scanned with CamScanner

غلطیاں کی ہیں اس کا حساب تو آنے والی نسلیں کریں گی، ہم تو صرف قیمت ادا کر رہے ہیں۔

آپ کو لگ رہا ہوگا کہ یہ مضمون خلافت یا علی برادران کا ماتم ہے۔ ایسا نہیں ہے۔ یہ خاکہ زعیم ملت مولانا زاہد شوکت علی کا ہے جو اس ملک میں خلافت کے آخری نام لیوا تھے اور علی برادران کے وارث بھی۔ وہ ضیغم اسلام مولانا شوکت علی کے بڑے بیٹے تھے۔ مولانا محمد علی کے بھتیجے بھی تھے اور داماد بھی۔ رامپور میں پیدا ہوئے۔ بڑے لاڈ پیار سے پالے گئے۔ پڑھنے کے لیے علی گڑھ بھیجے گئے مگر کچھ زیادہ نہیں پڑھ سکے۔ کیونکہ جس خاندان کا ہر فرد جنگ آزادی میں شریک ہو، جس کی دادی، جنہیں بی اماں کہا جاتا تھا، شہر شہر گھوم کر ہر دل میں اپنے وطن کو آزاد کرانے کا جذبہ جگا رہی ہوں:

جان بیٹا خلافت پہ دے دو
بولیں اماں محمد علی کی

جس کے باپ چچا جیل میں بند ہوں، جس کی ماں اور چاچی دلی کی سڑکوں پہ بھوک ہڑتالیں کر رہی ہوں، اس بچے کا دل نہ پڑھنے میں لگا اور نہ علی گڑھ میں۔ شاید فرسٹ ایئر کا امتحان دیا تھا مگر نتیجہ آنے سے پہلے ہی بمبئی آگئے جہاں خلافت اور آزادی کی تحریک شانہ بہ شانہ چل رہی تھی اور تمام ہندوستانی نوجوانوں کو اپنی طرف کھینچ رہی تھی۔

زاہد صاحب نے اپنی سیاسی اور سماجی زندگی کا آغاز خلافت کے ایک معمولی والنٹیئر کی حیثیت سے کیا۔ بڑے شاندار آدمی تھے۔ سو پچاس کے درمیان بھی کھڑے ہوں تو نظر پڑ جاتی تھی۔ بھاری بدن لمبا قد دیکھنے میں چھ فٹ سے زیادہ ہی نکلتے تھے۔ بڑی بڑی آنکھیں، جو عام حالات میں مسکراتی رہتی تھیں اور جن میں ایسی چمک تھی جیسی شریر بچوں کی آنکھوں میں ہوتی ہے۔ ہونٹ عجیب طرح کھلے رہتے تھے، جیسے ہنسی روکنے کی کوشش کر رہے ہوں۔ بھرے بھرے چہرے پر نفاست سے تراشی ہوئی داڑھی، سر پر بہت تھوڑے سے سفید بال مگر سلیقے سے سجے ہوئے۔ جامہ زیب آدمی تھے۔ لنگی کرتا بھی پہنے ہوتے تھے تو برے نہیں لگتے تھے۔ مگر جب کہیں باہر جاتے تو دھج دیکھنے کی ہوتی۔ سر پر لکھنوی دوپلی ٹوپی، سفید شیروانی جس میں سے جیبی گھڑی کی سنہری زنجیر جھانکتی رہتی تھی، پنڈلیوں پر منڈھا ہوا آڑا پاجامہ، پیروں میں سفید موزے اور سفید رنگ کی سلیم شاہی۔ خود گورے نہیں تھے مگر سفید کپڑے اور سفید داڑھی ان کی شخصیت کو ایسا وقار دیتے تھے کہ اجنبی بھی مرعوب ہو جایا کرتے تھے۔

Scanned with CamScanner

وہ میرے رشتے دار تھے اس لیے بمبئی آیا تو سر چھپانے کے لیے ٹھکانہ نہیں ڈھونڈنا پڑا۔ دفتر کے پچھلے حصے میں دو کمرے تھے جن میں سے ایک میں ارشاد علی صاحب کا خاندان رہا کرتا تھا، دوسرے میں بھوپال کے ایک صاحب مقیم تھے جن کا نام ذاکر علی خاں تھا۔ گول مٹول آدمی تھے اور بلڈ پریشر کے مریض تھے اس لیے چہرہ زیادہ تر لال رہتا تھا۔ سر بالوں سے محروم تھا اور گلابی کھال پر پسینے کے قطرے چمکتے رہتے تھے۔ خلافت یا خلافت ہاؤس سے ان کا رشتہ بس اتنا تھا کہ وہ زاہد صاحب کے دوست تھے۔ زاہد صاحب کی دوست نوازی کے نمونے سارے خلافت ہاؤس میں بکھرے پڑے تھے جن کا ذکر آگے آئے گا۔

ہاں تو یوں ہوا کہ میرے پہنچنے پر ذاکر صاحب کا رتبہ بلند ہو گیا۔ انھیں اوپر کی منزل پر ایک کمرہ دے دیا گیا اور ان کا کمرہ مجھے الاٹ ہو گیا مگر ذاکر صاحب کو اپنی ترقی ذرا نہیں بھائی۔ ہلکا سا احتجاج بھی کیا لیکن بے سود۔۔۔

جب میں اپنا سامان لے کر اندر گھسا تو سامنے کھڑے تھے۔ چہرے اور سر کا رنگ عنابی ہو چکا تھا اور پسینہ ٹپک رہا تھا۔ برا سا منھ بنا کر مجھے دیکھا اور بولے، ''دیکھیے، زاہد صاحب کا حکم ہے، اس لیے آپ اس کمرے میں رہ تو سکتے ہیں مگر یہاں کی کسی چیز کو ہاتھ مت لگانا۔ یہ سب میری ہیں اور یہیں رہیں گی۔''

''جی بہتر،'' میں نے عرض کیا۔

وہ باہر نکل گئے تو میں نے چاروں طرف دیکھا۔ مگر وہاں تو ہاتھ لگانے کے لیے کچھ تھا ہی نہیں۔ ایک مسہری تھی، جس پر بستر بھی نہیں تھا اور اس کے تختے کسی مریض کی پسلیوں کی طرح الگ الگ نظر آ رہے تھے۔ کونے میں ایک میز تھی جس پر کوئی دو درجن کانچ کی چھوٹی چھوٹی شیشیاں اور مرتبان چنے ہوئے تھے۔ پہلی نظر میں وہ میز کسی سڑک چھاپ دوا فروش کی دکان نظر آتی تھی مگر غور سے دیکھنے پر معلوم ہوا کہ مرتبانوں میں دوائیں نہیں ہیں؛ ان میں الگ الگ سائز کی کیلیں، اسکرو، نٹ بولٹ اور اسی قسم کا دوسرا سامان بھرا ہوا ہے۔ پتا چلا کہ ذاکر صاحب ساؤنڈ انجینئر ہیں اور کوئی پروجیکٹر یا ریکارڈر وغیرہ بیمار ہو جائے تو یہ اسکرو اور نٹ بولٹ دوا کا کام کرتے ہیں۔

زاہد صاحب نے مجھے بمبئی بلا کر بڑا احسان کیا تھا اس لیے میری کوشش یہی تھی کہ اپنی خدمت

Scanned with CamScanner

سے اس کا بدلہ چکا سکوں۔ چنانچہ میں نے اپنے دن اور رات اس ٹوٹی مسہری اور دفتر کی پرانی میز کے نام کر دیے۔

اخبار کا کام شام چار بجے کے قریب شروع ہوتا تھا اور رات کے ایک بجے تک جاری رہتا تھا۔ دفتر میں اخبار کے ایڈیٹر سید نور الحسن کے علاوہ دو تین مترجم تھے جو انگریزی سے اردو میں خبروں کا ترجمہ کیا کرتے تھے۔ میرے سپرد بھی یہی کام کیا گیا تھا۔ شروع شروع میں تو ٹیلی پرنٹر اور شام کے اخباروں سے خبروں کا ترجمہ ہی کرتا تھا۔ بعد میں پروف ریڈنگ اور کاپی جوڑنے کا کام بھی کرنے لگا۔

میں خلافت ہاؤس میں رہتا بھی تھا اور کام بھی کرتا تھا۔ اس کے باوجود ہمیشہ یہ احساس ہوتا رہتا تھا کہ میں اس دنیا کا حصہ نہیں ہوں جو زاہد شوکت علی صاحب نے اس چار دیواری کے اندر بنا رکھی ہے۔ ایسی دنیا میں نے پہلے نہیں دیکھی تھی۔

شام ہوتی۔ چھڑکاؤ کیا جاتا۔ پیڑوں کو پانی ڈالا جاتا۔ تنزی کی بڑی بڑی بنچیں، جن پر سفید رنگ کیا ہوتا، دھالی جاتیں اور میزیں لگا دی جاتیں۔ جب گیلی مٹی کی سوندھی خوشبو موگرے اور رات کی رانی کی مہک میں شامل ہو کے چاروں طرف پھیل جاتی تو زاہد صاحب نیچے اترتے۔ ایک نظر کاتبوں اور ایڈیٹوریل اسٹاف پر ڈالتے ہوئے باہر نکل جاتے۔ پہلے ایک تنقیدی جائزہ لیتے۔ اگر کوئی چیز قرینے سے نہ ہوتی تو نوکروں کی شامت آجاتی۔ ''اللہ، مالی میاں جان... حرام زادو! بنچ اب تک گیلی ہے۔ سکھائی کیوں نہیں؟... صاف کرو گنوار! جلدی ہاتھ چلاؤ۔ سور کے بچے کوئی کام ٹھیک سے نہیں کر سکتے...''

جب سارا اہتمام مرضی کے مطابق ہو جاتا تو صحن کے بیچ کے سامنے میں بچھی ہوئی بنچ پر براجمان ہو جاتے۔ اسی بنچ پر بیٹھے بیٹھے مغرب کے تین فرض ادا کرتے اور ان کی انگلیاں 33 دانوں والی چھوٹی سی تسبیح پر پھسلنے لگتیں۔ تب تک پانچ پانچ سو واٹ کے دو بلب جلا دیے جاتے۔ سارا صحن جگمگا اٹھتا۔ ان کے احباب، پرانے خلافتی اور ان سے ملنے جلنے والے جمع ہونا شروع ہو جاتے اور دیکھتے ہی دیکھتے ساری بنچیں بھر جاتیں۔ بالکل ایسا لگتا جیسے کوئی جلسہ یا نشست ہو رہی ہو اور زاہد صاحب اس کی صدارت کر رہے ہوں۔ آنے والوں میں بھانت بھانت کے لوگ تھے۔ بہت سے ایسے تھے جو تعارف سے نہیں، تعریف سے مستحق ہیں۔ مگر زیادہ تر ایسے تھے جو تعریف و تعارف دونوں کے قابل نہیں۔ وہ جو اس محفل یاراں کے

Scanned with CamScanner

مستقل ممبران تھے، ان میں مولانا ابوالکلام آزاد کے بھانجے سید حامد علی صاحب، سپلہ کے ڈاکٹر خواجہ عبدالحمید، ایڈوکیٹ مصطفیٰ شیخ، حکیم حیدر بیگ حیدر دہلوی، ہمالیہ ڈرگز کے محمد منال، سرتاج رحمانی، عاشق حسین ذکارو، منشی منتی، غلام احمد خاں آرزو، شکیل نعمانی، اور گاہے گاہے آنے والوں میں بھی وہ کون سا نام والا تھا جس کا نام زاہد صاحب کی فہرست میں نہیں تھا۔ ساحر لدھیانوی، مجروح سلطانپوری، شکیل بدایونی، مظفر شاہجہان پوری، علاء الدین صابر، چھیلا بدنام پوری اور مائل لکھنوی بھی آتے تھے اور اس بے لوث محبت سے سرفراز ہوتے تھے جو خلافت ہاؤس میں بانٹی جاتی تھی۔

غالب نے کہا تھا:

دیتے ہیں بادہ ظرفِ قدح خوار دیکھ کر

مگر زاہد صاحب نے کبھی نہ ظرف دیکھا اور نہ بادہ خوار۔ ان کے لیے سب برابر تھے۔

وہ کون سا موضوع تھا جو اس مجلس میں نہیں اٹھتا تھا۔ ادب و شعر، مذہب و سیاست، مصوری اور موسیقی سے لے کر حسینوں کے تذکرے اور کھانوں کے ذائقے، سبھی زیر بحث آتے۔ دیر گئے تک اونچی اونچی آوازیں آتی رہتیں اور قہقہے کھنکتے رہتے۔

میں خبریں ترجمہ کرتے یا کاپی جوڑتے اکثر باہر جھانک لیتا تھا، اور تیز روشنی میں چمکتے ہوئے چہروں کو دیکھ کر سوچتا تھا، پرانے زمانے کے بادشاہوں اور نوابوں کی محفلیں بھی ایسی ہی ہوتی ہوں گی، بس اسٹینڈرڈ میں ذرا سا فرق آ گیا ہے۔

اس میں کوئی شک بھی نہیں ہے کہ زاہد صاحب شاہ مزاج تھے۔ ان میں وہ ساری خوبیاں اور خامیاں موجود تھیں جن کا ذکر تاریخی کتابوں میں ملتا ہے۔ خوش ہوتے تو موتیوں میں تول دیتے اور ناراض ہو جاتے تو زن بچہ کولھو میں پلوا دیتے۔

زاہد صاحب کا مزاج بھی ہوا کے جھونکے پر سوار رہتا تھا۔ ان کا موڈ کب کیسا ہو گا، میرا خیال ہے یہ بات وہ خود بھی نہیں جانتے تھے۔ بمبئی آئے ہوئے کچھ ہی دن ہوئے تھے کہ عید آ گئی۔ فجر کی نماز پڑھتے ہی زاہد صاحب کھڑکی میں آ کھڑے ہوئے اور خلافت ہاؤس کے تمام رہنے والوں کو نام بنام پکارنا شروع کر دیا:

'لالہ، اے لالہ حرامزادے، کہاں مر گیا؟ ابھی تک نہار رہا ہے کیا؟ .... موں، او ماموں

Scanned with CamScanner

(ارشد علی صاحب) ارے باہر نکلو بھائی، کب تک بیوی کا پلو پکڑے بیٹھے رہو گے؟... عالم صاحب! ... اے شاہ محمد، جا کے دیکھ، عباسی صاحب تیار ہوئے کہ نہیں۔ اور یہ جاوید کہاں ہے؟ اب تک سو رہا ہے کیا؟ اٹھاؤ نالائق کو۔ عید کی نماز بھی نہیں پڑھے گا کیا؟"

ایک ایک کر کے سبھی جمع ہو گئے اور تھوڑی دیر میں باب عمر سے نمازیوں کا ایک چھوٹا سا جلوس نکلا جس کی قیادت زاہد صاحب کر رہے تھے اور جس کا رخ بنگلہ مسجد کی طرف تھا۔ انھوں نے پلٹ کر اپنے ساتھ آنے والوں کو دیکھا۔ سب پر ایک ایسی نظر ڈالی جیسے کوئی اصیل مرغا اپنے پیچھے آنے والی مرغیوں کو دیکھتا ہے۔ اور مجھ سے پوچھا: "سب چیزیں لے لیں؟"... میری سمجھ میں نہیں آیا کہ نماز کے لیے کس چیز کی ضرورت ہو سکتی ہے۔ اچانک خیال آیا کہ میں ننگے سر ہوں۔ یہ ٹوپی کو پوچھ رہے تھے، جو میرے کرتے کی جیب میں تھی۔ میں نے ٹوپی نکالی اور کہا: "جی۔"

جب ہمارا قافلہ مسجد پہنچا تو باہر کا فٹ پاتھ بھی نمازیوں سے بھر چکا تھا، اور دیر سے آنے والے سڑک پر صف بندی کر رہے تھے۔ زاہد صاحب نے کہا

"بچھاؤ بچھاؤ۔ ادھر ہی بچھا دو!"

"کیا بچھا دوں؟" میں نے پوچھا۔

"چٹائی، اور کیا؟" وہ گرجے۔

چٹائی؟... وہ تو میں لایا ہی نہیں تھا۔ کیونکہ مجھے معلوم ہی نہیں تھا۔ اور ہادی، جسے یہ بات معلوم ہوتی تھی، نماز پڑھنے کے لیے آزاد میدان چلا گیا تھا۔

زاہد صاحب نے دانت پیس کر مجھے دیکھا اور پھر باوضو مغلظات کا ایسا ریلا آیا کہ الامان! میں آنسو پونچھتا ہوا بھاگا اور جب چٹائی لے کر پلٹا تو نماز ختم ہو چکی تھی اور خطبہ شروع ہو چکا تھا۔

ان کی عادت یہ تھی کہ کسی بات کو نہ دل میں رکھتے تھے نہ دماغ میں۔ نماز کے بعد جب گلے لگایا تو شاید انھیں یاد بھی نہیں تھا کہ تھوڑی دیر پہلے وہ مجھے رلا چکے ہیں۔

پیسے کے معاملے میں بھی ان کا یہی انداز تھا۔ اگر کہیں سے مال آ جاتا تو پرانے پرانے حساب بھی ڈھونڈ کر نکالے جاتے اور بے باق کیے جاتے۔ اور اگر کہیں ہاتھ تنگ ہوا تو پوچھیے مت۔ پیسوں کا نام سنتے ہی اس طرح بھڑکتے تھے جیسے بارود کے ڈھیر پر بیٹھے ہوں

Scanned with CamScanner

کاتبوں سے تو انھیں اللہ واسطے کا بیر تھا۔ ہر ہفتے جب کاتبوں کی کارگزاری سامنے آتی تو منظر دیکھنے کا ہوتا: ''اس لطیف لنگڑے کی تو دوسری بھی توڑ دینی چاہیے۔ دیکھو یہ، دیکھو یہ کتابت ہے؟... معلوم ہوتا ہے چیونٹی کی دم میں سیاہی لگا کے کاغذ پر چھوڑ دیا ہے۔ اور اس رونق حیدر آبادی سے تو کتابت ہی نہیں کرانی چاہیے، مسطر بنوایا کرو۔ حرامزادہ خبر کو قبر کہتا ہے، لاحول و لاقوۃ... اور یہ اختر... ایک سطر میں سات لفظ ہوتے ہیں۔ مردود پانچ غلط لکھتا ہے۔ اور اس خبیث سنبل کو تو ایک پیسہ مت دینا۔ حکیم صاحب کے اشتہار میں لکھا تھا، عورتوں کے لیے زنانہ کا معقول انتظام ہے۔ بدمعاش نے لکھ، عورتوں کے لیے زنا کا معقول انتظام ہے۔ جان بوجھ کے کیا ہے حرامزادے نے! اشتہار بند ہو گیا نا، اب پیسے اس کا باپ دے گا؟ سب حرامی ہیں، سب کے سب۔ خدا ان کی بھوک بڑھائے اور کھانے کو کم دے...''

مگر جب اختر حسین کاتب کی بیوی لمبی بیماری کے بعد گزر گئی تو اس کے پاس اسپتال کا بل ادا کرنے کا کوئی سہارا نہیں تھا۔ زاہد صاحب کو پتا چلا تو خود اسپتال پہنچ گئے۔ ڈاکٹروں کو بہت برا بھلا کہا اور بل ادا کر کے لاش اختر حسین کے حوالے کی۔ کفن دفن کے لیے کچھ نقد بھی دیا اور بولے: ''اس پیسے کے بارے میں عالم (منیجر) کو مت بتانا، ورنہ وہ تمھارے حساب میں سے کاٹ لے گا۔''

ایسا ہی ایک قصہ میرے ساتھ بھی ہوا تھا۔ جنوری آئی تو دوستوں نے تقاضا کیا کہ اس دفعہ میں اپنی سالگرہ پر پکچر دکھاؤں اور باہر کھانا کھلاؤں۔ میں عالم صاحب کے پاس گیا اور کہا: ''چھ مہینے سے مجھے تنخواہ نہیں ملی ہے۔'' کہنے لگے: ''مجھے بھی نہیں ملی ہے۔'' میں نے کہا: ''آپ کی بات آپ جانیں۔ مجھے کم سے کم ایک مہینے کی تنخواہ ملنی ہی چاہیے۔'' عالم نے فون اٹھایا اور بولا:

''یہ جاوید صاحب تنخواہ مانگ رہے ہیں۔''

ادھر سے آواز آئی: ''اسے اوپر بھیجو!''

میں نے خود کو گالیاں سننے کے لیے تیار کیا اور اوپر پہنچ گیا۔ زاہد صاحب مولانا شوکت علی کی قدِ آدم تصویر کے سامنے کچھ انھیں کے سے انداز میں کھڑے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی بھڑکے:

''کیوں چاہیے تنخواہ؟''

''جی وہ، بات یہ ہے کہ میری سالگرہ ہے!''

Scanned with CamScanner

''تو؟''

''فرینڈز کا کہنا ہے کہ پکچر دیکھیں گے اور باہر کھانا کھائیں گے۔''

کچھ تھوڑے سے نرم پڑ گئے۔ ذرا سے مسکرائے اور پوچھا:

''کب ہے تمھاری سالگرہ؟''

''جی پرسوں!... تیرہ تاریخ کو!''

''کتنے پیسے چاہییں؟''

''اگر تیس چالیس روپے مل جاتے تو...''

''اتنے میں ہو جائے گی تمھاری پارٹی؟''

''جی، کوشش کروں گا!''

''ہنہہ... پاگل...'' وہ زور سے ہنسے۔ ''اپنے دوستوں سے کہو، پرسوں یہاں آجائیں۔ سالگرہ ہم منائیں گے!''

اس کے بعد دو دن تک زاہد صاحب اپنے تمام دوستوں کو فون کرتے رہے:

''ارے بھئی فلاں صاحب! ابھی تیرہ تاریخ کی شام کی چائے آپ میرے ساتھ پییں۔ میرے بھتیجے کی سالگرہ ہے!''

سالگرہ ہوئی، ایک آدھ فوٹو کھنچے، اخبار میں خبر بھی چھپی۔ کہنے کو وہ میری سالگرہ تھی، بہت سے تحفے اور خوشی بھی میرے ہاتھ آئی تھی، مگر لگ ایسا رہا تھا جیسے وہ زاہد صاحب کی سالگرہ ہو۔ ان کی آنکھوں کی چمک، ہونٹوں کی مسکراہٹ اور چہکتے ہوئے جملے ایک ایسی خوشی کو ظاہر کر رہے تھے جو کسی بزرگ کی نہیں، ایک بچے کی خوشی تھی، ایک معصوم بچے کی جو اس سفید داڑھی کے پیچھے کہیں چھپا بیٹھا تھا۔

گرودت کی فلم چودھویں کا چاند کی ریلیز سے کچھ پہلے اس کا پریس شو ہوا۔ پتا نہیں اس فلم میں کیا بات تھی کہ ایک نشہ سا طاری ہو گیا۔ جدھر دیکھتا، وحیدہ رحمٰن کی بڑی بڑی آنکھیں نقاب اٹھا کر جھانکتی دکھائی دیتیں اور کانوں میں گیت گونجتے رہتے۔ دوسرے دن صبح جب میں زاہد صاحب کے ساتھ ناشتہ کرنے کے لیے بیٹھا تو فلم کی اتنی تعریف کی کہ وہ بے چین ہو گئے۔ اخبار کھول کر وحیدہ رحمٰن کو بہت غور سے دیکھا اور پوچھا: ''کون سے تھیٹر میں لگ رہی ہے؟'' میں نے بتایا تو کہنے لگے،

Scanned with CamScanner

"پیلس سینما تو پاس ہی ہے۔ عالم سے کہو، منیجر کو فون کرے کہ ہم لوگ پہلے دن کا آخری شو دیکھنے کے لیے آئیں گے۔"

فون کر دیا گیا۔ منیجر زاہد صاحب کو جانتا تھا۔ اس نے کہا، "ویسے تو ہاؤس فل ہے، مگر آپ جتنے لوگوں کو لانا چاہیں لے کر آئیں۔ سیٹیں کم پڑیں گی تو کرسیاں لگوا دوں گا۔"

دو دنوں تک زاہد صاحب اپنے تمام دوستوں کو فون کر کے چودھویں کا چاند دیکھنے کا نیوتا دیتے رہے۔ "ارے بھئی، بڑی عمدہ فلم ہے۔ میوزک بھی بہت اچھا ہے۔ اور وہ جو نئی لڑکی ہے وحیدہ، سنا ہے مدراس کی ہے مگر بہت خوبصورت ہے۔" اور جب جمعے کی رات کو لوگ ٹکٹوں کے لیے کھڑکیاں توڑ رہے تھے، زاہد صاحب کا قافلہ پیلس سینما پہنچا تو اس منیجر کا چہرہ دیکھنے کے قابل تھا۔ وہ غریب چار چھ آدمیوں کا بندوبست کر کے بیٹھا تھا، یہاں بائیس آدمیوں کا لشکر کھڑا ہوا تھا۔ بہر حال، جیسے تیسے تمام لوگوں کو بٹھایا گیا، کچھ کرسیاں لگوائی گئیں اور اس طرح زاہد صاحب نے چودھویں کا چاند دیکھا۔

دوسرے دن میں ذرا جلدی اوپر پہنچ گیا۔ زاہد صاحب ڈائننگ ٹیبل پر آچکے تھے اور اخبار ان کے ہاتھ میں تھا۔ انھوں نے سر اٹھا کر مجھے دیکھا مگر کچھ بولے نہیں۔ میں نے پوچھا، "پکچر کیسی لگی آپ کو؟" انھوں نے اخبار جھٹکے سے نیچے رکھا اور گرج کر بولے، "اس سے زیادہ ذلیل فلم تو میں نے کبھی دیکھی ہی نہیں۔ لاحول ولاقوۃ! وہ کوئی فلم ہے؟"

میرا منھ حیرت سے کھل گیا۔ مجھے اپنے کانوں پہ یقین نہیں آیا۔ ڈرتے ڈرتے پوچھا، "آپ کون سی فلم دیکھ کے آئے ہیں؟"

ان کی آنکھوں سے چنگاریاں نکلنے لگیں: "کون سی فلم؟... کون سی فلم بتائی تھی تم نے؟"

جی میں نے تو چودھویں کا چاند..."

"جی وہی... چودھویں کا چاند... ذلیل فلم، بیہودہ گھٹیا فلم... وہ سالی کوئی فلم ہے! روتے روتے بری حالت ہو گئی رات بھر نیند بھی نہیں آئی۔ تم سالے پیدا ہوئے تو جائیدادیں ضبط ہو گئیں، بڑے ہوئے تو باپ کو کھا گئے۔ تم ایسی رونے دھونے کی فلمیں دیکھا کرو، کیونکہ تمھاری اپنی زندگی ایک ٹریجڈی ہے سالی۔ مگر مجھے رونے کا کوئی شوق نہیں۔ میں سونے کا چمچہ منھ میں لے کر پیدا

ہوا، ساری زندگی عیش و آرام سے کٹی۔ باقی بھی اسی طرح کٹ جائے گی۔ میری زندگی میں آنسوؤں کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے۔ دوبارہ اگر ایسی حرکت کی تو سیدھا رامپور بھجوا دوں گا۔ جاؤ، منھ کالا کرو... لاحول ولاقوۃ! رات کا کھانا خراب ہوا، صبح کا ناشتہ بھی خراب ہو گیا۔''

اس دن مجھے زاہد صاحب پر بہت غصہ آ رہا تھا۔ میرے چہرے پر حیرت تھی مگر دل میں نفرت۔ ''یہ آدمی، یہ ضیغم اسلام مولانا شوکت علی کا بیٹا اور مولانا محمد علی کا داماد ہے؟... لعنت ہے... یہ تو ایک بگڑا ہوا رئیس زادہ ہے جو زندگی کا حسین پہلو ہی دیکھتا ہے۔ اسے کیا معلوم کہ دکھ دنیا کی دوسری سب سے بڑی سچائی ہے۔''

بعد میں مجھے معلوم ہوا کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو تلوار کا گھاؤ سہہ لیتے ہیں مگر انجکشن کی سوئی برداشت نہیں کر سکتے۔ زاہد صاحب کچھ ایسے ہی آدمی تھے۔

جس زمانے میں بمبئی میں مہاراشٹرا کی کرن کمیٹی کا آندولن اپنے شباب پر تھا۔ ایک الگ مہاراشٹر کی مانگ کی جا رہی تھی۔ حکومت اس آندولن کو دبانے کی کوشش کر رہی تھی جس کے نتیجے میں جگہ جگہ دنگے ہو رہے تھے۔ بہت سے علاقوں میں یہ دنگے فرقہ وارانہ فسادات کی شکل اختیار کر گئے تھے۔ گھر جل رہے تھے، دکانیں لٹ رہی تھیں، جگہ جگہ بے گناہوں پر جان لیوا حملے ہو رہے تھے، اور مرارجی ڈیسائی کی حکومت پتھرائی ہوئی آنکھوں سے قتل اور غارت گری کا یہ منظر دیکھ رہی تھی۔ سنا ہے کہ اس زمانے میں ایک سفید جیپ، جس پر ایک بڑا سا سفید جھنڈا لہراتا ہوتا تھا، کرفیو میں سہمی ہوئی تنگ و تاریک گلیوں میں گھوما کرتی تھی۔ اس میں ڈرائیور کے پاس زاہد صاحب بیٹھے ہوتے تھے اور ان کے پیچھے ہوتے تھے وہ چار چھ پرانے خلافتی جن کے دلوں میں قوم کا درد باقی رہ گیا تھا۔ زاہد صاحب جہاں کہیں کسی کو زخمی دیکھتے، اسے اسپتال پہنچاتے، گھر بند کر کے بیٹھنے والے غریبوں کو کھانے پینے کا سامان پہنچاتے اور ان علاقوں میں جہاں زیادہ غنڈہ گردی ہو رہی ہوتی، حالات کو قابو میں لانے کے لیے پولیس کی مدد کرتے۔ انھوں نے خلافت ہاؤس کو ایک ریلیف کیمپ بنا دیا تھا جہاں سیکڑوں لوگوں کی امداد کی جا رہی تھی۔ ان کا سب سے زیادہ وفادار ملازم لالہ جو آخری سانس تک زاہد صاحب کے ساتھ رہا، انہیں چھپالیس کے ایسے ہی حالات میں ملا تھا۔ لالہ کا پورا نام امیر زرگل تھا۔ وہ سوات کے ایک گاؤں سے اپنے کسی رشتے دار سے ملنے بمبئی آیا تھا مگر فسادات میں گھر گیا۔ جب زاہد

صاحب اور ان کے والنٹیئرز نے لالہ کو رے روڈ کے فٹ پاتھ سے اٹھایا تو اس کی گردن کٹی ہوئی تھی، جسم پر چہرے کے بہت سے نشانات تھے اور اتنا خون بہہ چکا تھا کہ بچنے کی کوئی امید نہیں تھی۔ مگر تیرہ چودہ سال کا یہ پٹھان لڑکا بڑا سخت جان نکلا، اور جب اس قابل ہوا کہ اسپتال کے بستر سے اٹھ سکے تو اس آدمی کا پتا پوچھا جو اسے اسپتال لے کر آیا تھا، اور خلافت ہاؤس پہنچ گیا۔ میں نے احسان کی قیمت ادا کرنے والے پٹھانوں کی بہت سی کہانیاں سنی ہیں مگر لالہ اس کی زندہ مثال تھا۔ اس نے زاہد صاحب کے احسان کی قیمت اپنی خدمت اور وفاداری کے ذریعے ادا کی۔ حد یہ ہے کہ زاہد صاحب کے انتقال کے بعد بھی وہ اپنے گھر نہیں گیا۔ کچھ دن زاہد صاحب کے بھائی عابد صاحب کی خدمت میں رہا اور پھر ان کے بھانجے کے پاس کراچی چلا گیا اور وہیں مرا۔

انگریزی اور اردو کے مشہور صحافی لاجپت رائے نے بتایا کہ ملک کی تقسیم کے ہولناک حادثے کے بعد جب وہ ایک شرنارتھی کی حیثیت سے بمبئی پہنچے تو انھیں کالج میں داخلہ تو مل گیا مگر ہوسٹل میں جگہ نہ مل سکی۔ اسی پریشانی کے عالم میں ایک دن زاہد صاحب سے ملاقات ہوگئی۔ زاہد صاحب نے جیسے ہی لاجپت رائے کی کہانی سنی، فرمایا: ''جب تک ہوسٹل میں کمرہ نہیں ملتا، تم خلافت ہاؤس میں رہ سکتے ہو۔'' لاجپت رائے نے گیلی آنکھوں سے زاہد صاحب کو یاد کیا اور کہا: ''نہ جان نہ پہچان، نہ کوئی سفارش، مگر پھر بھی یہ ہندو شرنارتھی لڑکا تقریباً ایک سال تک خلافت ہاؤس میں بلا معاوضہ رہتا رہا۔''

ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے

زاہد صاحب موسیقی کے دیوانے تھے۔ پتا نہیں، وہ کلاسیکی موسیقی کے بارے میں کتنا جانتے تھے، راگ راگنیاں پہچانتے تھے یا نہیں، مگر سُر ضرور پہچانتے تھے۔

میں دوپہر کا کھانا عام طور پر ان کے ساتھ ہی کھایا کرتا تھا۔ دو بجے کے قریب کھانا لگ جاتا اور دو بجے ہی آل انڈیا ریڈیو پر کلاسیکی موسیقی کا پروگرام ہونا شروع ہوتا تھا۔ اور پہنچ کر میرا پہلا کام یہی ہوتا کہ ریڈیو کھول دیتا۔ بیگم اختر ان کی بہت بڑی کمزوری تھیں۔ وہ کہا کرتے تھے: ''بیگم صاحب غزل نہیں گاتی ہیں، شعر کو دل میں اتار دیتی ہیں۔'' بیگم اختر جب بھی بمبئی آتیں، زاہد صاحب سے ملنے ضرور آتیں اور جہاں کہیں بھی ان کا پروگرام ہوتا، اس میں آنے کی دعوت دیتیں۔ اور اگر پرائیویٹ پروگرام ہوتا تو زاہد صاحب کوئی نہ کوئی صورت نکال کے خود ہی وہاں پہنچ جاتے۔

Scanned with CamScanner

بیگم اختر کی آواز سے ان کے عشق کا ایک قصہ شہر کے بہت سے خوش ذوق لوگوں کو اب بھی یاد ہوگا۔ زاہد صاحب دل کے مریض تھے۔ انھیں انجائنا تھا۔ کام کی کثرت، جذبات کی شدت یا کسی بد پرہیزی سے اکثر ایسا ہوتا کہ سینے میں درد ہونے لگتا۔ دل کے مریضوں کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ دو یا تین دوروں کے بعد اللہ کو پیارے ہو جاتے ہیں۔ مگر زاہد صاحب نے زندگی بھر کسی روایت کی رعایت نہیں کی تو یہاں کیوں پیچھے رہتے۔ کتنی حیرت کی بات ہے کہ انھیں تقریباً تائیس دورے پڑے جس میں سے سات یا آٹھ دفعہ اسپتال بھی جانا پڑا، اور دو مرتبہ ایسا بھی ہوا کہ موت سرہانے تک آئی اور پھر نہ جانے کیوں مسکرا کے ٹل گئی۔ یہ ہی کوئی وقت تھا جب زاہد صاحب جی ٹی اسپتال میں زیر علاج تھے اور ان کے معالج ڈاکٹر موفق الدین نے انھیں ہلنے تک کی ممانعت کر دی تھی۔ نہ جانے کیسے ان تک یہ خبر پہنچ گئی کہ بیگم اختر شہر میں ہیں اور ان کا پروگرام پولیس کے ڈپٹی کمشنر جناب سرفراز پٹھان کے بنگلے پر ہو رہا ہے۔ زاہد صاحب بے چین ہو گئے۔ ڈاکٹر کی بہت خوشامد کی مگر انھوں نے ڈانٹ کر چپ کرا دیا۔

پٹھان صاحب کے بنگلے کا لان جگمگا رہا تھا۔ بیگم اختر آ چکی تھیں اور اسٹیج پر بیٹھ کر ہارمونیم کے سُر ملا رہی تھیں کہ اچانک حاضرین میں ہلچل مچ گئی۔ کچھ لوگ کھڑے ہو گئے اور باہر کی طرف لپکے۔ بیگم صاحبہ پریشان ہو گئیں کہ پتا نہیں کیا ماجرا ہے، اور تھوڑی دیر میں ان کی حیرت کی انتہا نہیں رہی جب انھوں نے دیکھا کہ چار آدمی ایک کرسی اٹھا کر اندر لا رہے ہیں جس پر زاہد شوکت علی صاحب ایک شال میں لپٹے ہوئے رکھے ہیں۔ بیگم صاحبہ نے دیکھا تو اسٹیج سے اتر کے زاہد صاحب کے پاس آ گئیں۔ تب بولیں: "ارے زاہد میاں، آپ؟... میں نے تو سنا تھا کہ آپ خدانخواستہ بیمار ہیں اور اسپتال میں ہیں۔"

زاہد صاحب نے اپنی پھولی ہوئی سانسیں درست کرتے ہوئے کہا: "وہیں سے بھاگ کے آ رہا ہوں۔"

"بھاگ کے آ رہے ہیں... کیوں؟" بیگم اختر نے پوچھا۔

"آپ میرے محلے میں آئیں اور میں ملنے بھی نہ آؤں، ایسی بے دلی کیسے ہو سکتی ہے؟"

بیگم اختر نے زاہد صاحب کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور بڑی محبت سے بولیں: "آپ کو ایسا

Scanned with CamScanner

نہیں کرنا چاہیے تھا۔ خدانخواستہ طبیعت زیادہ خراب ہوگئی تو میں اپنے آپ کو کبھی معاف نہیں کروں گی۔"

زاہد صاحب مسکرائے اور بولے، "آپ اپنی آواز کے جادو کو خود نہیں جانتیں۔ اگر سویرے تک ٹھیک نہ ہو جاؤں تو جو کہیے وہ ہار جاؤں گا۔"

بیگم اختر اپنی آواز کے اس دیوانے کو دیکھتی رہ گئیں۔

زاہد صاحب کو ایک صوفے پر بہت سے تکیے لگا کر لٹا دیا گیا۔ ایک گلاس پانی اور ان کی دوائیں پاس رکھ دی گئیں اور بیگم اختر نے گانا شروع کیا۔

صبح چار بجے کے قریب جب بیگم اختر نے غالب کی غزل:

دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے
آخر اس درد کی دوا کیا ہے

سنائی اور ہارمونیم بند کیا تو معجزہ ہو چکا تھا۔ زاہد صاحب اٹھ کے بیٹھ چکے تھے اور پھر خود اپنے پیروں سے چلتے ہوئے بیگم اختر کے پاس آئے، ان کا شکریہ ادا کیا اور کہا: "یہ ڈاکٹر موثق الدین تو بالکل بیکار آدمی ہیں۔ اگر دل کے مریضوں کے لیے آپ کے ریکارڈ بجائے جائیں تو میری طرح سب ٹھیک ہو جائیں گے۔"

بات مذاق کی لگتی ہے مگر یہ حقیقت ہے کہ زاہد صاحب پر موسیقی کا جو اثر ہوتا تھا ویسا حال میں نے کسی اور کا نہیں دیکھا۔

اسی قبیل کا ایک قصہ اور ہے۔ ایک بہت اچھی سریلی گانے والی ہوا کرتی تھیں، احمدی بیگم چوپڑا۔ آواز میں مٹھاس بھی تھی اور درد بھی۔ بیگم اختر نے ایک محفل میں ان کو سن کر کہا تھا: "ایسا لگ رہا ہے جیسے آج مجھے ایک وارث مل گیا۔" مگر احمدی بیگم کو پتا نہیں کیا سوجھی، اچانک شادی کر لی اور گانے سے توبہ کر لی۔ زاہد صاحب کو خبر ملی تو دونوں ہاتھوں سے سر پکڑ کے بیٹھ گئے اور تقریباً روہانسے ہو کر بولے: "غضب ہو گیا!... میں تو لٹ گیا!"

احمدی بیگم ماشاءاللہ حیات ہیں۔ کبھی کبھی مل بھی جاتی ہیں اور جب بھی ملتی ہیں، جس محبت اور عقیدت سے زاہد صاحب کا ذکر کرتی ہیں وہ سننے کے قابل ہوتا ہے۔

ایک دن زاہد صاحب کی محفل میں ایک نیا چہرہ دکھائی دیا۔ چھوٹا سا قد، بے حد معصوم چہرہ،

Scanned with CamScanner

آنکھوں پہ سنہری فریم کا چشمہ، بہت سلیقے سے جمے ہوئے بال، سیاہ شیروانی اور علی گڑھی پاجامہ۔ یہ صاحب تھے شمیم جے پوری۔ روایتی شاعری کیا کرتے تھے۔ جگر مراد آبادی کو اپنا استاد مانتے تھے۔ شعر تو خیر جیسے ہوتے ہیں ویسے ہوتے تھے مگر آواز غضب کی تھی، اور چونکہ موسیقی سے واقف تھے اس لیے ہر غزل کی دھن الگ ہوتی اور بہت خوب ہوتی۔ بہت سے لوگوں کو یہ بات نہیں معلوم ہوگی کہ بیگم اختر نے شمیم جے پوری کی جتنی غزلیں گائی ہیں ان سب کی طرزیں شمیم صاحب کی بنائی ہوئی ہیں۔ زاہد صاحب تو اچھی آواز کے دیوانے تھے ہی، شمیم صاحب پر اپنی مہربانیوں کے تمام دروازے کھول دیے۔

ایک دن مجھے طلب کیا اور فرمایا کہ "آج سے تمھارے کمرے میں شمیم جے پوری بھی رہا کریں گے۔" اور جب شمیم جے پوری صاحب اپنی تمام معصومیت، نزاکت اور مسکراہٹ کے ساتھ میرے کمرے میں داخل ہوئے تو مجھے بالکل اچھا نہیں لگا۔ میں نے بڑا برا سا منھ بنا کے ان سے پوچھا: "کہاں سوئیں گے آپ... مسہری تو ایک ہی ہے؟"

آدمی سمجھدار تھے، اشارہ سمجھ گئے۔ کہنے لگے: "جاوید میاں، بے فکر رہیے۔ اس کمرے سے باہر جو تخت پڑا ہوا ہے میں اس پہ سو جاؤں گا۔ صرف یہ سوٹ کیس اور دو چار کپڑے ہیں، اگر اجازت ہو تو اس کمرے میں رکھ دوں۔"

مجھے ان پہ رحم آ گیا۔ میں نے اجازت دے دی۔ اور اس طرح شمیم جے پوری میرے ہم کمرہ ہوگئے اور ایک عرصے تک رہے۔ حالانکہ عمر میں بہت فرق تھا لیکن شمیم صاحب سے دوستی ہوتے دیر نہیں لگی۔

اکثر ایسا ہوتا تھا کہ شمیم صاحب کے پاس کھانے کے پیسے بھی نہیں ہوتے تھے اور ہم دونوں باندرہ مارکیٹ کے پیچھے کی گلی کی نالیوں سے بچتے بچاتے نکلتے ہوئے چمار لین کے اس بھٹیار خانے میں جاتے جہاں دس پیسے میں تندوری روٹی اور چالیس پیسے میں ایک قورمہ ملا کرتا تھا۔ تیس پیسے میں ماش کی دال بھی مل جاتی جس کے اوپر ہرے دھنیے اور ہری مرچ کی ڈریسنگ ہوتی۔ اور ہم دونوں سوا روپے یا زیادہ سے زیادہ ڈیڑھ روپے میں پیٹ بھر کے کھانا کھاتے۔

ایسی ہی ایک ملاقات میں شمیم صاحب نے اپنی داستانِ محبت سنائی۔ کہانی تو بڑی معمولی سی تھی۔ ایک بال بچوں والا شاعر ایک کم عمر لڑکی پہ عاشق ہو گیا تھا۔ مگر جب انھوں نے نام بتایا تو میں

Scanned with CamScanner

چھلی پڑا۔ وہ لڑکی تھی نسیم بانو چوپڑا۔ بہت بڑی بڑی ہرن جیسی کالی آنکھوں والی لڑکی جو مشہور گائکہ احمدی بیگم چوپڑا کی بھانجی یا بھتیجی تھی اور خود بھی بہت اچھی گائکہ تھی۔

مگر شمیم صاحب کا عشق یکطرفہ تھا، اور نسیم بانو کے گھر والوں کا جو رویہ تھا وہ بھی درست ہی معلوم ہوتا تھا کیونکہ سونے کا انڈا دینے والی مرغی کو کون جانے دیتا ہے۔

خدا جانے شمیم صاحب نے کیا جادو جگایا کہ نسیم بانو گھر والوں سے بغاوت کر کے ان سے شادی کرنے پر راضی ہو گئیں۔ جب شمیم صاحب نے بتایا تو مجھے یقین ہی نہیں آیا، مگر انھوں نے کہا، ''آپ کسی قاضی کا بندوبست کر دیجیے، ثبوت خود بخود ہاتھ آ جائے گا۔''

قاضی سید معصوم حسینی بہت ہی شریف اور دوست نواز آدمی تھے۔ جب میں نے انھیں شمیم و نسیم کی داستانِ محبت سنائی۔ فرمایا: ''وہ دونوں یہاں آ جائیں، نکاح پڑھا دیا جائے گا۔'' میں نے شمیم صاحب کو اطلاع دی اور قاضی صاحب کی ہدایت کے مطابق یہ بھی بتا دیا کہ کچھ گواہوں کی ضرورت بھی ہوگی۔ شمیم صاحب نے باراتیوں کی ایک لمبی فہرست بنائی اور لہک کر تقریباً ترنم سے کہا: ''ہمارے چاہنے والے بہت ہیں اب بھی دنیا میں۔''

میں وقتِ مقررہ پر قاضی صاحب کے گھر پہنچ گیا جو بھنڈی بازار میں تھا۔ قاضی صاحب نے گھر کے ایک حصے کو اپنا دفتر بنا لیا تھا۔ میں وہاں بیٹھ کر انتظار کرنے لگا۔ کوئی ایک گھنٹے کی تاخیر کے بعد پسینے میں نہائے شمیم صاحب ایک برقع پوش نسیم بانو کو ساتھ میں لیے نمودار ہوئے اور پھولی ہوئی سانسوں میں پوچھا: ''اور کوئی نہیں آیا؟'' میں نے ہاتھ کے اشارے سے کہا: ''خود ہی دیکھ لیجیے۔''

شمیم صاحب زیرِ لب کچھ بولتے رہے۔ پتا نہیں وظیفہ پڑھ رہے تھے یا گالیاں دے رہے تھے۔ پھر میرے کان میں بولے: ''اب کیا ہوگا جاوید میاں؟'' اور یک نام لے کر بولے: ''میں نے اس مردود کو ہار پھول اور چھوارے لانے کے لیے پانچ روپے بھی دے دیے تھے۔''

قصہ مختصر یہ کہ میں بھاگا ہوا گیا، چھوارے اور دو ہار خرید لایا۔ قاضی صاحب نے اپنے دو ملنے والوں کو گواہی کے لیے بلا لیا اور میں نے ولی بن کر نسیم بانو چوپڑا کو شمیم جے پوری کے نکاح میں دے دیا۔ خدا جنت نصیب کرے قاضی معصوم کو، انھوں نے نکاح پڑھانے کا معاوضہ بھی نہیں لیا۔

دولہا دلہن تو رخصت ہو گئے مگر میری شامت آ گئی۔ تین دن کے اندر اندر شمیم اور نسیم کی کہانی شہر

Scanned with CamScanner

بھر میں پھیل گئی۔ زاہد صاحب کے دربار میں میری پیشی ہوئی جہاں اور بھی بہت سے لوگ موجود تھے۔ اور جب زاہد صاحب مجھے بتا چکے کہ میں کتنا بدذات، بدمعاش اور بدکردار لڑکا ہوں تو میں نے عرض کیا، ''اب مجھے یہ بھی بتا دیجیے کہ میں نے کیا گناہ کیا ہے۔ میرے ایک دوست شادی کرنا چاہتے تھے۔ جس سے شادی کرنا چاہتے تھے وہ راضی تھی۔ میں نے دونوں کی مدد کر دی تو اس میں برائی کیا ہے؟''

زاہد صاحب مجھ پر بوکھلا سے گئے۔ بہت دیر تک گھورتے رہے اور جب کوئی جواب بن نہیں پڑا تو ''لاحول ولا قوۃ! لاحول ولا قوۃ!'' کرتے ہوئے چلے گئے، مگر رامپور کے ایک صاحب جو اپنی خفیہ فروشیوں (اسمگلنگ) اور عشق بازیوں کے لیے مشہور تھے، کھڑے ہو گئے۔ ان کی آنکھوں سے شعلے اور منھ سے جھاگ نکل رہے تھے۔ بالکل ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے نسیم ان کی بیوی تھی جسے میں نے اغوا کر کے شمیم جے پوری کے حوالے کر دیا تھا۔ ان کا بس چلتا تو وہ اپنے رامپوری چاقو سے میرے تین چار ٹکڑے تو کر ہی دیتے۔ ان نامنہاد عاشق صاحب کا انتقال ابھی چند دنوں پہلے ہوا ہے اور مرتے مرتے بھی کبھی انھوں نے مجھ سے سیدھے منھ بات نہیں کی کیونکہ بقول ان کے، میں نے ان کی محبوبہ کو بھگا دینے کا ناقابل معافی جرم کیا تھا۔

دوسرے دن صبح ناشتے پر زاہد صاحب نے بڑے رازدارانہ انداز میں پوچھا، ''شمیم اسے کہاں لے گیا ہے؟''

''مجھے نہیں معلوم۔'' میں نے عرض کیا۔

''شمیم نے بہت ... یہ... لاحول ولا قوۃ...'' میں چپ چاپ ناشتہ کرتا رہا۔ ''تمھاری اس سے ملاقات تو ضرور ہوگی، دوست ہے تمھارا...''

''جی... شاید...''

''نسیم سے پوچھنا...'' انھوں نے میری طرف جھک کر آہستہ سے کہا، ''شمیم آس پاس نہیں ہو تو پوچھنا... وہ گانا بند تو نہیں کر دے گی؟... بڑی اچھی آواز ہے اس کی۔''

میں دل ہی دل میں بہت زور سے ہنسا۔ ''اوہو... تو ان کا دکھ یہ ہے کہ نسیم بھی وہی نہ کرے جو اختری نے کیا۔''

میں اکثر حیران ہوتا تھا کہ یہ خلافت ہاؤس اور روزنامہ خلافت کا سارا کارخانہ چل کیسے رہا

ہے۔ 20x30 سائز کے چار صفحات کا اخبار روزانہ چھپتا تھا مگر اس میں اشتہارات برائے نام ہی ہوتے تھے۔ کچھ فلمی اشتہارات کبھی کبھی آجاتے تھے مگر وہ بھی روپے دو روپے کالم انچ کے ریٹ پر ملتے تھے، اور اس میں سے پچاس فیصدی وہ چور مشتہرین لے لیا کرتے تھے جو اردو اخبارات کو لوٹ کر اپنے بنگلے کھڑے کر رہے تھے۔ اخبار کے خریدار بھی بس نام ہی کے تھے۔ میں نے روزنامہ خلافت کو ڈھائی تین سو سے زیادہ چھپتے نہیں دیکھا جبکہ دیگر کئی خبارات کی تعداد اشاعت ہزاروں میں تھی۔ دوسرے ذرائع آمدنی بھی محدود تھے۔

خلافت ہاؤس میں جو لوگ رہا کرتے تھے وہ کہنے کو کرائے دار تھے مگر کسی کا کرایہ تیس یا چالیس روپے ماہوار سے زیادہ نہ تھا، اور وہ بھی کبھی کبھار ہی ملتا تھا۔ جہاں تک زاہد صاحب کی ذات کا تعلق ہے، بظاہر ان کی بھی کوئی آمدنی نہیں تھی، مگر اللہ مسبب الاسباب ہے اور زاہد صاحب کے معاملے میں اللہ نے بہت سے صاحب اسباب کو ان کا ہمدرد اور مددگار بنا دیا تھا۔

جے جے اسپتال کے پاس پاک موڈیا اسٹریٹ میں ایک حاجی ہوٹل ہوا کرتا تھا۔ اس کے مالک حاجی صاحب مرحوم کی خلافت اور علی برادران سے ایسی عقیدت تھی کہ مثال نہیں مل سکتی۔ اس ہوٹل سے دونوں وقت ایک بڑا سا ناشتے دان بھر کے آیا کرتا تھا، جس میں اتنا کھانا ہوتا تھا کہ زاہد صاحب، ان کے مہمانوں اور نوکروں کے کھانے کے بعد بھی بچ جایا کرتا تھا۔ میں نے ایسی بے لوث اور خاموش خدمت نہ اس سے پہلے دیکھی اور نہ اس کے بعد۔ حاجی ہوٹل سے کھانا آنے کا سلسلہ زاہد صاحب کے بعد عابد شوکت علی کی حیات تک جاری رہا۔ دیگر اخراجات کہاں سے پورے ہوتے ہیں، یہ راز اس وقت کھلا جب مجھے خلافت سے پہلی بار نکالا گیا۔

خلافت کے ایڈیٹر سید نور الحسن اکثر بیمار رہا کرتے تھے اور کئی کئی دن دفتر نہیں آتے تھے۔ ایسے موقعوں پر مجھے اپنے ہاتھ آزمانے اور جوہر دکھانے کا موقع مل جاتا۔ میں خبروں کا ترجمہ بھی کرتا، سرخیاں بھی طے کرتا اور اداریہ بھی لکھ ڈالتا۔

ایسا ہی کوئی موقع تھا جب میں نے خود کو ایک ذمے دار اور صاحب رائے صحافی ثابت کرتے ہوئے وہ اداریہ لکھا۔

ہندوستان میں سعودی عرب کے سلطان ابن سعود تشریف لانے والے تھے۔ اخباروں میں ان

کی رنگین تصویروں کے ساتھ "اہلاً وسہلاً مرحبا" کے اشتہارات شائع کیے جارہے تھے۔ میں نے قلم اٹھایا اور مولانا محمد علی کی ایک لازوال تقریر کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا کہ مولانا نے زندگی بھر اس غیر اسلامی تصور کی مخالفت کی جس میں باپ کے بعد بیٹا تخت نشین ہوتا ہے اور خود کو شہنشاہ، بادشاہ یا سلطان کہہ کر اسلامی جمہوری نظام کا مذاق اڑاتا ہے جیسا کہ سعودی عرب میں اڑایا جارہا ہے۔ مضمون کی ہر سطر میری بے پناہ نفرت کا اظہار کرتی تھی جو مجھے ہر اس نظام سے تھی، اور ہے، جس میں انسان کی فطری آزادی کا احترام نہیں کیا جاتا۔ میں نے اداریہ کئی بار پڑھا اور دل ہی دل میں اپنی کمر ٹھونک کر سونے چلا گیا۔

دوسرے دن زاہد صاحب کی گرج دار آواز سے آنکھ کھلی جو اپنی کھڑکی میں کھڑے ہوئے میرا نام لے لے کر چلا رہے تھے اور للہ کو گالیاں دے رہے تھے کہ وہ مجھے جگاتا کیوں نہیں۔

میں اٹھا۔ جلدی جلدی منھ دھویا اور جیسے ہی اوپر پہنچا تو زاہد صاحب دروازے ہی میں کھڑے تھے۔ خلافت ان کے ہاتھ میں تھا۔ سرخ آنکھوں سے چنگاریاں نکل رہی تھیں اور سارا بدن کانپ رہا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی انھوں نے اخبار میرے منھ پر پھینک دیا اور دہاڑ کر بولے: "تم سالے حرامزادے، کمینے!... جس تھالی میں کھاتے ہو، اسی میں چھید کرتے ہو... نکل جاؤ... ابھی، اسی وقت منھ کالا کرو، ورنہ پولیس کے حوالے کردوں گا۔"

میری سمجھ میں نہیں آیا کہ میں نے ایسا کیا کردیا ہے جس پر یہ آپے سے باہر ہورہے ہیں۔ پوچھنے کی کوشش کی تو وہ اور بھڑک گئے:

"للہ حرامزادے، سالے کہاں مرگیا... نکال... اس کا سامان نکال... فٹ پاتھ پر رکھ دے... گیٹ آؤٹ... آئی سے، گیٹ آؤٹ..."

زاہد صاحب جس موڈ میں تھے اس میں بات کرنا بیکار تھا۔ میں نے اپنا سامان اٹھایا اور ایک دوست کے گھر میں لے جاکر رکھ دیا۔ بعد میں کالا چوکی میں میونسپلٹی کے ایک صفائی والے نے اپنے گھر کا ایک کمرہ دے دیا تو وہاں رہنے لگا، مگر خلافت ہاؤس نہیں گیا۔

بہت دن بعد خلافت کے منیجر محمد عالم نے ایک ملاقات میں بتایا کہ خلافت اخبار، خلافت ہاؤس اور خود زاہد صاحب اس امداد پر زندہ ہیں جو سعودی عرب سے آتی ہے۔

میں نے اپنا سر پکڑ لیا۔ ہائے غضب! یہ تو ہونا ہی تھا۔ انجانے میں شیر کی دم پر پاؤں جو رکھ دیا

Scanned with CamScanner

خلافت چھوڑنے کے بعد میں نے ہندوستان، اقبال اور انقلاب میں کام کیا اور ڈر کے مارے کسی ایسے جلسے میں کبھی نہیں گیا جہاں زاہد صاحب آنے والے ہوتے تھے۔ ان کا کیا بھروسا، بھری محفل میں پھر ذلیل کر ڈالیں تو؟... مگر ایک دن جب سنا کہ دل کا دورہ پڑا ہے اور اسپتال میں ہیں تو جی نہیں مانا اور دیکھنے کے لیے چلا گیا۔

اسپتال کے ایک خاموش اور اداس کمرے میں آنکھیں بند کیے لیٹے تھے۔ کافی دبلے ہو گئے تھے اور بال پہلے سے کم تھے۔ میں سرھانے بیٹھ گیا اور سوچنے لگا کہ پاکستان جا کر محمد علی شوکت علی کے نام سے ہزاروں افراد نے فائدہ اٹھایا، مگر یہ شخص جو سچ مچ علی برادران کا وارث اور ان کی یادگار ہے، یہاں اکیلا اور بے سہارا پڑا ہوا ہے۔ اگر یہ بھی پاکستان میں ہوتے تو شاید آج میری جگہ پاکستان کا صدر یا وزیر اعظم بیٹھا ہوتا۔ مگر انھوں نے تو اپنے بیوی بچوں، دوستوں اور رشتے داروں کو سب کو چھوڑ دیا، تا کہ اس امانت کی حفاظت کر سکیں جو ان کے بزرگ سونپ کر گئے تھے

میں نے بڑے پیار سے ان کے سر پر ہاتھ پھیرا تو آنکھیں کھول دیں۔ مجھے دیکھا تو مسکرائے اور میرا ہاتھ اپنے ٹھنڈے ہاتھ میں دبا لیا۔ سوکھے ہونٹ کھلے اور مدھم آواز سنائی دی:

''اتنے دن تک مجھے دیکھنے بھی نہیں آیا؟... اپنے بڑوں سے اس طرح ناراض ہوتے ہیں کیا؟''

کہتے کہتے ان کی آنکھیں بھر آئیں۔ میں تو پہلے ہی بھرا بیٹھا تھا، میرا باندھ بھی ٹوٹ گیا۔ جب روتے سے دل ہلکا ہوا تو میں نے پوچھا: ''ڈاکٹر کیا کہتا ہے؟''

مسکرائے اور بولے: ''ابھی نہیں مروں گا۔''

میں نے ان کا ماتھا چوما اور کہا: ''میں مرنے بھی نہیں دوں گا۔''

دوسرے دن میں نے سامان اٹھایا اور خلافت ہاؤس پہنچ گیا۔ وہاں ہر چیز وہیں تھی جہاں چھوڑ کے گیا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ بیچ میں وہ تین سال جو باہر گزرے، کبھی آئے ہی نہیں تھے۔ میں نے بھی کہانی پھر وہیں سے شروع کر دی جہاں چھوڑی تھی۔

آج جب میں سوچتا ہوں تو ایسا لگتا ہے جیسے ان کی شخصیت کا خمیر تضادات سے اٹھایا گیا تھا۔ ان کی بے جگری کا عالم یہ تھا کہ جب ایک پارٹی میں ان کا سامنا ریاست بمبئی کے وزیر اعلیٰ مرار جی

Scanned with CamScanner

ڈیسائی سے ہوا، مرار جی نے اپنا ہاتھ بڑھایا تو زاہد صاحب نے ہاتھ نہیں ملایا۔ بہت سے لوگوں نے ان کی یہ حرکت دیکھ لی تھی۔ مشہور لیڈر مصطفیٰ فقیہ، جنھوں نے مجھے یہ واقعہ سنایا تھا اور جو زاہد صاحب کے دوست تھے، سب کچھ دیکھ رہے تھے۔ انھوں نے دھیرے سے کہا، ''زاہد بھائی، آپ نے اچھا نہیں کیا۔ مرار جی کیسا آدمی ہے، آپ تو جانتے ہیں نا۔''

''جانتا ہوں مرار جی کیسا آدمی ہے،'' زاہد صاحب نے تڑ سے جواب دیا۔ ''اس کے ہاتھوں پر ہزاروں بے گناہوں کا خون ہے۔ اس سے ہاتھ کیسے ملا سکتا ہوں۔''

زاہد صاحب کو مرار جی سے ہاتھ نہ ملانے کی بہت بھاری قیمت ادا کرنی پڑی۔ اخبار کے تمام سرکاری اشتہارات بند کر دیے گئے، کاغذ کا کوٹہ بھی آدھا کر دیا گیا، اور انکم ٹیکس والوں نے مہینوں پریشان کیا اور درجنوں الماریوں پر سیل لگا کے چلے گئے۔ کئی برس کے بعد پنڈت نہرو کو ان حالات کی خبر ملی اور انھوں نے مداخلت کی تو زاہد صاحب کی جان چھوٹی اور کچھ اشتہارات بھی ملنے لگے جو پہلے سے بہت کم تھے۔ مگر کتنی حیرت کی بات ہے کہ اتنا باہمت آدمی چوہے سے ڈرتا تھا۔

خلافت ہاؤس میں چوہے بہت تھے اور دن میں بھی دندناتے پھرتے تھے، اور وہ بھی بڑے والے جنھیں بمبئی کی زبان میں گھونس کہا جاتا ہے۔ یہ چوہے سائز میں بلی سے بھی بڑے ہوتے ہیں اور کچی مٹی میں بل بنا کر رہتے ہیں۔ زاہد صاحب اتنا ڈرتے تھے کہ چوہا سامنے سے گزرتا تو نماز پڑھنا چھوڑ کے چیخنا چلانا شروع کر دیتے: ''ابے لالہ، ابے ولی، ابے شاہ محمد، کہاں مر گئے حرامزادو، جلدی آؤ، مارو، مارو، جانے مت دینا سالے کو...'' اور پلنگ پر کھڑے ہو کر اس وقت تک چیختے رہتے جب تک چوہا بھاگ نہ جاتا یا ڈنڈے مار کر بھگا نہ دیا جاتا۔

تندوری کیک اور رتنا گیری آموں سے ان کا عشق تھا۔ ذیابیطس ورثے میں ملا تھا اور ڈاکٹروں نے میٹھا کھانے کی سخت ممانعت کر رکھی تھی۔ زاہد صاحب ان ہدایات پر نہایت سختی سے عمل بھی کیا کرتے تھے، مگر چھ مہینے۔ آم کے بے حد شوقین بلکہ دیوانے تھے۔ بمبئی میں مارچ کے مہینے میں رتنا گیری اور گواسے الفانسو آنا شروع ہو جاتا۔ جیسے ہی مارچ شروع ہوتا، زاہد صاحب لالہ کو دوڑاتے۔ ''جاؤ ذرا دیکھ کے تو آؤ، ہاپوس (الفانسو) آیا کہ نہیں۔'' اور جب لالہ فصل کا پہلا آم لے کر آتا تو وہ بالکل اس طرح خوش ہوتے جیسے کسی بچے کو چاکلیٹ مل گیا ہو۔ آم پر ہاتھ پھیرتے، اس کی خوشبو سونگھتے، اس کے

Scanned with CamScanner

رنگ اور ذائقے کی تعریفیں کرتے اور اس قدر مزے لے لے کر کھاتے تھے کہ ہنسی آنے لگتی تھی۔ اکثر ایسا ہوتا تھا کہ صبح ناشتے کی جگہ آم، دوپہر کھانے کے بدلے آم اور رات کا کھانا ہوتا تھا رومالی روٹی اور آم۔ رومالی روٹی کا باسی ہونا ضروری تھا۔ کہتے تھے، ''تازہ روٹی آم کے ذائقے کو ختم کر دیتی ہے۔'' اور یہ سلسلہ چلتا تھا اگست تک۔ جب اچھی نسل کے سارے آم ختم ہو چکے ہوتے تو ریشوں سے بھرا ہوا موٹی کھال والا تو تا پری بھی کھا لیا کرتے تھے۔

ایک دن میں نے کہا، ''آپ کو معلوم ہے نا، غالب بھی آم کے بے حد شوقین تھے۔'' بولے، ''اسی لیے تو اتنے اچھے شعر کہا کرتے تھے۔''

اس میں کوئی شک نہیں کہ زاہد صاحب کھانے کے بے حد شوقین تھے لیکن کھلانے کے بھی اتنے ہی شوقین تھے۔ وہ محفلِ یاراں جو خلافت ہاؤس کے کمپاؤنڈ میں سجا کرتی تھی، کھانے پر ہی ختم ہوتی تھی۔ میز پوش بچھائے جاتے، چٹائیں لگائی جاتیں، حاجی ہوٹل سے لایا ہوا کھانا چن دیا جاتا اور زاہد صاحب سب کو بڑے اصرار اور محبت سے کھلاتے۔ ان کھانے والوں میں کچھ افراد ایسے بھی تھے جو صرف کھانا کھانے آیا کرتے تھے۔ ایک صاحب تو دونوں وقت آتے تھے۔ خود کو وکیل کہتے تھے مگر پتا نہیں کتنے سال سے کسی عدالت کا منھ نہیں دیکھا تھا۔ ڈیڑھ دو بجے کے قریب داخل ہوتے، زاہد صاحب کی خیر خیریت معلوم کرتے، کچھ سیاسی اور سماجی خبروں پہ تبصرہ کرتے اور جب کھانا لگتا تو ہاتھ دھو کر اس طرح بیٹھ جاتے جیسے دعوت میں آئے ہوں۔ مجھے اس آدمی کی بھونڈی اور جھوٹی باتیں کبھی اچھی نہیں لگیں۔ ایک دن میں نے کہا، ''آپ اس آدمی کو منھ مت لگایا کیجیے۔ بالکل بیکار اور جھوٹا آدمی ہے، صرف کھانا کھانے کے لیے آتا ہے۔''

زاہد صاحب مسکرائے اور بولے، ''مجھے معلوم ہے۔ مگر تمھیں یہ نہیں معلوم ہے کہ اس کے پاس کوئی کام نہیں ہے اور بھائیوں نے گھر سے نکال دیا ہے۔''

ان کا دل سچ مچ بہت بڑا تھا۔ خلافت ہاؤس میں چھ خاندان رہا کرتے تھے، جن میں پانچ ایسے تھے جن کا کوئی تعلق نہ خلافت ہاؤس سے تھا، نہ خلافت کی تحریک سے، نہ خلافت اخبار سے اور نہ زاہد صاحب کی ذات سے۔ ان خاندانوں کے وہاں ہونے کی وجہ صرف ایک ہی تھی: زاہد صاحب کی دریا دلی۔ باقی لوگوں کے بارے میں تو میں کچھ نہیں جانتا مگر زاہد صاحب نے جو سلوک ارشاد علی

صاحب اور ان کی فیملی کے ساتھ کیا اس کا چشم دید گواہ ہوں۔

ارشاد علی صاحب زاہد صاحب کے ہم وطن تھے اور دوست بھی، اور ان کی بیگم، جو پارسی سے مسلمان ہوئی تھیں، جنھیں مولانا شوکت علی نے کلمہ پڑھایا تھا اور اپنی بیٹی کہا تھا، زاہد صاحب کی منھ بولی بہن تھیں۔ یہ ارشاد علی صاحب اپنے بچوں کے ساتھ ویرار کے ایک بہت بڑے بنگلے میں رہا کرتے تھے مگر حالات کچھ ایسے ہوئے کہ بنگلہ بک گیا اور سر چھپانے کے لیے کوئی جگہ نہ ملی۔ زاہد صاحب کو معلوم ہوا تو خلافت ہاؤس کا ایک کمرہ، جس میں اخبار کا ریکارڈ رکھا جاتا تھا، صاف کرا کے رہنے کے قابل بنایا گیا اور ارشاد علی صاحب کے حوالے کر دیا گیا۔ زاہد صاحب نے اپنے دوست اور منھ بولی بہن سے کبھی کوئی کرایہ نہیں مانگا۔ کئی سال بعد جب چیریٹی کمشنر نے اعتراض کیا تو پچاس روپے مہینے کی معمولی رقم کرایہ کے طور پر وصول کی جانے لگی۔ یہ وہی ارشاد علی صاحب ہیں جن کی بیٹی فریدہ میری شریک حیات ہیں اور یہ خاندان آج تک خلافت ہاؤس میں رہتا ہے۔

فریدہ سے میری شادی کا قصہ بھی کافی دلچسپ ہے اور زاہد صاحب کے کردار پر کچھ اور روشنی ڈالتا ہے۔ ہوا یوں کہ میری اور فریدہ کی شادی تو ہوئی مگر ان کے گھر والوں کی مرضی کے خلاف ہوئی۔ چنانچہ شکایت زاہد شوکت علی صاحب تک پہنچی اور انھوں نے وہی کیا جو انھیں کرنا چاہیے تھا۔ مجھے بلایا اور جتنا برا بھلا کہہ سکتے تھے کہا اور فرمایا: "بزرگوں کی مرضی کے بغیر شادی کرنا ناقابل معافی جرم ہے، اس لیے تمھیں یہاں رہنے کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔" اور اس طرح ایک بار پھر مجھے خلافت ہاؤس سے نکال دیا گیا۔ کچھ عرصے بعد جب فریدہ کے والدین اپنی بیٹی کی ضد کے سامنے جھک گئے اور یہ طے پایا کہ اب اس شادی کو منظر عام پر لایا جائے تو ایک استقبالیہ کا بندوبست کیا گیا۔ تب اچانک زاہد صاحب کا پیغام مجھے ملا۔ لالہ ڈھونڈتا ہوا آیا اور اپنے مخصوص انداز میں بولا: "ارے سالا، تم ادھر رہتا ہے! ہم ڈھونڈ ڈھونڈ کے مر گیا۔ چلو، تم کو ساب بلاتا ہے۔"

پہلے تو دل چاہا کہ ٹال کر جاؤں مگر یہ سوچ کر کہ خلافت ہاؤس تو اب سسرال بن چکا ہے، وہاں تو جانا ہی پڑے گا، میں ڈرتے ڈرتے سلام کو حاضر ہوا۔

بہت اچھے موڈ میں تھے۔ مجھے دیکھ کے مسکرائے اور آنکھیں چمکا کے بولے، "آؤ آؤ دولہا میاں، بھئی تم تو بڑے چھپے رستم نکلے۔ لونڈیا کا دل جیت لیا اور کسی کو پتا بھی نہیں چلا!" میں سر جھکائے

Scanned with CamScanner

کھڑا رہا۔ "اچھی لڑکی ہے۔ تمھیں روٹی کی تکلیف کبھی نہیں ہوگی۔ ماموں (ارشاد علی صاحب) کہہ رہے تھے کہ ایک ریسپشن ہونا چاہیے۔ کیا انتظام کیا ہے تم نے؟"

"کوئی خاص انتظام تو نہیں ہے۔ زیور کپڑا تو ہو گیا ہے۔ سلطانہ آپا کہہ رہی تھیں کہ وہ ریسپشن کے لیے صابو صدیق میں ہال دلوا دیں گی۔"

"کھانا وانا رکھو گے کہ نہیں رکھو گے؟"

"جی، ابھی تو نہیں کہہ سکتا۔ اگر پیسے کا بندوبست ہو گیا تو کھانا بھی ہو جائے گا۔"

انھوں نے بڑی محبت سے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ "ہو جائے گا ہو جائے گا، سب ہو جائے گا۔"

اس کہانی کا سب سے مزے دار پہلو یہ ہے کہ زاہد صاحب کو اس بات پر کوئی اعتراض نہیں تھا کہ میں نے اس لڑکی سے شادی کر لی جسے میں چاہتا تھا: انھیں تو اس بات پر غصہ تھا کہ ان کی ناک کے نیچے عشق و محبت کی اتنی بڑی واردات ہوئی اور انھیں کانوں کان خبر نہ ہوئی۔

اور پھر یوں ہوا کہ وہ زاہد صاحب جنھوں نے اپنی مرضی سے شادی کرنے کے جرم میں گھر سے نکال دیا تھا نہ صرف یہ کہ اپنے تمام دوستوں کے ساتھ ریسپشن میں شریک ہوئے بلکہ ایک شاندار ڈنر بھی دیا، جو حاجی ہوٹل سے نہیں آیا تھا، اور ایک لفافہ بھی جس میں پانچ سو ایک روپے تھے۔

وہ لوگ جو زاہد صاحب کو قریب سے نہیں جانتے، ان کے بارے میں اچھی رائے نہیں رکھتے۔ عام خیال یہ تھا کہ وہ ایک اوباش، دل پھینک اور ناکارہ سے آدمی ہیں جنھیں محفل آرائی اور یارباشی کے سوا کچھ نہیں آتا اور جو باپ اور چچا کا نام بدنام کر رہے ہیں۔ مگر میں برسوں تک ان کے بے حد قریب رہا ہوں اور دعوے کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ وہ اوباش، آوارہ یا ناکارہ نہیں تھے۔

اگر زاہد صاحب کو ایک لفظ میں بیان کرنے کی کوشش کی جائے تو وہ لفظ ہوگا "حسن پرست۔" مگر یہ سمجھنا غلط ہوگا کہ زاہد صاحب کی حسن پرستی صرف حسین چہروں تک ہی محدود تھی۔ غالب نے کہا تھا:

ہر بوالہوس نے حسن پرستی شعار کی
اب آبروئے شیوۂ اہلِ نظر گئی

Scanned with CamScanner

زاہد صاحب اہلِ نظر تھے، بوالہوس نہیں۔ ان کی حسن پرستی کا دائرہ بہت وسیع تھا۔ حسین چہرے ہوں یا اچھی آواز ہو یا کسی پھول یا عطر کی خوشبو ہو یا آم کی رنگت، وہ ان سب سے پیار کرتے تھے اور بہت پیار کرتے تھے۔ رہ گئی باپ اور چچا کی بدنامی کی بات، تو وہ اس حد تک صحیح ہے کہ زاہد صاحب وہ امیج نہیں بنا سکے جو علی برادران کے ماننے والے دیکھنا چاہتے تھے۔ انھوں نے اپنی زندگی کے لیے جو اصول بنائے تھے وہ ان کے اپنے بنائے ہوئے تھے اور وہ ساری زندگی انھیں اصولوں کے سہارے جیتے رہے۔ وہ اصول صحیح تھے یا غلط، اس کا فیصلہ جنھیں کرنا ہے وہ کریں، میں تو اتنا جانتا ہوں کہ ہر شخص کو اپنی زندگی اپنے طریقے سے جینے کا حق حاصل ہے۔

زاہد صاحب کو وہ مقام کبھی نہیں مل سکا جس کے وہ مستحق تھے اور نہ انھوں نے کوشش کی۔ مسلمانوں کے کسی بھی طبقے نے انھیں اپنا لیڈر نہیں مانا۔ وجہ یہ نہیں تھی کہ ان میں لیڈری کی صلاحیت نہیں تھی۔ انھیں اپنی قوم کی کمزوریوں کا احساس بھی تھا اور درد بھی، مگر کامیاب لیڈر بننے کے لیے جس ریاکاری کی ضرورت ہوتی ہے وہ ان میں نہیں تھی۔ وہ بے حد منھ پھٹ تھے اور انھیں لفظوں کا جال بننا بھی نہیں آتا تھا۔ مگر پھر بھی ان کی شخصیت میں کوئی نہ کوئی ایسی بات ضرور تھی کہ لوگ ملنے کے لیے کھنچے چلے آتے۔ اور ان میں چھوٹے بڑے، امیر غریب، ادیب شاعر اور بزنس مین وخفیہ فروش بھی ہوا کرتے تھے۔

بہت ہی کم لوگوں کو یہ بات معلوم ہے کہ وہ زاہد شوکت علی جن کی محفلوں اور مجلسوں کے چرچے ہوا کرتے تھے، اندر سے بہت اکیلے اور بالکل تنہا تھے۔ اور وہ ساری ہنگامہ آرائی اصل میں ایک چادر تھی جس میں وہ اپنے سائیں سائیں کرتے اکیلے پن سے ڈر کے چھپ جایا کرتے تھے۔ کہنے کو ان کی بیوی بھی تھیں، ایک بیٹا بھی تھا، ایک بھائی بھی تھے، مگر یہ سب ان سے بہت دور تھے۔ جسمانی طور پر بھی اور ذہنی اعتبار سے بھی۔

زہرا بیگم ان کی چچا زاد بہن بھی تھیں۔ دونوں کا بچپن ساتھ ہی گزرا تھا مگر مزاجوں میں اتنا فرق تھا کہ کبھی بنی ہی نہیں، نہ شادی سے پہلے، نہ شادی کے بعد۔ بیگم زہرا زاہد علی مولانا محمد علی کی لاڈلی بیٹی تھیں، اور یہ بات وہ کبھی نہیں بھولتی تھیں، نہ دوسروں کو بھولنے دیتی تھیں۔ ان کی چال ڈھال، بات چیت اور ملنے جلنے کی ہر ادا میں ان کا غرور بار بار اپنی جھلک دکھلاتا رہتا تھا۔ ان کے نزدیک علی برادران کے بعد اگر کوئی اس قابل تھا جو ان کی عنایت اور نوازش کا حقدار تھا تو وہ ہستی تھی ان کے

Scanned with CamScanner

اکلوتے بیٹے طارق علی کی۔ اوران کے بعد طارق علی کے دو بیٹوں کی، جن کے نام شوکت علی اور محمد علی رکھے گئے تھے۔ باقی جتنے بھی تھے وہ اتنے حقیر تھے کہ ایک نظر عنایت کے مستحق بھی نہیں تھے۔

رنگ نہایت گورا بلکہ سفید تھا۔ چہرہ چوڑا، قد چھوٹا تھا۔ چوڑائی اتنی زیادہ تھی کہ ہوائی جہاز کی دو سیٹیں بک کی جاتی تھیں۔ عام طور پر سفید کپڑے پہنا کرتی تھیں۔ چنا ہوا دوپٹہ، کرتا اور غرارہ۔ زاہد صاحب انھیں ''سفید گدھی'' کہا کرتے تھے۔ شوہر اور بیوی کے تعلقات کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ آزادی سے پہلے رامپور میں رہا کرتی تھیں اور زاہد صاحب بمبئی میں۔ جب پاکستان بنا تو اپنے بیٹے طارق کو لے کر کراچی چلی گئیں اور آخر وقت تک وہیں رہیں۔ ایک دو بار آئیں بھی تو مہمانوں کی طرح رہیں اور انھیں کی طرح رخصت ہو گئیں۔

زاہد صاحب کے ایک بھائی بھی تھے، عابد شوکت علی صاحب، جو بچپن ہی میں گھر سے بھاگ گئے تھے اور ساری زندگی رنگون اور کلکتہ میں رہے۔ اور جب بہت کہنے سننے پر بمبئی آئے تو جب آئے جب زاہد صاحب کا آخری وقت تھا۔ زاہد صاحب کو اپنے پوتوں شوکت اور محمد سے بہت محبت تھی۔ انھیں بار بار بلاتے تھے، مگر وہ ایک بار آئے اور پھر کبھی آنے کی اجازت نہیں ملی۔

ایک ایسا شخص جس کے پاس کوئی بھی اس کا اپنا نہ ہو، بیگانوں کو نہ اپنائے تو کیا کرے۔

اس دن بھی زاہد صاحب بالکل اکیلے تھے جب ان پر دل کا آخری دورہ پڑا۔ درد اٹھا تو نماز پڑھ رہے تھے۔ سجدے میں سر رکھا اور وہیں ختم ہو گئے۔

زاہد صاحب نہیں رہے۔ ہندوستان میں خلافت کا نام لینے والا بھی کوئی نہیں رہا۔ ایک دن یہ خلافت ہاؤس بھی ختم ہو جائے گا مگر خلافت کے دروازے پر حافظ کا جو شعر لکھا ہوا ہے وہ کچھ اور کہتا ہے:

ہرگز نمیرد آں کہ دلش زندہ شد بہ عشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

(جس کے دل میں عشق زندہ ہو وہ کبھی نہیں مرتا / دنیا کی کتاب میں لکھا ہوا ہے کہ میں لافانی ہوں)

❁❁

Scanned with CamScanner

کرسی خالی ہے!

نیا نیا آیا تھا۔ بمبئی اچھی بھی لگتی تھی اور اجنبی بھی۔ چھوٹی چھوٹی گلیوں کی عادی آنکھوں نے جب چوڑی چوڑی سڑکوں کو دیکھا تو سہم سی گئیں اور ایسے موقعوں پر جو ہوتا ہے وہ ہونے لگا۔ بھیڑ میں آشنا چہرے اور مانوس نام ڈھونڈنے لگا۔ اس زمانے میں خلافت ہاؤس میں، جہاں میں رہتا بھی تھا اور جہاں سے شائع ہونے والے اخبار روزنامہ خلافت میں کام بھی کرتا تھا، ایک صاحب آیا کرتے تھے، جن کا نام تھا عاشق حسین ڈکارو۔ پتلے دبلے، لمبے سے، چھوٹی چھوٹی تیز آنکھیں، اندر کو دھنسے ہوئے گال، بڑا سا دہانہ۔ عام طور پر لمبی سفید شیروانی پہنا کرتے تھے اور سر پہ گاندھی ٹوپی رہتی تھی جو کبھی کبھی رامپوری ٹوپی میں بھی بدل جاتی تھی۔ ہاتھ میں چمکتا ہوا کتھئی رنگ کا ایک بید ہوتا تھا جس کے ہینڈل پر چاندی چڑھی ہوئی تھی۔ آواز بڑی پاٹ دار تھی۔ خلافت کے دروازے سے آواز لگاتے تھے تو پہلی منزل تک گونج جایا کرتی تھی۔ لب و لہجہ رامپور کے اکھڑ پٹھانوں جیسا تھا۔ اور گالیاں تو ماشاء اللہ... جملوں کے بیچ میں اس طرح آجاتی تھیں جیسے دودھ پر بالائی آجاتی ہے۔ کبھی کبھی تو جملوں کی ضرورت بھی نہیں ہوتی تھی، گالیوں ہی سے کام چل جاتا تھا۔ ان سے پوچھیے تو وہ کہتے تھے، ''ڈکارو تخلص ہے اور مزاحیہ شاعری کرتے ہیں۔'' جبکہ حقیقت یہ تھی کہ جب عالمگیر کا قورمہ اور حاجی ہوٹل کی بریانی کھا کر ڈکار لیتے تھے تو چوپائے بھی چونک جایا کرتے تھے۔

انھیں جب معلوم ہوا کہ میں بھی رامپور سے وارد ہوا ہوں، تو خاص طور سے ملنے کے لیے آئے۔ اپنا سر ٹیڑھا کر کے مجھے سر سے پاؤں تک دیکھا۔ آنکھوں میں ہنسی بھی تھی اور محبت بھی، جیسے ایک ہی وقت میں مذاق بھی اڑا رہے ہوں اور رحم بھی آ رہا ہو۔ میرا حال پوچھا، بمبئی میں آنے کی وجہ پوچھی اور جب شجرے پہ پہنچے تو چونک کر بیٹھ گئے۔ کپ کی چائے ساسر میں ڈال کر پی رہے تھے، وہ میز

Scanned with CamScanner

پر رکھ دی، اور قدرے گرم جوشی سے بولے: "ارے اس کی ماں کی... تم شجاعت بھائی کے بیٹے ہو؟"

میں نے سر ہلا دیا تو آواز دبا کر کہنے لگے: "شیخ جی، تم غلط جگہ آ گئے ہو۔ ایک تو یہ کہ یہ اخبار خلافت کچھ چلتا چلاتا نہیں ہے۔ بس جو پرانے ہیں وہی پڑھتے ہیں۔ دوسری بات زاہد شوکت علی صاحب، جو روزنامہ خلافت کے مالک اور ایڈیٹر ہیں، تولہ ماشہ قسم کے آدمی ہیں۔ مہربان ہیں تو ٹھیک ہے، ناراض ہوئے تو تمھارا ٹین کا بکسا باہر پھکوا دیں گے۔ اگر صحافت ہی کرنی ہے تو انقلاب میں جاؤ یا ہندوستان میں..."

میں نے کہا: "دوسرے اخبار میں گیا تو رہوں گا کہاں؟"

فرمایا: "گرانٹ روڈ پر میرا کمرہ ہے۔ جگہ چھوٹی ہے، میرے دو بھتیجے بھی میرے ساتھ رہتے ہیں مگر تم تو ڈیڑھ پسلی کے آدمی ہو، کہیں بھی فٹ ہو جاؤ گے۔ انقلاب والا انصاری تو میری صورت دیکھتے ہی بھڑک جائے گا۔ مگر آرزو صاحب اچھے آدمی ہیں، اور اپنے شہر والے بھی ہیں۔ کہو تو میں بات کروں؟"

میں نے عرض کیا: "ابھی تو سب ٹھیک ہے عاشق بھائی، کچھ گڑبڑ ہوئی تو آرزو صاحب کے پاس چلا جاؤں گا۔"

یہ پہلا موقع تھا جب میں نے آرزو صاحب کا نام سنا تھا۔ کچھ دن بعد انھیں دیکھا بھی۔ زاہد صاحب ان لوگوں میں سے تھے جو زندگی کا پورا مزہ لے کے جیتے ہیں، اس ندیدے بچے کی طرح جو آئس کریم کھاتا ہے اور جب آئس کریم ختم ہو جاتی ہے تو اس کی ڈنڈی چاٹنا بھی نہیں بھولتا۔ روز شام کو خلافت ہاؤس کے کمپاؤنڈ میں بچھی ہوئی لکڑی کی سفید بنچیں دھوئی جاتیں، کپڑے سے پونچھی جاتیں، ان کے سامنے میزیں لگائی جاتیں، ایک بڑا سا بلب روشن کیا جاتا اور زاہد صاحب کی محفل جمتی۔ واہ، کیا محفلیں تھیں' وہ کون سا نام والا تھا جو وہاں نہیں آتا تھا۔ ایسی ہی ایک محفل تھی جس میں آرزو صاحب پہلی بار نظر آئے۔

آرزو صاحب خوبصورت آدمی تھے، اور جوانی میں تو بہت ہی خوبصورت رہے ہوں گے۔ کوئی چھ فٹ کا قد، سرخ و سفید رنگ، ہلکے رنگ کی آنکھیں اور ہونٹوں پر پان کا لاکھا جو مسکرانے پر ہی دکھائی دیتا تھا، ایک ڈھیلی ڈھالی سی پتلون اور کچھ اسی قبیل کی بش شرٹ۔ آرزو صاحب دھیرے سے

Scanned with CamScanner

بولتے تھے اور بہت میٹھا بولتے تھے۔ میں نے ان کی اونچی آواز ایک دو بار سے زیادہ نہیں سنی۔

یہ سڑک جو آج کل مولانا آزاد روڈ کہلاتی ہے، کسی زمانے میں ریپن روڈ ہوا کرتی تھی۔ اردو کے دو اخباروں، خلافت اور اجمل، کو چھوڑ کے، سب کے دفاتر اسی سڑک پر تھے۔ یہیں سے انقلاب بھی نکلتا تھا، اقبال بھی، آج اور آشکار کے دفتر بھی یہیں تھے، اردو ٹائمز بھی یہیں سے شائع ہوتا تھا، بمبئی ویکلی اور کہکشاں بھی۔ اس سڑک پر سب سے پہلا دفتر ہندوستان کا تھا۔ روبیلکس ہوٹل کے اوپر لکڑی کی پرانی بالکنی میں سے روزنامہ ہندوستان کا بورڈ جھانکتا رہتا تھا۔ پان کی دکان کے برابر دروازہ تھا، لکڑی کی پرانی زمانہ دیدہ اور زخم خوردہ سیڑھیاں اوپر جاتی تھیں۔ دفتر میں تین کمرے تھے، جس میں سے ایک کمرے کو لکڑی کا پارٹیشن لگا کر دو کمرے بنا دیے گئے تھے۔ پہلے کمرے میں بہت سے کاتب تندہی سے زیر مشق کے اوپر، پیلے مسطر بچھائے کتابت کرتے دکھائی دیتے تھے۔ پارٹیشن کی دوسری جانب ایک بڑی سی میز کے پیچھے آرزو صاحب براجمان ہوتے تھے۔ ان کے داہنے ہاتھ پر ایک دروازہ تھا جو بالکنی میں نکلتا تھا اور جس کی ریلنگ میں سے سڑک پر دوڑتی بھاگتی زندگی ہر وقت دکھائی دیتی رہتی تھی۔

آرزو صاحب یہاں کب آئے تھے، انھوں نے یہ اخبار کب نکالا تھا، اس دفتر میں اس کرسی پر کب آ کر بیٹھے تھے، مجھے نہیں معلوم۔ میں تو بس اتنا جانتا ہوں کہ میں نے جب بھی انھیں دیکھا، یہیں دیکھا، اس پرانے نشانِ راہ کی طرح جو چپ چاپ سردی، گرمی، برسات جھیلتا رہتا ہے اور گزرنے والوں کو رستہ بتاتا رہتا ہے۔

میرا خیال ہے میں نے صحیح لفظ استعمال کیا۔ آرزو صاحب سچ مچ نشانِ راہ تھے۔ دنیا بدلی، سیاست بدلی، صحافت بدلی، صحافی بدلے، مگر آرزو صاحب کبھی نہیں بدلے۔

وہ جن اصولوں کو مانتے تھے ان پر آخر تک قائم رہے۔ وہ مارکسسٹ نہیں تھے مگر سرمائے کی ناہموار تقسیم کے خلاف تھے، ظلم و زیادتی اور استحصال کے خلاف ہمیشہ لڑتے رہے۔

ایک زمانے میں جب اردو اخباروں نے ان چور مشتہرین کے خلاف آواز اٹھائی جو کمپنیوں سے پورے پیسے لیتے تھے مگر اخباروں کو پچاس فیصد اور کبھی کبھی اس سے بھی کم دیتے تھے، تو آرزو صاحب وہ پہلے آدمی تھے جو اپنے اختلاف بھول کر ہر اردو اخبار کے دفتر میں گئے اور ہر اخبار والے کو

Scanned with CamScanner

راضی کیا کہ وہ متحد ہو کر مشتہرین کی دھاندلی کا مقابلہ کرے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہفتوں ہندوستان میں ایک بھی اشتہار نہیں چھپا۔ اور اشتہار کے بغیر اخبار نکالنا کتنا مشکل کام ہے، یہ کوئی اخبار والا ہی جان سکتا ہے۔ مگر آرزو صاحب ٹس سے مس نہ ہوئے اور بنی لاکھا کی مسکراہٹ کے ساتھ بار بار ایک ہی بات کہتے رہے: "اگر ہم میں اتنی دبا قی رہا تو چوروں کو گھٹنے ٹیکنے ہی پڑیں گے..." اور ہوا بھی وہی۔

آرزو صاحب کو اپنی زبان، اپنی تہذیب اور اپنے شہر سے بڑا پیار تھا۔ اردو کی بات ہوتی تو سنبھل کر بیٹھ جاتے۔ پرانی وضع داریوں کا ذکر آتا تو مسکراہٹ دور تک پھیل جاتی۔ اور کوئی رامپور کا نام لے لیتا تو آنکھوں میں ایسی چمک آتی جیسے کوئی تارا ٹوٹ گیا ہو۔ وہ انجمن رامپور کے صدر تھے اور آخر وقت تک رہے۔ یہ انجمن پتا نہیں کب بنی تھی، کس طرح بنی تھی اور اس کا دفتر کہاں تھا۔ مگر دو باتیں سب کو معلوم تھیں: ایک تو یہ کہ آرزو صاحب اس کے صدر ہیں، دوسری بات یہ کہ عاشق حسین ذکار واس کے سیکرٹری ہیں۔

کبھی کبھار رامپور کی کوئی بڑی ہستی بمبئی آتی تو انجمن کی طرف سے اسے ہار پھول پیش کیے جاتے، مگر اس کے علاوہ انجمن رامپور میں کوئی نقل و حرکت نہیں دیکھی جاتی تھی۔ انجمن کی اس حالت زار پر بمبئی میں رہنے والے کچھ رامپوری نوجوانوں کو غصہ آ گیا۔ انھوں نے ڈسمکر روڈ پر غنی خاں مرحوم کے گھر میں ایک جلسہ کر ڈالا۔ اس جلسے میں طرح طرح کے رامپوری جمع ہوئے۔ ان میں بیٹھنے میں چاقو رکھنے والے اور ترچھی ٹوپی لگانے والے خاں صاحب لوگ بھی تھے، فرنیچر بنانے والے اور بیچنے والے کارخانے دار بھی تھے، لوہار بھی تھے، بڑھئی بھی تھے، بزنس مین بھی تھے اور وہ بھی تھے جو آج کل کے محاورے میں دو نمبر کا دھندا کرتے ہیں۔

خوب گرما گرم تقریریں ہوئیں۔ ہر ایک نے اپنی استعداد اور حیثیت کے مطابق دل کی بھڑاس نکالی، مگر مضمون ایک ہی تھا کہ اس شہر بمبئی میں پندرہ بیس ہزار رامپور والے رہتے ہیں، مگر کوئی کسی کا پرسانِ حال نہیں ہے۔ یہ کتنے شرم کی بات ہے۔ اس کے لیے انجمن میں دوبارہ جان پھونکی جائے اور رامپور والوں کی بہبودی کے لیے اقدامات کیے جائیں۔ اس محفل میں عاشق بھائی نے اچانک مجھ سے کہا، "شیخ جی، آپ بھی کچھ بولیے۔"

اب یہ تو یاد نہیں کہ میں نے کیا کہا تھا، مگر جو کچھ کہا تھا اس کا اثر بہت اچھا ہوا تھا۔ لوگوں کو ایسا

Scanned with CamScanner

لگا کہ یہ لونڈا ہے تو کم عمر، مگر پڑھا لکھا اور سمجھ دار معلوم ہوتا ہے۔ اس لیے جب انجمن کی تنظیم نو ہوئی تو اس میں جوائنٹ سیکریٹری کی عظیم ذمے داری ان کمزور کندھوں پر ڈال دی گئی۔ عظیم اس لیے کہ جن صاحب کو انجمن کا نیا سیکریٹری چنا گیا تھا وہ اس جلسے کے بعد سے پھر کبھی نظر نہیں آئے اور جو بھی گزرنی تھی وہ مجھ اکیلے پر گزری۔

اس رات انجمن کے دوبارہ زندہ ہونے کی خوشی میں جب تار روٹی (تندوری روٹی اور قورمہ) کی دعوت ہوئی تو میں نے پہلی بار سات پشت کے کھرے روہیلہ پٹھان غلام احمد خاں آرزو کو سناروں، لوہاروں اور مزدوروں کے ساتھ ایک ہی صف میں بیٹھ کر کھانا کھاتے دیکھا اور آج جب میں اس دعوت کو یاد کرتا ہوں تو خیال آتا ہے کہ سماجی برابری کی باتیں کرنا آسان ہے اور اس کا ثبوت دینا کتنا مشکل...

انجمن کے رشتے سے میر اور آرزو صاحب کا بڑا لمبا ساتھ رہا۔ سارے وسائل محدود تھے مگر اس کے باوجود اسکولی بچوں کو کتابیں کاپیاں تقسیم کی جاتی تھیں، بے سہارا عورتوں کو کپڑا سینے کی مشینیں بھی دی جاتی تھیں، کچھ بیواؤں اور کچھ ہونہار طالب علموں کے وظیفے بھی تھے، اور یہ سارے کام بڑی خاموشی سے ہو جاتے تھے۔ آرزو صاحب کا کہنا تھا: "پبلسٹی سے نام ضرور بڑا ہو جاتا ہے، مگر آدمی چھوٹا ہو جاتا ہے۔"

لوگ کہتے ہیں، آرزو صاحب شاعر تھے اور اچھے شاعر تھے۔ میری بدنصیبی یہ کہ میں نے ان سے ان کا کلام کبھی نہیں سنا۔ ان کے لطیفے ضرور سنے ہیں، جو آرزو صاحب بہت سوکھے منھ سے سنایا کرتے تھے۔ جن دنوں میں ہندوستان میں کام کر رہا تھا، مجھے بلا کر بولے: "امیر آدمی بننا ہے تو ایک بات ہمیشہ یاد رکھنا۔"

میں نے کہا، فرمائیے!" کہنے لگے، "جب کوئی پیسے مانگے تو پہلے پوچھنا، کاہے کے پیسے؟ اور جب وہ بتادے تو جیب میں ہاتھ ڈالنا۔ مگر جب کوئی پیسے دے تو پہلے جیب میں رکھنا، پھر پوچھنا، کاہے کے پیسے؟"

میں نے ان کا ایک اور مزے دار قصہ سنا ہے۔

روس کے ڈکٹیٹر اسٹالن کے آخری دن تھے۔ وہ بہت دنوں سے کوما میں تھا۔ روز خبریں چھپتی

Scanned with CamScanner

تھیں، اب مرا تب مرا، مگر کمبخت ایسا سخت جان تھا کہ مرتا ہی نہیں تھا۔ اخبار والے اس کا صحت نامہ چھاپ چھاپ کے تنگ آ چکے تھے۔

ایک دن شام کو خبر آئی کہ اسٹالن کی حالت بہت نازک ہو چکی ہے اور کچھ گھڑی کا مہمان ہے۔ آرزو صاحب نے کہا: "صبح سویرے تک تو مر ہی جائے گا، اس لیے بڑی سرخی لگا دو۔" ان کے حکم کے مطابق پوری رپورٹ تیار کی گئی اور صفحہ اول پر سرخی لگائی گئی: "روسی ڈکٹیٹر اسٹالن فوت ہو گئے۔"

اخبار جیسے ہی بازار میں آیا، گرم چنوں کی طرح بک گیا، کیونکہ ہندوستان کے علاوہ کسی بھی اخبار میں اسٹالن کی موت کی خبر نہیں تھی۔ حد یہ ہے کہ ٹائمز آف انڈیا اور انڈین ایکسپریس بھی خالی تھے۔ ہر ایک کو حیرت تھی کہ وہ خبر جو کسی کو نہیں ملی، آرزو صاحب کو کیسے مل گئی۔ تب تک پی ٹی آئی اور ریڈیو کے ذریعے تصدیق ہو چکی تھی کہ اسٹالن سچ مچ مر چکا ہے۔ چنانچہ شام کو انڈین ایکسپریس کا رپورٹر آرزو صاحب کا انٹرویو لینے پہنچ گیا۔ اس نے پوچھا: "اسٹالن کی موت کی خبر سب سے پہلے آپ کو کیسے مل گئی؟"

آرزو صاحب نے بڑے غرور سے کہا: "ماسکو میں ہمارا نمائندہ ہے۔"

رپورٹر نے پوچھا: "اس نے یہ خبر آپ کو کس طرح بھیجی؟"

آرزو صاحب نے کہا: "ٹیلیفون کے ذریعے..."

رپورٹر نے کہا: "مگر اسٹالن کی موت ہندوستانی وقت کے مطابق سویرے ہوئی ہے۔ تب تک تو آپ کا اخبار چھپ گیا ہوگا۔"

آرزو صاحب بڑی ادا سے مسکرائے اور رازدارانہ انداز میں بولے: "عجیب گھامڑ آدمی ہو! جرنلسٹ ہو کر اتنا بھی نہیں جانتے کہ بڑی خبر آنے والی ہو تو کاپی روک کے رکھتے ہیں۔"

اللہ جانے رپورٹر نے مانا یا نہیں مانا۔ یہ کہانی ایک دوسرے اخبار کے بارے میں بھی سنائی جاتی ہے مگر جو لوگ آرزو صاحب کے مزاج داں ہیں وہ کہتے ہیں ایسا کام آرزو صاحب ہی کر سکتے تھے۔

آرزو صاحب کھانے پینے کے بڑے شوقین تھے۔ جب بھی کسی پارٹی میں جاتے تو آرزو صاحب سب سے پہلے کھانے پینے کا جائزہ لیتے، اور ایسی پارٹیاں تو تقریباً ہر روز ہوتی تھیں جن میں صحافیوں کو بلایا جاتا تھا۔ اگر انھیں بتایا جاتا کہ معاملہ چائے بسکٹ تک ہی محدود رہے گا تو ان کا موڈ

Scanned with CamScanner

خراب ہو جاتا۔ ''لعنت ہے، نئی دور سے دھکے کھاتے ہوئے آئے ہیں، وقت برباد کیا ہے، اب اپنا کالم برباد کریں گے اور یہ خبر چھاپیں گے۔ اور ملے گا کیا؟... ایک پیالی چائے۔'' لیکن جب بھی کھانوں سے لدی ہوئی میز دکھائی دے جاتی تو چہرہ کھل اٹھتا اور ہونٹوں پر ایک بڑی میٹھی سی مسکراہٹ دوڑ جاتی۔ اگر بوفے (Buffet) ہوتا تو پہلے اس سرے سے اُس سرے تک تمام کھانوں کا جائزہ لیتے اور پھر یکے بعد دیگرے تمام ڈشز کو ٹیسٹ کرتے چلے جاتے۔

ایک بار کا واقعہ ہے کہ شہر میں کوئی غیر ملکی لیڈر آیا ہوا تھا۔ اس کی پریس کانفرنس تھی اور بعد میں ایک فائیو اسٹار ہوٹل میں لنچ کا بندوبست تھا۔ اب یاد نہیں کہ وہ لیڈر کون تھا مگر اتنا ضرور یاد ہے کہ ہوٹل کا ہال بھانت بھانت کے صحافیوں سے بھرا ہوا تھا۔ پریس کانفرنس کے بعد جب کھانے کا وقت ہوا تو آرزو صاحب غائب ہو گئے۔ میں نے ڈھونڈا تو دیکھا کہ ایک کونے میں پلیٹ لیے کھڑے ہیں اور بڑے انہماک سے کھانے میں مصروف ہیں۔ میں جب پاس پہنچا تو دیکھا، ان کی پلیٹ میں سلامی کے ٹکڑے رکھے ہوئے تھے۔ سلامی ایک قسم کا کولڈ کٹ (cold-cut) ہوتا ہے جس کے بیچ میں انڈے ڈال کر اور باریک باریک پرت کاٹ کر بہت خوش شکل بنایا جاتا ہے۔ عام طور پر یہ سور کا گوشت ہوتا ہے۔ میں دھک سے رہ گیا۔ موصوف اپنی لاعلمی اور صحت مند ذوق میں ایمان کو داؤں پر لگا چکے تھے۔ جیسے ہی مجھے دیکھا، چہک کر بولے: ''ہاں یہ چیز ہے، بہت مزے دار ہے۔'' میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کروں۔ ان سے بتا دوں کہ وہ کیا کھا رہے ہیں؟ یا پلیٹ ہاتھ سے لے کر پھینک دوں؟ ڈر یہ بھی لگ رہا تھا کہ اگر انھیں معلوم ہوا کہ ان سے وہ کام ہو گیا ہے جس کی سخت ممانعت ہے تو پتا نہیں کیسا ری ایکشن ہو۔ شور مچانے، گالیاں دینے لگیں یا طبیعت خراب ہو جائے۔ لیکن انھیں روکنا بھی ضروری تھا۔ نہ جانے کیسے دماغ میں ایک بات آئی اور میں نے مسکرا کر آرزو صاحب سے پوچھا:

''مجھے معلوم نہیں تھا کہ آپ مینڈک وغیرہ بھی کھا لیتے ہیں۔''

آرزو صاحب کا ہاتھ جہاں تھا وہیں رک گیا، اور چونک کر بولے: ''مینڈک؟''

میں نے بڑی معصومیت سے کہا: ''جی، یہ جو آپ کھا رہے ہیں، مینڈک کا گوشت ہے۔''

انھوں نے قریباً چیخ کر کہا: ''لاحول ولا قوۃ...'' اور پلیٹ پھینک کر گالیاں دیتے ہوئے واش

روم کی طرف چلے گئے۔

میں آج بھی اس قصے کو یاد کرتا ہوں تو ہنسی آنے لگتی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ دوسری دنیا میں انھیں کوئی سزا نہیں ملی ہوگی، کیونکہ گنہ تو ہوا مگر گناہگار معصوم تھا۔

جنگِ آزادی میں حصہ لینے اور جیل جانے کے اعتراف میں جب سرکار نے آرزو صاحب کو ''تامڑ پتر'' دیا تو بہت سے احباب مبارک باد دینے کے لیے پہنچے، تو آرزو صاحب نے کہا: ''ارے میاں، اچھا ہوا جو یہ سرٹیفکیٹ مل گیا۔ میں تو اپنی کمر پہ لاٹھیوں کے نشان دکھا دکھا کے تنگ آچکا تھا۔ اب جو کوئی بھی پوچھے گا اسے تامڑ پتر دکھا دیا کروں گا۔''

رولیکس ہوٹل کے اوپر ہندوستان کا دفتر آج بھی ہے۔ اخبار آج بھی نکلتا ہے۔ سرفراز آرزو اپنے باپ کی روشن کی ہوئی شمع کو دونوں ہاتھوں سے گھیرے بیٹھے ہیں کہ بجھ نہ جائے۔

سب کچھ وہی ہے کہ جو تھا۔ مگر میں جب بھی وہاں جاتا ہوں، مجھے وہ کرسی خالی دکھائی دیتی ہے جس پر ایک شخص بیٹھ کرتا تھا جو آدھی صدی کی صحافت کی تاریخ تھا، جو پرانی وضع داری اور شرافت کا نشان تھا، جس کی آنکھوں کے ٹوٹتے تارے ذاروں کو روشنی دکھایا کرتے تھے:

مقدور ہو تو خاک سے پوچھوں کہ اے لئیم
تو نے وہ گنج ہائے گراں مایہ کیا کیے

❀❀

ایک تھے بھائی

جب بھی کوئی غریب بچہ یتیم ہو جاتا ہے تو عزیز، رشتے دار، پڑوسی، ملنے جلنے والے، سب کے سب ایک ہی سوال کرنے لگتے ہیں: "ہائے، اب اس معصوم کا کیا ہوگا؟"

میرے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا۔ ابو کو جیل ہو گئی تھی۔ وہ پکے سیاسی آدمی تھے مگر افسوس کہ ایماندار بھی تھے۔ سوشلسٹ تھے، آچاریہ کرپلانی کو گرو مانتے تھے اور حسرت موہانی کو اپنا آئیڈیل۔ انھوں نے اپنی تقریروں میں کچھ ایسی باتیں کہہ ڈالیں جو اس وقت کے فرمانرواؤں کو اچھی نہیں لگیں۔ آزادی نئی نئی ملی تھی۔ وہ سب جو کبھی آزادی کے مجاہد تھے، اس کے محافظ بنے بیٹھے تھے۔ اپنی غیر متوقع کامیابی کے نشے میں جھوم رہے تھے، اور پہلی دھار کی شراب کتنی تیز ہوتی ہے، یہ بات پرانے پینے والے ہی جانتے ہیں۔ تازہ واردانِ بساطِ ہوائے دل کو کیا معلوم۔ اب ایسی رنگین محفل میں اگر کوئی سرپھرا کھڑا ہو جائے اور چلانے لگے کہ "یہ بدمعاشی ہے، بند کرو یہ بندر بانٹ۔ ابھی وہ وقت نہیں آیا ہے کہ جشن منایا جائے۔ وہ انتظار تھا جس کا یہ وہ سحر تو نہیں..." تو کیسے اچھا لگے گا؟ اس کی سزا یہی ہے کہ اس کا منہ بند کر دیا جائے اور وہ پھر بھی خاموش نہ ہو تو اسے جیل کی کسی ایسی کوٹھری میں ڈال دیا جائے جہاں اس کی آواز سلاخوں سے ٹکرا کے زخمی ہوتی رہے اور ایک دن دم توڑ دے۔

ابو کو گیارہ مہینے تک قید تنہائی میں رکھا گیا۔ میں آج بھی سوچتا ہوں کہ انھوں نے ایسا کون سا جرم کیا ہوگا جس پر نہ کوئی مقدمہ چلا، نہ فرد جرم عائد ہوئی مگر Preventive Detention Act (احتیاطی نظر بندی کے نام نہاد قانون) کے تحت ان کو نظر بند رکھا گیا اور وہ تمام اذیتیں دی گئیں جو سیاسی قیدیوں کو تو چھوڑیے، عام مجرموں کو بھی نہیں دی جاتیں۔ جب وہ باہر نکلے تو سب کچھ بدل چکا تھا، سوائے ان کی بڑی بڑی مغرور آنکھوں کے جو کبھی کسی کے سامنے نہیں جھکی تھیں۔ وزن کم ہو کے

Scanned with CamScanner

تقریباً پچاس کلو رہ گیا تھا، گالوں کی ہڈیاں نکل آئی تھیں، سر کے بال بہت کم ہو گئے تھے اور رنگ اتنا پیلا تھا جیسے سہ پہر کی دھوپ جم گئی ہو۔ اور سب سے بڑی بات یہ کہ وہ چپ ہو گئے تھے۔ اخبار والوں سے لے کر گھر والوں تک سبھی نے ان سے جاننا چاہا کہ جیل میں ان کے اوپر کیا بیتی، اور جو کچھ بیتی اس کا ذمے دار کون ہے، مگر انھوں نے کبھی کوئی جواب نہیں دیا۔ ایک عجیب سی خاموشی تھی۔ کبھی کبھی تو لگتا تھا کہ یہ خاموشی ہی ان کا جواب ہے۔

ہمارے حالات تو ایسے تھے ہی نہیں کہ کسی بڑے ڈاکٹر کو دکھایا جاتا۔ خدا بھلا کرے حکیم سید ذوالفقار حسنین کا، جو پڑوسی بھی تھے اور ہمدرد بھی۔ دوسرے، تیسرے دن آ کر دیکھ جایا کرتے تھے، کچھ دوائیں لکھ دیتے تھے اور کچھ اپنے پاس سے دے دیا کرتے تھے۔ مگر ابو میری آنکھوں کے سامنے پگھلتے چلے گئے اور کچھ ہی مہینے بعد ایک دن جب فجر کی اذان ہو رہی تھی، انھوں نے آنکھیں کھول کر مجھے دیکھا اور پھر وہ مغرور آنکھیں ہمیشہ کے لیے بند ہو گئیں۔

ابو کی موت کے بعد سب لوگ جس طرح مجھے دیکھتے تھے، اس سے چڑ ہونے لگی تھی۔ ہر نظر ترس کھاتی ہوئی دکھائی دیتی تھی اور ہر ہونٹ افسوس کرتا ہوا سنائی دیتا تھا۔ جب بھی کوئی بزرگ سر پر ہاتھ پھیرتا تو ایسا محسوس ہوتا جیسے وہ ہاتھ بول رہا ہو: "ہائے، اب اس معصوم کا کیا ہوگا؟"

صرف ایک گھر ایسا تھا جہاں بے مطلب افسوس اور بے معنی ہمدردی کی برسات نہیں ہوتی تھی، مگر وہ گھر شہر سے بہت دور تھا۔ پھر بھی جب دل بہت گھبرانے لگتا تو دو آنے گھنٹے کی سائیکل کرائے پر لیتا یا کسی دوست سے مانگ لیتا اور قمر باجی کے گھر پہنچ جاتا۔

ریلوے سٹیشن کے بالکل سامنے ایک کچی پکی سڑک ڈھلان پر اترتی ہوئی دکھائی دیتی تھی۔ جہاں سے یہ سڑک شروع ہوتی تھی اس کے دونوں طرف آمنے سامنے دو دکانیں تھیں۔ ایک ہندو حلوائی کی دکان، جس پر پوری، کچوری، جلیبی، ربڑی اور گرم دودھ ہر وقت ملتا تھا، اور سامنے ایک مسلمان کا چائے خانہ تھا۔ پتھر کے کوئلوں پر ابلتی ہوئی چائے، اس کے برابر ٹین کے کانچ لگے ہوئے میلے ڈبوں میں بسکٹ، نان کھتائی اور سینکے ہوئے توسٹ، جنھیں وہاں کی زبان میں پاپے کہا جاتا ہے۔ لکڑی کی گندی کالی بنچوں پر بیٹھے ہوئے لوگ اور کچھ اونگھتے ہوئے کتے۔ کسی ٹرین کے آنے یا جانے کا وقت ہوتا تو اس حصے میں تھوڑی سی ہلچل دکھائی دیتی ورنہ ایک عجیب سی خاموشی چھائی رہتی۔

Scanned with CamScanner

سڑک کے دونوں طرف کچھ کھیت یا خالی میدان دکھائی دیتے۔ جن جگہوں پہ کھیتی نہیں ہو سکتی تھی وہاں کچھ عمارتیں بن گئی تھیں جن میں سے کبھی کبھی کچھ چہرے بھی جھانکتے ہوئے دکھائی دیتے تھے۔

یہ سڑک ایک بڑے سے گیٹ پر جا کر ختم ہوتی تھی، جس کے اوپر ایک بورڈ نیم دائرے کی شکل میں لگا ہوا تھا۔ اس پر انگلش میں لکھا تھا: ''رامپور رضا شوگر فیکٹری لمیٹڈ''۔ کالے بورڈ پر سفید حروف بہت سی برساتیں جھیلتے جھیلتے دھندلے ہو گئے تھے۔ بورڈ کے بالکل نیچے پتھر کی ایک بنچ بنی ہوئی تھی جس پر خاکی وردی پہنے کبھی ایک موٹا مونچھوں والا بوڑھا دکھائی دیتا اور کبھی ایک مریل سا لڑکا۔ بنچ کے پیچھے ہی واچ مین کا کیبن تھا جس کے دروازے پر ایک گندا سا لال انگوچھا ہمیشہ لٹکا رہتا تھا۔ فیکٹری کئی کلومیٹر میں پھیلی ہوئی تھی۔ اس گیٹ سے فیکٹری کے اندر تک تمام سڑکیں سیمنٹ کی بنی ہوئی تھیں جس پر مٹی تو نہیں ہوتی تھی مگر چاروں طرف سے اڑ کر آنے والی ریت جوتوں کے نیچے آ کر شور مچاتی رہتی تھی۔ گیٹ کے دونوں طرف دور تک ملازمین کے کوارٹرز تھے۔ سامنے کی طرف بچوں کے کھیلنے کے میدان کے پیچھے کمپنی کے دفاتر تھے اور اس کے پیچھے وہ پلانٹ جس میں شکر بنائی جاتی تھی۔

فیکٹری کے بیچوں بیچ سے ایک تین فٹ چوڑی ریلوے لائن گزرتی تھی جس پر اکثر ایک ننھا منا سا انجن اپنے پیچھے چھوٹے چھوٹے ڈبوں کو کھینچتا ہوا دکھائی دیتا تھا، جن پر گنا لدا ہوتا تھا۔ یہ مال گاڑی ان دیہاتوں سے گنا لے کر آیا کرتی تھی جہاں سے ٹرک اور بیل گاڑی کے ذریعے آمد و رفت آسان نہیں تھی۔

فیکٹری میں گھستے ہی دو چیزیں بڑھ کر استقبال کرتی تھیں۔ ایک تو گنے کے ابلتے ہوئے رس کی تیز بو، اور دوسری گنے کی جلی ہوئی کھوئی کے کالے ریشے جو ہوا میں اڑتے رہتے تھے اور سفید کپڑوں کے سخت دشمن تھے، اور کبھی اپنا نشان چھوڑے بغیر نہیں جاتے تھے۔

گیٹ سے گھستے ہی دائیں طرف چوتھا کوارٹر ہی کا تھا۔ ایک چھوٹا سا پکا صحن جس کے ایک طرف پاخانہ، غسل خانہ اور باورچی خانہ بنا ہوا تھا اور سامنے ایک مختصر سا دالان تھا جس میں دو کمرے تھے۔ ان دونوں کمروں کی کھڑکیاں فیکٹری کے باہر پھیلے ہوئے کھیتوں کی طرف کھلتی تھیں۔

گھر میں گھستے ہی جس چیز پر سب سے پہلے نظر پڑتی تھی وہ ایک گائے تھی جو دروازے کے بالکل سامنے کھونٹے سے بندھی رہتی تھی۔ مجھے وہ گائے کبھی پسند نہیں آئی۔ ایک تو اتنے چھوٹے سے گھر کے اندر اتنا بڑا جانور، اور وہ بھی ایسا جو دن بھر کھانے اور گندگی کرنے کے سوا کچھ نہ کرے۔ مگر

Scanned with CamScanner

بھائی کا خیال تھا کہ اگر پانچ بچوں کے لیے بازار سے دودھ لیا جائے تو ان کی تھوڑی سی تنخواہ برداشت نہ کر سکے گی، اس لیے:

رب کا شکر ادا کر بھائی
جس نے ہماری گائے بنائی

وہ گائے جیسی بھی تھی مگر بچوں کے دودھ اور باجی کی چائے کا مسئلہ حل کر دیتی تھی۔

باجی تھیں تو میری پھوپھی زاد بہن مگر محبت کے معاملے میں کسی بھی سگی بہن کو پیچھے چھوڑ سکتی تھیں۔ سکتی تھیں کیا مطلب، سکتی ہیں کہنا چاہیے، کیونکہ باجی ماشاء اللہ حیات ہیں اور ان کی محبت وشفقت میں وقت کے ساتھ اور اضافہ ہو گیا ہے۔

میں جب بھی فیکٹری پہنچتا، باجی عام طور پر کسی موٹی سی کتاب میں کھوئی ہوئی پائی جاتیں۔ کتابیں ان کی بہت بڑی کمزوری تھیں۔ اکثر ایسا ہوتا تھا کہ پتیلی چولھے پہ ہوتی، ایک ہاتھ چمچہ چلاتا ہوتا اور دوسرا ہاتھ کتاب کے ورق الٹتا ہوتا۔ باجی جب بھی مجھے دیکھتیں، ان کا سانولا چہرہ کھل اٹھتا۔ ایک بڑی سی مسکراہٹ دور تک پھیل جاتی۔ وہ احتیاط سے کتاب کے بیچ میں کوئی نشان رکھتیں، اسے بند کرتیں اور علیک سلیک سے پہلے پوچھتیں: ”چائے پیو گے؟“ مجھ سے پوچھنا تو ایک بہانہ تھا، اصل میں چائے باجی کی دوسری کمزوری تھی۔ ان کا بس نہیں چلتا تھا ورنہ ان کی تصویر یوں بنتی کہ ایک ہاتھ میں کتاب ہوتی اور دوسرے میں چائے کا پیالہ۔ اور چائے بھی کوئی ایسی ویسی نہیں، گھر کی گائے کا خالص دودھ جسے رامپور والے ”تھن تلے کا دودھ“ کہتے ہیں، یعنی وہ دودھ جس میں پانی کی ایک بوند بھی نہ ملی ہو۔ اس میں چائے کی پتی ڈالی جاتی اور اس قدر ابالا جاتا کہ دودھ کا رنگ گرمی میں تپتی ہوئی کسی حسینہ کے گالوں جیسا ہو جاتا۔ کبھی کبھی اس میں الائچی بھی ڈال دی جاتی تاکہ ذائقے میں خوشبو بھی شامل ہو جائے۔ ہم دونوں چائے کے بڑے بڑے مگ بھر کے آمنے سامنے بیٹھ جاتے اور گپیں مارتے۔ چونکہ باجی کی طرح مجھے بھی پڑھنے کا بہت شوق تھا اس لیے زیادہ تر باتیں تو کتابوں کے اوپر ہی ہوتیں، کبھی کبھی ادھر اُدھر کی باتیں بھی کر لیا کرتے۔ یہ سلسلہ اسی طرح ابو کے انتقال کے بعد بھی جاری رہا۔ باجی نہ میرے سر پہ ہاتھ پھیرتیں، نہ ان کی آنکھوں میں وہ ہمدردی دکھائی دیتی جس سے مجھے گھن آنے لگی تھی۔ وہ مجھ سے نارمل آدمیوں کی طرح نارمل باتیں کرتیں، دنیا کی باتیں، کتابوں کی

Scanned with CamScanner

باتیں، کھانے پینے کی باتیں۔ انھوں نے مجھ سے وہ ذلیل سوال کبھی نہیں کیا کہ اب کیا ہوگا اور تم کیا کروگے؟ مگر ان کے شوہر ایسے نہیں تھے۔ وہ حاجی شجاعت علی یا داڑھی والے شجاعت کہلاتے تھے، کیونکہ میرے والد کا نام بھی شجاعت تھا اور دونوں قریبی رشتے دار تھے اس لیے تخصیص ضروری تھی۔ ان سے جب بھی سامنا ہوتا، وہ اپنی ٹوپی اور شیروانی اتارتے اتارتے پوچھ ہی لیتے: "ہاں بھائی، تو کیا سوچا تم نے؟ کیا کرنے کا ارادہ ہے آگے؟" اب میں انھیں کیا جواب دیتا۔ کیونکہ مجھے خود ہی نہیں معلوم تھا کہ مجھے کیا کرنا ہے، بلکہ مجھے یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ میں کیا کرسکتا ہوں۔ مجھے تو ایسا لگتا تھا کہ میں کر ہی کیا سکتا ہوں، ایک ایسے یتیم بچے کے پاس، جس کے باپ کا کفن دفن بھی کچھ رشتے داروں کی مہربانی سے ہوا ہو اس کے پاس آپشنز ہی کہاں ہوتے ہیں۔ میں انھیں بھائی کہا کرتا تھا۔ چونکہ دولہا بھائی کہنا مجھے اچھا نہیں لگتا تھا اور شجاعت بھائی کہنے میں ان کا نام لینا ادب کے خلاف تھا، اس لیے میں نے اختصار سے کام لے کر اسے بھائی بنا دیا۔

بہت بڑا سا سر، چھوٹی چھوٹی آنکھیں، بہت سلیقے سے ترشی ہوئی گول داڑھی جس میں ایک دو سفید بال آچکے تھے، ماتھے پر ایک بڑا سا کالا نشان جو ان کے پنج وقتہ نمازی ہونے کا ثبوت تھا۔ ہمارے خاندان میں کہا جاتا ہے کہ بھائی نے کبھی کوئی نماز قضا نہیں کی۔ نہایت دیندار آدمی تھے۔ مذہبی کتابوں اور قرآن مجید کے علاوہ کبھی کچھ نہیں پڑھتے تھے۔ ہمیشہ شیروانی پہنتے تھے اور اسی کپڑے کی ٹوپی سر پر ہوتی تھی۔ شوگر فیکٹری میں کام کرتے تھے اور اس کی منی چھک چھک گاڑی کے ٹریک سپروائزر تھے جو فیکٹری میں گنا لایا کرتی تھی۔

میں بھائی کے پسندیدہ لوگوں میں سے نہیں تھا۔ ان کا خیال تھا کہ میں بہت بدتمیز اور نہایت گستاخ ہوں اور دادی کے بے جا لاڈ پیار نے مجھے خراب کر دیا ہے۔ ان کی اس رائے کے پیچھے ایک دلچسپ مگر کسی حد تک افسوسناک کہانی ہے۔

یوں ہوا تھا کہ کچھ برس پہلے بھائی کے پیر و مرشد تشریف لائے تھے۔ انھیں کپتان واجد علی خاں کے وسیع و عریض نادار دیوان خانے میں ٹھہرایا گیا تھا۔ اس وقت میری عمر بارہ تیرہ سال کی رہی ہوگی، اور وہ دیوان خانہ اور اس کا کمپاؤنڈ ہم سب بچوں کے کھیلنے کا میدان تھا، جو تعداد میں ایک درجن کے قریب تھے اور میں جن کا سرغنہ تھا۔ پیر و مرشد کی آمد پر دیوان خانے کے کمروں کے دروازے بند

Scanned with CamScanner

کر دیے گئے، برآمدے میں چقیں ڈال دی گئیں اور ہمیں وہاں کھیلنے سے منع کر دیا گیا۔ ہم سب بچے حیران تھے کہ ایسا کیوں ہو رہا ہے۔ اس دیوان خانے میں تو بہت سے مہمان آئے اور بڑے بڑے لوگ ٹھہرائے گئے مگر نہ کبھی ایسی پردہ داریاں کی گئیں، نہ پابندیاں لگائی گئیں۔

ہم سب ایک کونے میں جمع ہوئے اور میٹنگ میں طے پایا کہ ایک کمیٹی بنائی جائے جو پتا لگائے کہ یہ چکر کیا ہے اور ہم بچوں کو ہمارے حقوق سے محروم کیوں کیا جا رہا ہے۔ چنانچہ پانچ بچوں کا انتخاب کیا گیا جو سمجھ دار بھی تھے اور دوسرے بچوں سے بڑے بھی۔ دو بچوں کو عالیہ دادی کی چھت پہ بھیجا گیا جہاں سے دیوان خانے کے تمام حصوں پر نظر رکھی جا سکتی تھی۔ انھیں ہدایت کی گئی کہ چھت کے اوپر ذرا سی بھی آواز نہ کریں کیونکہ عالیہ دادی کے کان بہت تیز ہیں۔ چھت پر جیسے ہی کسی بچے کے چلنے کی آواز سنتی ہیں، چیخنا چلانا شروع کر دیتی ہیں۔ دو بچوں کو چاندنی کے پیڑوں کے جھنڈ میں چھپا دیا گیا کیونکہ وہ برآمدے کے بالکل سامنے تھا۔ امید یہ تھی کہ کبھی نہ کبھی تو کوئی پردہ ہٹے گا اور اندر کا منظر نظر آ جائے گا۔ اور میں خود ادھر سے اُدھر چکر لگانے لگا۔ جب ایک بزرگ نے بھری دوپہر میں اس طرح اکیلے گھومنے کا سبب پوچھا تو میں نے عرض کیا: ''باقی بچوں کو ڈھونڈ رہا ہوں۔ نہ جانے کہاں چھپ گئے ہیں۔ شاید اندر ہوں گے۔'' مگر ان بزرگ نے اندر جانے کی اجازت نہیں دی۔ غصہ تو بہت آیا۔ کوئی دوسرا وقت ہوتا تو انھیں ضرور سزا دیتا، ان کے حقے کی منھ نال میں مٹی تو ضرور ہی بھر دیتا، مگر مصلحت کا تقاضا یہی تھا کہ میں فی الوقت ٹل جاؤں اور بعد میں اپنی کوشش جاری رکھوں۔ اس دن تو کوئی کامیابی نہیں ملی مگر دوسرے دن چاندنی کے پیڑوں میں چھپے ہوئے جاسوسوں نے خبر دی کہ اندر کوئی لڑکی ہے جس کی وجہ سے یہ دروازے بند کر دیے گئے ہیں اور چقیں ڈال دی گئی ہیں۔ اب مشکل یہ تھی کہ اس لڑکی کو دیکھا کیسے جائے۔

میری لیفٹیننٹ پروین نے یہ مسئلہ حل کر دیا۔ اس کے گھر کھیر بنی تھی۔ وہ ایک پیالہ بھر کھیر لے آئی اور ہم چار، پانچ شیطان چہروں پر معصومیت اور ہاتھ میں کھیر لے کر دھڑ سے اندر گھس گئے۔ سامنے مسہری پر پیر و مرشد نیم دراز تھے۔ نہایت گول مٹول آدمی تھے۔ چہرے پہ داڑھی نہ ہوتی تو ربڑ کی گیند نظر آتے۔ رنگ سرخ و سفید تھا۔ سر اور داڑھی کے بال اس قدر سفید تھے کہ کرتے پاجامے کے رنگ میں مل گئے تھے۔ ایک چلی دبلی لڑکی، جو عمر میں سب سے برابر کی ہوگی یا زیادہ سے زیادہ

Scanned with CamScanner

چودہ پندرہ کی ہوگی، کافی شوخ رنگ کے کپڑے پہنے ہوئے ان کے برابر بیٹھی تھی اور شاید ان کے سر میں تیل لگا رہی تھی۔ ہمیں اندر گھستا دیکھ کر وہ لڑکی گھبرا کر کھڑی ہوگئی۔ پیر و مرشد بھی سنبھل کر بیٹھ گئے اور تیز آواز میں بولے، ''کیا ہے؟'' پروین کانپ گئی۔ مجھے ایسا لگا جیسے اس کے ہاتھ سے تھالی گر جائے گی مگر میں نے ہمت نہیں ہاری۔ جلدی سے تھالی اس کے ہاتھ سے لی اور بہت ادب سے آواز کو نیچا کر کے کہا، ''جی یہ کھیر... مہرو پھوپھو نے بھیجی ہے... اس کی امی نے۔''

پیر و مرشد کے چہرے کی سختی غائب ہوگئی۔ انھوں نے دونوں ہاتھ اپنی طویل و عریض داڑھی پر پھیرے اور لڑکی کی طرف دیکھ کے بولے، ''لے لو!'' میں نے کھیر لڑکی کی طرف بڑھا دی۔ اس کھلتے ہوئے سانولے رنگ کی لڑکی کی آنکھیں مجھے آج بھی یاد ہیں۔ بہت بڑی بڑی آنکھیں تھیں اور کاجل سے بھری ہوئی تھیں۔ اس کے بال بھی بڑے لمبے تھے جو لال رنگ کے چنے ہوئے دوپٹے کے ساتھ نیچے تک لٹک رہے تھے۔ اس کے دونوں ہاتھوں میں سونے اور کانچ کی بہت سی چوڑیاں بھری ہوئی تھیں۔ وہ مسکرائی اور اس نے تھالی میرے ہاتھ سے لے لی۔ مشن کامیاب ہو چکا تھا۔ میں جانے کے لیے تیزی سے پلٹا تو دیکھا کہ میرے سارے بہادر ساتھی پہلے ہی غائب ہو چکے تھے۔

دوسرے دن بھائی جب اپنے پیر و مرشد کی قدم بوسی کے لیے آئے تو تھوڑی دیر کے لیے ہمارے گھر بھی آگئے۔ کیونکہ اس وقت تک ہماری حویلی نیلام نہیں ہوئی تھی اور دیوان خانے کے سامنے ہی تھی۔ میں نے پوچھا، ''بھائی، وہ لڑکی کون ہے جو پیر صاحب کے ساتھ آئی ہے؟''

''کیوں؟'' انھوں نے پوچھا۔

''ارے وہ تو میری عمر کی ہے، اس کو اتنے پردوں میں رکھنے کی کیا ضرورت ہے؟ ہمارے ساتھ کھیلے گی تو بہت مزہ آئے گا۔''

''وہ تم لوگوں کے ساتھ نہیں کھیل سکتیں۔''

''کیوں؟''

بھائی کے لہجے میں ذرا سی سختی آگئی۔ ''بدتمیزی مت کرو، وہ حضرت صاحب کی بیگم ہیں۔''

میری عمر ضرور کم تھی مگر عقل کم نہیں تھی۔ اور پھر طرح طرح کی کتابیں پڑھ کے دنیا کے بارے میں کافی معلومات حاصل کر چکا تھا۔ مجھ سے رہا نہ گیا۔ میں نے کہا، ''بیگم؟... ارے وہ پیر صاحب تو

Scanned with CamScanner

اتنے بڈھے ہیں، وہ اتنی چھوٹی سی بچی کے ساتھ شادی کیسے کر سکتے ہیں؟"

بھائی کی آنکھیں غصے میں اور چھوٹی ہو گئیں۔ انھوں نے جھلا کر کہا، "کیوں نہیں کر سکتے؟"

"وہ لونڈیا تو ان کی بیٹی کی بیٹی لگتی ہے،" میں نے تڑ سے جواب دیا۔

بھائی دانت پیس کر کھڑے ہو گئے۔ "تم بہت بدتمیز ہو، بہت زیادہ بدتمیز..." وہ غصے میں تمتماتے ہوئے چلے گئے، اور پھر ایک زمانے تک کبھی سیدھے منھ بات نہیں کی۔ اصل میں غلطی سے میرا ہاتھ ان کی دکھتی رگ پر لگ گیا تھا۔ جب ان کے حضرت نے اپنی عمر کی پروا نہ کرتے ہوئے، اپنے ایک مرید کی نابالغ بیٹی کو اپنے نکاح میں لے لیا تو بہت سے مریدوں کو اچھا نہیں لگا۔ میرا خیال ہے، وہ بھائی کی شرمندگی تھی جو غصہ بن کر نکلی تھی۔

تو ایسے تھے میرے اور بھائی کے تعلقات۔ اس لیے وہ جب بھی میرا حال پوچھتے، مجھے ایسا لگتا جیسے وہ میرا مذاق اڑا رہے ہوں۔ مگر باجی کا کہنا یہ تھا کہ وہ سچ مچ میرے لیے پریشان ہیں اور چاہتے ہیں کہ میں اپنی پڑھائی پوری کروں۔ مگر سوال یہی آتا ہے کہ اخراجات کون برداشت کرے گا۔

ایک وقت ایسا آیا کہ جب سب لوگ میرے بارے میں سوچ سوچ کر اتنا پریشان ہو گئے کہ انھوں نے سوچنا ہی چھوڑ دیا۔ تب ایک حیرت انگیز واقعہ ہوا۔ بمبئی سے ہمارے ایک رشتے دار اور روزنامہ خلافت کے ایڈیٹر زاہد شوکت علی کا خط آیا جس میں ابو کے انتقال پر افسوس کے بعد مشورہ دیا گیا تھا کہ مجھے بمبئی بھیج دیا جائے۔ انھوں نے لکھا تھا، "اس لڑکے کی کہانیوں اور اخبار کے مزاحیہ کالم باغ و بہار کے لیے بھیجے گئے مضامین کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ یہ لڑکا کافی ذہین ہے اور اگر اس کی صلاحیت کو نکھارا جائے تو یہ ایک اچھا صحافی بن سکتا ہے۔ اسے بمبئی میں رہنے سہنے کی بھی کوئی تکلیف نہیں ہوگی، کیونکہ خلافت ہاؤس بہت بڑا ہے، اس میں بہت سے لوگ رہتے ہیں۔ اس کے لیے بھی گنجائش نکل ہی آئے گی۔"

اگر امریکی حکومت کسی ہندوستانی کو نیویارک میں رہنے کی دعوت دے اور ساتھ میں گرین کارڈ بھی بھیج دے تو جو خوشی ہوگی ویسا ہی کچھ میرا حال بھی ہوا۔ پہلے تو مجھے یقین ہی نہیں آیا کہ یہ چھپر پھٹا کیسے، کیونکہ زاہد شوکت علی صاحب اپنے خاندان والوں کو ذرا کم ہی منھ لگاتے تھے، اور پھر دوریاں بھی اتنی تھیں کہ تصور ہانپنے لگتا تھا۔ باقی سب لوگ تو خوش ہوئے مگر میری نیندیں حرام ہو گئیں۔ جب بھی آنکھیں بند کرتا، بمبئی کی وہ تمام تصویریں، جو کتابوں اور رسالوں میں دیکھی تھیں، سامنے آ کھڑی ہوتیں۔

Scanned with CamScanner

گیٹ وے آف انڈیا دکھائی دیتا، جوہو کا سمندر دکھائی دیتا، سڑکوں پہ دوڑتی ہوئی دومنزلہ بسیں دکھائی دیتیں۔ عالم یہ تھا کہ جدھر دیکھتا ہوں اُدھر تو ہی تو ہے۔ تمام یاروں دوستوں کو ڈھونڈ ڈھونڈ کے خوشخبری سنائی اوران کی آنکھوں میں رشک دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی۔ مگر یہ خوشی کچھ زیادہ دیر تک قائم نہیں رہی۔

ایک دن جب میں اپنی دادی کے ساتھ بیٹھ کر اس سامان کی فہرست بنارہا تھا جو اپنے ساتھ بمبئی لے جانا چاہتا تھا تو وہ اچانک پھٹ پڑیں۔ ''ارے رہنے دے یہ سب کچھ! بمبئی جانا اتنا آسان نہیں ہے۔''

''کیوں نہیں ہے؟'' میں تلملا گیا۔ ''زاہد چچا نے خود بلایا ہے۔''

''اس کے بلانے سے کیا ہوتا ہے؟ کوئی بھیجنے والا بھی تو ہونا چاہیے۔ ڈیڑھ دوسو کا خرچہ ہے، کون دے گا؟''

مجھے بالکل ایسا لگا جیسے کسی نے میرے پیٹ میں گھونسا مار دیا ہو اور مجھے سانس لینے میں تکلیف ہو رہی ہو۔

''ڈیڑھ دو سو کا خرچہ؟'' یہ تو میں نے کبھی سوچا ہی نہیں تھا۔

وہ سوال جو کہیں منھ چھپا کے بیٹھ گیا تھا، پھر اچانک اچھل کر باہر آ گیا: ''اب کیا ہوگا؟''

یہ بات نہیں تھی کہ خاندان میں ایسا کوئی نہیں تھا جو یہ چھوٹی سی رقم دے سکتا۔ ماشاءاللہ زیادہ تر رشتے دار وہ تھے جنھیں بڑا آدمی کہا جاتا ہے، مگر ہر بڑے آدمی کی طرح ان میں بھی یہ کمزوری تھی کہ چھوٹی چھوٹی باتوں پر دھیان نہیں دیتے تھے، اور یہ تو بہت ہی چھوٹی سی بات تھی کہ ایک لڑکا کسی وجہ سے وہاں نہیں جا سکتا جہاں وہ جانا چاہتا ہے۔ اتنی معمولی سی بات پر تو سوچنے کا وقت بھی نہیں تھا کسی کے پاس۔

میں جانتا تھا کہ دادی کسی کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلائیں گی۔ انھوں نے جس آن بان سے فاقے کیے، تنگ دستی کی تاریخ میں اس کی مثال نہیں مل سکتی۔ چنانچہ میں نے وہی کیا جو ایسے موقعوں پر ہمیشہ کرتا تھا۔ سائیکل اٹھائی اور باجی کے گھر جا پہنچا۔

باجی نے پوری کہانی سنی، میری آنکھوں کی سرخی اور پلکوں کی نمی بھی دیکھی مگر کچھ بولیں نہیں۔ چپ چاپ چائے کی چسکیاں لیتی رہیں، اور اس کانٹے کو دیکھتی رہیں جو کونے میں بیٹھی ہوئی جگالی کر رہی تھی اور دم سے مکھیاں اڑاتی جا رہی تھی۔

شام ہو رہی تھی، بھائی کے آنے کا وقت بھی ہو چکا تھا۔ میں جانے کے لیے اٹھا تو باجی نے روک لیا۔ ''ذرا دیر ٹھہر جاؤ، میاں جی آتے ہی ہوں گے مل کے جانا۔'' مجھے تھوڑا سا تعجب ہوا کیونکہ باجی کو معلوم تھا، میں بھائی کا سامنا کرنے سے گھبرتا ہوں اور وہ بھی مجھے دیکھ کر کسی خوشی کا اظہار نہیں کرتے۔ میں نے بہانہ بنایا اور جانے لگا۔ مگر بھائی ایک دم سے اندر آ گئے۔ انھوں نے سلام دعا کرتے کرتے اپنی شیروانی اور ٹوپی اتاری، اور نل کے سامنے وضو کرنے کے لیے بیٹھ گئے۔ پاؤں دھوتے دھوتے اچانک میری طرف مڑے اور پوچھا: ''کیا ہوا تمھارے بمبئی جانے کا؟''

''جی وہ...'' میں اس کے آگے نہیں بول سکا۔ باجی نے کم سے کم لفظوں میں بتایا کہ ''جانا تو طے ہے، مگر ابھی تک کرائے کا بھی انتظام نہیں ہوا ہے۔ دو چار جوڑے کپڑے اور ایک آدھا اچھا جوتا بھی چاہیے ہوگا۔'' بھائی نے ایک لمبی سی ''ہوں'' کی اور بولے، ''میں نے رام دین سے کہہ دیا ہے، وہ اجوان لے کر آئے گا، گائے کو کھلا دینا۔ دو دن سے چارا چھوڑ رہی ہے، شاید پیٹ خراب ہے۔'' اور مصلّیٰ بچھا کے نماز کی نیت باندھ لی۔ مجھے معلوم تھا وہ کچھ نہیں کہیں گے اور نہ کچھ کریں گے۔ انھیں مجھ سے زیادہ اپنی گائے کی پروا ہے جس کا پیٹ خراب ہے؛ کسی کی زندگی خراب ہو رہی ہے تو کیا فرق پڑتا ہے۔ میں چپکے سے باہر نکلا، سائیکل اٹھائی اور اس کچی سڑک پر ہو لیا جو میرے گھر کی طرف جاتی تھی۔

کئی دن تک ایسا لگا جیسے بمبئی ٹوٹ ٹوٹ کر میرے اوپر گر رہی ہے۔ وہ ساری تصویریں جو آنکھوں میں تیرتی تھیں، اب ڈوبتی اور ابھرتی ہوئی دکھائی دیتی تھیں۔ کتابوں میں دل لگایا مگر نہیں لگا۔ کچھ لکھنے کی کوشش کی مگر لفظوں نے ہڑتال کر دی۔ کمبخت پکڑ ہی میں نہیں آتے تھے۔ اور ایک دن رضا لائبریری کی سیڑھیوں پہ ایک ناول کے سہارے صبح سے شام کرنے کے بعد جب گھر لوٹا تو اماں یعنی میری دادی نے بتایا کہ ''کنور صاحب کا نوکر آیا تھا۔ یہ پچاس روپے دے گیا ہے تمھارے ریل کے ٹکٹ کے لیے۔'' ساری مردہ امیدیں زندہ ہو گئیں۔ اس دن سمجھ میں آیا کہ سوکھے دھان میں پانی پڑنے کا مطلب کیا ہوتا ہے۔ مگر پھر فوراً ہی اس خیال سے دل بیٹھ گیا کہ پچاس روپے میں کیا ہوگا۔ اور بھی کتنی چیزیں ہیں جن کا ہونا ضروری ہے۔ اور بمبئی جیسی جگہ میں خلافت جیسے اخبار میں کام کرنے والے کے پاس اگر اچھے کپڑے نہ ہوں تو کتنی بے عزتی ہوگی۔ ابو کی الماری کھول کر ان کے کپڑوں کا جائزہ لیا تو ہاتھ کی بنی ہوئی کھادی کے کرتے پاجاموں کے سوا کچھ ہاتھ نہ آیا۔ وہ بھی دو تین ہی تھے۔

Scanned with CamScanner

ایک کونے میں سے شارک اسکن کی دو پتلونیں مل گئیں جن کے کل، زنگ کھا کے کپڑے سے چپک گئے تھے۔ پتا نہیں کب سے کسمپرسی کے عالم میں پڑی ہوئی تھیں۔ اس الماری میں کچھ جوتے بھی تھے مگر وہ میرے لیے بے کار تھے کیونکہ ابو کا پاؤں مجھ سے ایک نمبر چھوٹا تھا، لیکن ان کے پٹھانی سینڈل کام آگئے کیونکہ وہ پیچھے سے کھلے ہوئے ہوتے ہیں اور ایڑی ذرا سی باہر بھی رہے تو کون دیکھتا ہے۔ پتلونیں چھوٹی کرنے کو دے دیں اور سینڈل پر پالش کرتے ہوئے اللہ کا شکر ادا کیا کہ ابو صرف قرضے ہی چھوڑ کر نہیں مرے تھے، کچھ جوتے اور پرانے کپڑے بھی چھوڑ گئے تھے۔

کبھی کبھی مجھے لگتا تھا کہ میرے اندر ایک نہیں، دو آدمی ہیں۔ ایک تو بچہ ہے جو پڑھنا چاہتا ہے، پڑھنا چاہتا ہے، ترقی کرنا چاہتا ہے، جس کے خواب ہیں اور خوابوں کو پورا کرنے کی ہمت بھی۔ دوسرا وہ بوڑھا ہے جو پیدا ہی بوڑھا ہوا تھا، جس نے زندگی کے چہرے کی ساری جھریاں بہت قریب سے دیکھی ہیں، جس نے توہین دیکھی ہے، بھوک دیکھی ہے، بے بسی دیکھی ہے، اور وہ خود بھی دیکھتا ہے جو ہر وقت زمین پہ سیدھا رکھتا ہے، جو بہت ہوشیار اور تجربہ کار ہے۔ یہ بوڑھا اس بچے کو سمجھاتا رہتا ہے ''جو تو سوچ رہا ہے وہ نہیں ہو سکتا۔ تو ہوا کو پکڑنے کی کوشش کر رہا ہے۔ پیا ہوا گر تو بھی نہیں جا سکتا۔ پڑھنے کے لیے بھی پاس سرمایہ ضروری نہیں ہے۔ جنھیں پڑھنا ہوتا ہے وہ اس چھوٹے سے شہر میں رہتے ہوئے بھی پڑھ لیتے ہیں...'' مگر وہ بچہ بڑا ہی ضدی تھا۔ میں نے بھی طے کر لیا تھا کہ چاہے کچھ ہو جائے مگر بی کام ضرور کروں گا۔ پچاس روپے میرے پاس ہیں، کچھ کپڑوں جوتوں کا بندوبست بھی ہے، ایک پرانا سوٹ کیس بھی مل گیا ہے، یعنی آدھا مسئلہ تو حل ہو چکا ہے۔ اب اگر تھوڑے سے پیسے مل جائیں تو اتنا پریشان ہونے کی کیا ضرورت ہے۔

میں نے سوچنا شروع کیا کہ ایسا کون ہے جو کچھ پیسے ادھار دے دے۔ میرا دوست شکیل دے سکتا تھا۔ سبزی منڈی میں اس کے باپ کی آموں کی آڑھت تھی۔ مگر اس سال آم کی فصل بہت خراب ہوئی تھی۔ سارے بیوپاری پریشان تھے۔ اس لیے فہرست سے شکیل کا نام کاٹ دیا گیا۔ دوسری امید نور ظفر علی خان سے تھی۔ وہ ابو کے گہرے دوست تھے، پچاس روپے بھیج بھی چکے تھے۔ اگر تھوڑی سی مدد اور دے دیتے تو... مگر پتا چلا کہ وہ گرمیاں گزارنے کے لیے نتھیا گلی جا چکے ہیں اور دو مہینے بعد لوٹیں گے۔ ان کا نام بھی کٹ گیا۔ تیسرا نام باقی تھا مگر جیسے ہی ہمدانی کی شکل آنکھوں میں

Scanned with CamScanner

آئی، ان کا نام خود بخود کٹ گیا۔ اب لے دے کے بچی تھیں میری پھوپھی، جو دوسرے شہر میں رہتی تھیں مگر شہر زیادہ دور نہیں تھا۔ رامپور اور مراد آباد کے بیچ کا فاصلہ کوئی بائیس پچیس میل ہے۔ یعنی اگر کوشش کی جائے تو امیدوں کے پیڑ میں پھل آسکتا ہے۔

میں کئی دن تک اپنی پھوپھی اور پھوپھا کے بارے میں سوچتا رہا۔

آج اتنی عمر گزر جانے کے بعد بھی اپنے ذہن پہ زور ڈالتا ہوں تو ایسا کوئی لمحہ یاد نہیں آتا جس میں ان دونوں بزرگوں کو ہنستے دیکھا ہو۔

پھوپھی کی صورت بری نہیں تھی۔ سانولی تھیں مگر جوانی میں خوبصورت رہی ہوں گی۔ چہرے پہ ہمیشہ ایسا ایکسپریشن رہتا تھا جیسے دنیا سے بیزار ہوں اور ہر چیز بری لگ رہی ہو۔ تھوڑی دیر کے بعد ماتھے پر بل پڑتے رہتے تھے اور ایک بل تو ایسا جم گیا تھا جیسے آئینے میں بال آگیا ہو جسے نکالا ہی نہیں جا سکتا۔ میں اپنے پھوپھا کو "باپو" کہا کرتا تھا کیونکہ ان کے بچے بھی یہی کہتے تھے۔ پتا نہیں ایک روایتی مسلمان گھرانے میں یہ لفظ کیسے گھس گیا۔ ہو سکتا ہے یہ اس وقت کی ملی جلی تہذیب کا اثر ہو آج کل جس کے کھنڈر بھی نہیں دکھائی دیتے۔ باپو بڑے آدمی تھے یعنی افسر خزانہ (ٹریژری آفیسر) تھے اور ایک بڑی سی کوٹھی میں رہتے تھے۔ چہرے مہرے میں بھی کوئی چیز چھوٹی نہیں تھی۔ بڑا سا ماتھا، بڑی بڑی آنکھیں، اونچی ناک جس کے نیچے جو دانت تھے وہ بھی غیر معمولی بڑے تھے۔ باپو کے ایک دوست ہوا کرتے تھے، عابد صاحب، جو مولانا شوکت علی کے بیٹے تھے اور چھوٹے موٹے شاعر بھی تھے۔ انھوں نے باپو کا ایک قصیدہ لکھا تھا جو آج بھی میرے پاس ہے۔ اس کا مطلع ہے:

کہوں کیا ان کے بارے میں شجاعت جن کے سالے ہیں
مرے اللہ نے ان کو دیے بتیس بھالے ہیں

انھیں بھی میں نے کبھی ہنستے یا مسکراتے نہیں دیکھا۔ دبدبہ ایسا تھا کہ جب گھر میں آتے تھے تو پنجرے کا طوطا بھی بولنا بند کر دیتا تھا۔ چاروں طرف ایک سناٹا پھیل جاتا تھا۔ بچے کتابیں لے کر اس طرح بیٹھ جاتے تھے جیسے وہ کتابیں نہیں ان کے جسم کا کوئی حصہ ہوں۔ میں نے ان دونوں کو آپس میں باتیں کرتے بھی نہیں دیکھا۔ کبھی کبھار دو چار جملوں کا تبادلہ ہوتا بھی تھا تو اس طرح کہ پھوپھو دیوار کی طرف منہ کرکے کہتیں: '''چھمی کے ہاں بچہ ہوا ہے، سہوارہ جانا پڑے گا۔'' اور باپو حقے کی چلم کو مخاطب

Scanned with CamScanner

کر کے جواب دیتے: "بچوں کی چھینوں میں سوچیں گے..." کتنی حیرت انگیز بات ہے کہ دونوں میں ایک قانونی رشتے کے سوا کوئی رشتہ نہیں تھا، پھر بھی آٹھ بچے پیدا ہوئے اور کوئی ذہنی ہم آہنگی نہ ہوتے ہوئے بھی اولادوں کو اچھی تعلیم بھی دی اور عمدہ تربیت بھی۔ پھوپھی کے گھر جانے اور ان سے پیسے مانگنے کا تصور ہی ہمت توڑ دینے کے لیے کافی تھا، حالانکہ ان کی حقارت بھری نظریں کوئی نئی چیز نہیں تھیں اور نہ ہی وہ جملے انوکھے تھے جن سے تیزاب کی بو آتی تھی۔ میرے بارے میں ان کی رائے تھی کہ میں آوارہ لڑکوں کے ساتھ گھومتا ہوں، گندے ناول پڑھتا ہوں اور کام چور ہوں۔ ان کی پیشین گوئی تھی کہ یہ کچھ نہیں کر سکتا۔ ایسے ہی جوتیاں چٹخاتا پھرے گا اور کرے گا بھی تو رکشہ چلائے گا یا بیڑیاں بنائے گا۔ اس وقت یہ باتیں بلیڈ کی طرح کاٹ دیا کرتی تھیں، آنکھوں میں آنسو آ جایا کرتے تھے، مگر اب سوچتا ہوں تو لگتا ہے شاید میرے مستقبل کے بارے میں ان کی پریشانی نے جلی کٹی کا روپ لے لیا تھا۔ مگر اس وقت تو ان کی جلی کٹی کو برداشت کر لینا بڑا مشکل کام تھا۔ میں نے اپنے دل کو سمجھایا کہ آخر اپنی سگی پھوپھی ہیں، اگر کھری کھوٹی سنا بھی دیں گی تو کیا فرق پڑ جائے گا۔

میں نے ایک دوست سے سائیکل مانگی اور مراد آباد کے لیے چل پڑا۔ یہ سائیکل ان سائیکلوں میں سے تھی جو دو تین نسلوں کی سواری کے بعد بھی چوں تک نہیں کرتی تھی۔ نہایت بھاری بھرکم فولادی بنی ہوئی مشین تھی۔ گدی تنی چوڑی تھی کہ موٹے آدمی کو بھی تکلیف نہ ہو، اور اتنی اونچی تھی کہ میرے پیر پیڈل سے دو انچ چھوٹے پڑ گئے تھے جس کی وجہ سے پاؤں کو ٹیڑھا کر کے پنجوں کے بل چلانا پڑ رہا تھا۔ سائیکل میں کریٹ لگا ہوا تھا جس کے دونوں طرف لوہے کے چھوٹے چھوٹے ہُک لٹکے ہوئے تھے۔ شاید یہ ہُک سامان ڈھونے یا کوئی چیز لٹکانے کے کام آتے ہوں گے۔ جب سائیکل چلتی تھی تو یہ ہُک اچھل اچھل کر بیک گراؤنڈ میوزک دینے لگتے تھے۔ ان کی آواز سے سڑک کے اچھے یا برے ہونے کا اندازہ لگایا جا سکتا تھا۔ اس قدیم پشتینی سائیکل کی ایک خوبی یہ بھی تھی کہ ہر دس پندرہ منٹ کے بعد چین اتر جایا کرتی تھی۔ نتیجے میں بار بار اترنا پڑتا تھا اور چین چڑھا کر احتیاط سے پیڈل مارنے پڑتے تھے تاکہ وہ نازک مزاج چین دوبارہ ناراض نہ ہو جائے۔ سارے رستے چین اترنے اور سائیکل سے میرے اترنے کا سلسلہ جاری رہا۔

بعد میں جب پطرس بخاری کا مضمون پڑھا جس میں ایسی ہی کسی سائیکل کا ذکر ہے تو شک ہوا

Scanned with CamScanner

کہ کہیں موصوف نے اسی عجوبہ سائیکل کی سواری تو نہیں کی تھی جو میرے حصے میں آئی تھی۔ دنیا بہت چھوٹی ہے اور یہاں کچھ بھی ہو سکتا ہے۔

مرادآباد تو کئی بار گیا تھا مگر سائیکل پر کبھی نہیں گیا تھا۔ چونکہ دل کو لگی ہوئی تھی اس لیے بھٹکتے بھٹکتے ڈپٹی گنج تک پہنچ ہی گیا جہاں افسر خزانہ کی کوٹھی تھی۔ جب اندر گھسا تو حال یہ تھا کہ ہاتھوں میں چین کا گریس لگا ہوا تھا، پاجامے کے پائنچے بھی کالے ہو گئے تھے، سر کے بال مٹی اور پسینے سے اکڑ کر کھڑے ہو گئے تھے اور جون کی تپتی ہوئی دوپہر چہرے کا جو حال بنا سکتی تھی وہ بنا چکی تھی۔

پھوپھو نے مجھے دیکھا اور اپنے دونوں ہاتھ کمر پہ رکھ کے اس طرح کھڑی ہو گئیں جیسے یہ سمجھنے کی کوشش کر رہی ہوں کہ یہ جانور اندر کیسے گھس آیا: ''خیریت؟'' انھوں نے پوچھا۔ ''یہاں کیسے آ گئے؟''

''جی، آپ سے کچھ کام تھا۔''

انھوں نے سر ہلایا۔ ''جاؤ، پہلے ہاتھ منھ دھوؤ، غسل خانہ سامنے ہے۔''

جب میں نے آنے کی وجہ بتائی تو وہ بہت دیر تک چپ رہیں۔ پھر بولیں: ''شام کو پاپا آئیں گے تو بات کروں گی۔'' مگر ان کے ماتھے کے بل اور چہرے کی بیزاری صاف بتا رہی تھی کہ جواب کیا ہوگا۔

کتنی عجیب بات ہے کہ جس پھوپھی نے حقارت کے سوا کبھی کچھ نہیں دیا اس کے بچوں نے اتنی محبت دی کہ رشتوں کا مطلب بدل گیا۔ آصفہ اور عادل کے لیے تو پتا نہیں میں کیا تھا۔ دونوں جب بھی مجھے دیکھتے تھے، ان کی آنکھوں میں ستارے اتر آتے تھے۔ آصفہ زبان کی بہت تیز تھی، ہر وقت لڑنے مرنے کے لیے تیار رہتی تھی، مگر مجھ سے بے حد پیار کرتی تھی بلکہ اب بھی کرتی ہے۔ اور عادل کا تو فرینڈ، فلاسفر، گائیڈ، سب کچھ میں ہی تھا۔ شام کو جب پاپو آئے تو انھیں سلام کرنے کے بعد میں غائب ہو گیا اور رات گئے تک ان دونوں بہن بھائی کو جھوٹے سچے قصے اور لطیفے سنا کر ہنساتا رہا۔ اور دوسرے دن جب بچے اسکول چلے گئے اور پاپو آفس، تو میں نے ڈرتے ڈرتے کہا: ''اچھا، میں بھی چلتا ہوں۔''

پھوپھو نے میرے سر پہ ہاتھ پھیرا اور کہا: ''دیکھو بیٹا، ہمارے باپ دادا بھی کوئی جائیداد چھوڑ کر تو مرے نہیں تھے۔ تمھارے پاپو کیسے ہیں، تم اچھی طرح جانتے ہو۔ ایک پیسہ رشوت نہیں لیتے۔ جو کچھ ہے بس ان کی تنخواہ ہے۔ مجھے معلوم ہے، کنور صاحب نے پچاس روپے بھجوا دیے ہیں۔ تم سچ سچ بتاؤ، تمھیں کتنے پیسے کی ضرورت ہے۔ جھوٹ مت بولنا۔''

Scanned with CamScanner

میں نے اپنے کریس لگے پاجامے کو دیکھا جو چھین میں آتے آتے کئی جگہ سے پھٹ بھی گیا تھا۔ "پھوپھو، میرے پاس کپڑے نہیں ہیں۔" ان کے ہونٹوں پر ایک عجیب سی مسکراہٹ آ گئی۔ صاف لگ رہا تھا کہ انھیں میری بات پر یقین نہیں آیا تھا۔

پھوپھو نے پانچ پانچ کے کچھ نوٹ میرے ہاتھ پر رکھ دیے۔ "یہ لو۔ سنبھال کر لے جانا۔"

ڈبی گنج سے نکلتے نکلتے جب پہلی بار چھین اتری تو میں نے جیب سے نکال کر گنے۔ پانچ پانچ کے چار نوٹ تھے۔ بیس روپے کی خطیر رقم جو میری پھوپھی نے مجھے اپنا مستقبل تعمیر کرنے کے لیے دی تھی۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں کیا کروں۔ لوٹ کر جاؤں اور روپے واپس کر دوں یا چپ چاپ رکھ لوں۔ سوچتے سوچتے کوئی کے پل پر آ گیا جس کے بعد ریلوے اسٹیشن ہے۔ بہت سی بسیں گاڑیاں اور ٹرک رکے ہوئے تھے۔ دو چار سائیکلیں بھی تھیں۔ مجھے بہت سے بھکاریوں نے گھیر لیا اور میں انھیں دیکھ دیکھ کر مسکراتا رہا۔ ان بیچاروں کو کیا معلوم کہ میری حالت ان سے زیادہ خراب ہے۔ اچانک میری نظر پانچ چھ برس کے ایک بچے پر پڑی جو کیلے والے سے ایک کیلے کی بھیک مانگ رہا تھا۔ مجھے پتا نہیں کیا ہوا۔ میں نے اسے پاس بلایا اور پانچ پانچ کے دو نوٹ اس کے ہاتھ میں رکھ دیے۔ میں اس بچے کے چہرے کا ایکسپریشن کبھی نہیں بھول سکتا۔ بہت دیر تک تو ایسا لگا جیسے وہ فریز (freeze) ہو گیا ہے۔ پھر چونک کر تیزی سے بھاگا اور نہ جانے کہاں غائب ہو گیا۔ میں جب شہر پہنچا تو رات ہو چکی تھی مگر متھرا حلوائی کی دکان جاگ رہی تھی۔ میں نے دکان سے ملائی والا گرم دودھ پیا، ایک دو تار بڑی لگائی، اور جب میں اس کی دکان سے اٹھا تو دل بڑا ہلکا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے میں پھوپھو سے اپنا حق لے چکا ہوں۔ دس روپے ختم ہو چکے تھے۔

دو چار دن بعد میں نے شہر کے بکنگ آفس سے بمبئی کا ٹکٹ خرید لیا۔ ریزرویشن کے ساتھ چھبیس روپے پچاس پیسے کا ٹکٹ تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ ساڑھے تین روپے پھر بھی باقی تھے، حالانکہ سفر بہت لمبا تھا۔ اس زمانے میں دادر ایکسپریس سب سے سستی ٹرین تھی اور سب سے سست بھی۔ دلی سے بمبئی تک یہ اڑتیس گھنٹے میں پہنچتی تھی۔ یعنی دیکھ بھال کر خرچ کیا جائے تو راستہ تو کٹ ہی جائے گا، باقی اللہ مالک ہے۔ شام تک یہ خبر سب کو مل چکی تھی کہ میں آج جا رہا ہوں اور ٹکٹ بھی آ چکا ہے۔

دو دن بعد جب ایک جہاں دیدہ بزرگ مجھے سمجھا رہے تھے کہ بڑے شہروں میں کس طرح

Scanned with CamScanner

رہنا چاہیے، کن باتوں سے بچنا چاہیے اور کس طرح کام نکالنا چاہیے، کہ بھائی آ گئے۔ وہ کافی خوش نظر آ رہے تھے۔ ''کب جا رہے ہو؟''

''تیرہ تاریخ کا ٹکٹ ہے۔''

''تیاری ہو چکی؟''

میرا دل چاہا کہ انھیں ایک موٹی سی گالی دوں۔ انھیں اچھی طرح معلوم ہے کہ جب کچھ ہے ہی نہیں تو تیاری کس بات کی کی جائے گی۔ دو مہینے ہو گئے اس بھاگ دوڑ میں، مگر پرانے سوٹ کیس کے اندر ابو کی دو پرانی پتلونوں اور میرے دو کپڑوں کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔ اتنے سے سامان کے لیے سوٹ کیس لے جانا بھی سوٹ کیس کی توہین ہے، یہ سب تو پلاسٹک کی ایک تھیلی میں آ سکتا ہے۔ مگر میں چلتے وقت ایسی کوئی بات نہیں کرنا چاہتا تھا کہ بعد میں یہ حضرت باجی کو طعنے دیں اور کہیں کہ دیکھو، تمھارا بھائی کتنا نالائق ہے۔ میں نے کہا۔ ''آپ کو تو معلوم ہے...''

وہ کھڑے ہو گئے۔ ''چلو بازار چلتے ہیں۔'' میری سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ مجھے بازار کیوں لے جانا چاہتے ہیں۔ مگر بھابا، جو چپ چاپ سن رہی تھیں اور چھالیہ کاٹ رہی تھیں، اچانک بولیں، ''بھائی کے ساتھ جاتا کیوں نہیں؟ جا۔ لوٹتے ہوئے میرے لیے پان بھی لیتا آئیو۔''

بھائی نے چوک سے کچھ قمیصوں پاجاموں کا کپڑا دلایا، باٹا کا ایک جوڑ سینڈل اور گھر میں پہننے کے لیے ہوائی چپل خریدے گئے، کچھ اور ضروری چیزیں جیسے بنیان، رومال، ٹوتھ پیسٹ، برش وغیرہ... ہاں، ایک بڑی سی چار خانے والی چادر بھی تھی اور ایک ربر کا تکیہ جس میں منھ سے پھونک بھر کے پھلایا جا سکتا تھا۔

شوکت باجی نے راتوں رات پاجامے سی دیے، حبیبہ آپا قمیص سینے کی ایکسپرٹ تھیں، انھوں نے کاٹے بھی خود اور سیے بھی خود۔ اور ایسی فٹنگ دی کہ کوئی درزی بھی کیا دے گا۔ میرا سوٹ کیس بھر چکا تھا اور اس میں کسی چیز کی کمی نہیں تھی۔ یہاں تک کہ اماں نے اس میں ایک پھٹا ہوا کپڑا بھی رکھ دیا تھا، اور میرے پوچھنے پر بتایا تھا: ''ارے بچے، جوتے صاف کرے گا تو کیا رومال سے کرے گا؟''

یہ سب کچھ ہو رہا تھا مگر دل بار بار کہہ رہا تھا کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ وہ آدمی جس نے مجھے کبھی پسند نہیں کیا، سیدھے منھ بات نہیں کی، اچانک بدل کیسے گیا؟ یہ ہمدردی کہاں سے آ گئی؟ بھائی کی

Scanned with CamScanner

مہربانیوں کے پیچھے ضرور کوئی اور ہے، مگر کون ہو سکتا ہے، سمجھ میں نہیں آتا تھا۔

بہرحال، جب ساری تیاریاں مکمل ہو گئیں اور میں سب سے رخصت ہو لیا تو باجی اور بھائی سے ملنے کے لیے رضا شوگر فیکٹری پہنچا۔ اندر گھسا تو گھر کچھ بدلا بدلا سا نظر آیا۔ وہ گائے جو ہمیشہ دروازے کے ساتھ دم ہلاتی ہوئی ملتی تھی، غائب تھی۔ اس کا کوئی سامان بھی نہیں تھا اور صحن کو دھو کر صاف کیا جا چکا تھا۔

"گائے کہاں چلی گئی؟" میں نے باجی سے پوچھا۔

"بک گئی۔" انھوں نے جواب دیا۔

"کب؟"

"کئی دن ہو گئے۔"

مجھے یہ سمجھنے میں ایک سیکنڈ بھی نہیں لگا کہ گائے کیوں بیچ دی گئی۔ تب تک بھائی کمرے سے باہر آ چکے تھے۔ میں نے ان سے کہا:

"آپ نے گائے بیچ دی؟"

"ارے بھائی، گائے کا کیا ہے، پھر آ جائے گی۔ تمھارا جانا زیادہ ضروری ہے۔ جاؤ، اللہ تمھیں کامیاب کرے۔"

میں ان سے لپٹ گیا اور وہ آنسو جو ابو کی موت پر بھی نہیں گرے تھے اچانک بہہ نکلے۔ تبھی مجھے باجی کی آواز سنائی دی:

"بڑا رونا دھونا ہے، مرد بچہ ہے۔ چپ ہو جا؟"

میں نے باجی کی طرف دیکھا۔ ان کا سانولا چہرہ دمکا ہوا تھا اور مسکراہٹ دور تک پھیلی ہوئی تھی۔

جب کبھی یہ آدھی صدی پرانا قصہ یاد آتا ہے، تو سوچتا ہوں کہ ہم لوگ دوسروں کے بارے میں اپنی رائے بنانے میں کتنی جلدی کرتے ہیں اور پھر اس پر قائم بھی رہتے ہیں۔ ذرا نہیں سوچتے کہ یہ رائے غلط بھی ہو سکتی ہے۔

تو چہ دانی کہ دریں گرد سوارے باشد

❀❀

اپنے کامریڈ حبیب

جس دن سے بمبئی آیا اور ترقی پسند ادیبوں، شاعروں سے میل جول بڑھا تو ایک نام بار بار کانوں میں پڑتا رہا، وہ نام تھا حبیب تنویر کا۔ پہلی بار ان کو ایک ادبی نشست میں دیکھا۔ انھوں نے ایک غزل سنائی جس کا مطلع شاید کچھ اس قسم کا تھا:

اپنے ساتھیوں کا غم، اپنی زندگی کا غم، کیا یہ زندگانی ہے
انقلاب کی آمد، آمد بہاراں ہے، وجہ شادمانی ہے

غزل نہ مجھے پسند آئی نہ دوسروں کو۔ بالفاظِ دیگر، یوں کہنا چاہیے کہ حبیب صاحب کا فرسٹ امپریشن کوئی بہت خاص نہیں رہا اور میں نے اپنے دل میں سوچا، ان ترقی پسندوں کی تو عادت ہے، اپنے ساتھیوں کو جھنڈے پہ چڑھا کے رکھتے ہیں۔ اب ان حبیب صاحب میں ایسی کون سی خاص بات ہے کہ جسے دیکھو وہ حبیب تنویر حبیب تنویر کرتا رہتا ہے۔

1968 میں اپٹا (IPTA) نے تیج پال ہال کرائے پہ لے لیا تھا جس میں ہر ہفتے کو اپٹا کا ایک ڈراما پیش کیا جاتا تھا۔ ایک تو بمبئی میں ویسے ہی ہندی اردو کا ڈراما دیکھنے والے بہت کم ہیں، اوپر سے اپٹا کا نام، زیادہ تر لوگ یہ سمجھتے تھے کہ ڈراما وراما تو خاک ہوگا، کمیونسٹ پارٹی کا پروپیگنڈا ہوگا، اس لیے لوگ بہت کم جاتے تھے اور ہر ہفتے نقصان اٹھانا پڑتا تھا۔ اس زمانے میں کیفی صاحب کو، جو اپٹا کے صدر تھے، یہ ترکیب سوجھی کہ اگر دیکھنے والے خود نہیں آتے تو انھیں لایا جانا چاہیے۔ چنانچہ بمبئی سینٹرل کے بازاروں اور پتلی پتلی گلیوں نے ایک عجیب و غریب منظر دیکھنا شروع کیا کہ ایک لمبے چوڑے بڑے بڑے بالوں والے کیفی اعظمی اور ان کے ساتھ ایک نہایت دبلا پتلا چشمے والا لڑکا، یعنی میں، دکان دکان اور مکان مکان اپٹا کے ناٹکوں کے ٹکٹ بیچتے پھر رہے ہیں۔ لوگ کیفی صاحب کے

Scanned with CamScanner

احترام میں، اور کچھ اس خیال سے بھی کہ وہ خود آئے ہیں، ٹکٹ تو لے لیا کرتے تھے مگر آتے جاتے نہیں تھے۔ اس دوران جب میں اور کیفی صاحب سڑکوں کی خاک چھانا کرتے تھے، ان سے باتیں کرنے اور بہت کچھ سیکھنے جاننے کا موقع ملا۔ کیفی صاحب کم بولتے تھے، مگر جو بھی بولتے تھے وہ پاتا بھی ہوتا تھا اور وزنی بھی۔ ایک دن نہ جانے کیسے حبیب تنویر کا ذکر آ گیا۔ مجھے معلوم تھا کہ حبیب صاحب اور کیفی اعظمی نہ صرف یہ کہ ہم خیال اور ہم مشرب ہیں بلکہ اچھے دوست بھی ہیں۔ پھر بھی میں نے حبیب صاحب کے بارے میں کیفی صاحب کی رائے پوچھ ہی لی۔ کیفی صاحب نے کوئی جواب نہیں دیا، اور چپ چاپ چلتے رہے۔ میں نے عرض کیا "حبیب صاحب کی شاعری کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟" کیفی صاحب کچھ سوچتے رہے، پھر دھیرے سے بولے "برے اور بے تُکے شعر نہیں کہتے ہیں۔ لیکن حبیب کو جاننا ہے تو ان کی شاعری نہیں، ان کے ناٹک دیکھیے۔ حبیب کی اصلی پہچان وہی ہیں۔"

اور پھر یوں ہوا کہ میں نے چرن داس چور دیکھا۔ میری سمجھ میں آج تک نہیں آیا کہ اس ناٹک میں وہ کون سی چیز تھی جس نے میرے حواس پر جادو کر دیا تھا۔ کیا وہ اسکرپٹ تھا؟ کیا وہ چھتیس گڑھی ایکٹروں کا پرفارمنس تھا؟ کیا وہ ڈائریکشن تھی؟ کیا وہ میوزک تھا؟ پتا نہیں کیا تھا، مگر میں آج تک چرن داس چور کے طلسم سے باہر نہیں آ سکا ہوں۔ اس دن میں نے حبیب صاحب کو ایک نئی روشنی میں دیکھا۔ ناٹک تو میں نے بہت سے دیکھے تھے، پڑھے بھی تھے، مگر تب تک یہ راز معلوم نہیں ہوا تھا کہ اچھا ناٹک صرف ایک ناٹک نہیں ہوتا، وہ ایک احساس ہوتا ہے جسے لفظوں میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔

اس کے بعد میں نے حبیب صاحب کے تقریباً تمام ہی ناٹک دیکھے، سوائے پونگا پنڈت اور شکنتلا کے، جن کی حسرت رہ گئی۔

یہ تو سب جانتے ہیں کہ ناٹک کے عناصرِ اربعہ کیا ہیں۔ الفاظ، اداکار، اسٹیج اور ناظرین۔ مگر وہ روح جو کسی ناٹک کے اندر بیدار ہوتی ہے اس کے لیے ایک ایسے ہدایت کار کا ہونا بہت ضروری ہے جو ان تمام چیزوں کو اس طرح جمع کرے کہ وہ زندہ ہو جائیں۔ اور حبیب تنویر کی یہی صفت انھیں ایک ممتاز اور منفرد حیثیت دیتی ہے۔ انھوں نے ڈراما نگاری میں جو تجربے کیے سو تو کیے ہی، ڈرامے

Scanned with CamScanner

کی پیشکش کو ہزاروں سال پرانے لگے بندھے اصولوں سے ہٹا کر نئے راستوں پر ڈالنے کی جو کوشش انھوں نے کی، ان سے پہلے کبھی نہیں کی گئی۔ مثال کے طور پر آگرہ بازار کو لے لیجیے، یہ ڈراما گرنا ٹک نہیں ہے لیکن یہ کسی اسٹیج کا محتاج بھی نہیں ہے۔ آگرہ بازار ایک انوکھا تجربہ ہے۔ اس میں ناٹک کی تمام ضروریات اور روایات کا پورا خیال رکھا گیا ہے مگر اس کے باوجود یہ ایک روایتی ناٹک نہیں ہے۔ حبیب صاحب نے نظیر اکبرآبادی کی نظموں کو جوڑ کر ایک ایسا ماحول تخلیق کیا ہے جو نہ صرف اپنے زمانے کی عکاسی کرتا ہے بلکہ نظیر کی شخصیت بھی اپنی تمام خوبصورتی، توانائی اور تاثر کے ساتھ پوری طرح ابھر کر آتی ہے، اور کمال یہ ہے کہ نظیر خود کبھی اسٹیج پر نمودار نہیں ہوتے۔ اچھے ناٹک کا ایک کمال یہ بھی ہوتا ہے کہ ہمیں وہ چیز بھی دکھائی دینے لگتی ہے جو موجود نہیں ہوتی۔

میں نے آگرہ بازار کے کئی شوز دیکھے ہیں اور ہر مرتبہ کچھ تبدیلیاں، کچھ اضافے نظر آئے ہیں۔ حبیب صاحب کی عادت تھی کہ وہ اپنے ڈراموں کی نوک پلک سنوارتے ہی رہتے تھے اور ہمیشہ کوشش کرتے رہتے تھے کہ ہر پرفارمنس پچھلے پرفارمنس سے بہتر ہو۔ کبھی کبھی تو وہ چلتے شو میں ردوبدل کر دیا کرتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ تقریباً تین گھنٹے لمبا آگرہ بازار دیکھنے والوں کو ایک پل کے لیے بھی اپنی جادوگری سے باہر نہیں آنے دیتا۔ ناظر اور منظر کا وہ رشتہ جس میں دونوں کی دوری ختم ہو جاتی ہے اور ناظر منظر کا ایک حصہ بن جاتا ہے، حبیب صاحب کے ناٹکوں کی ایک حیرت انگیز خصوصیت رہی ہے۔

بہت عرصے پہلے حبیب صاحب نے اپنا ہیڈ کوارٹر بھوپال کو بنالیا تھا اور وہ اپنے 'کنبے' کے ساتھ وہیں رہتے تھے، لیکن بمبئی اور بمبئی والوں سے ان کی محبت کا رشتہ کبھی ختم نہیں ہوا۔ جب بھی موقع ملتا، وہ بمبئی آجاتے، اور پرتھوی فیسٹول میں تو ضرور ہی آتے تھے۔ شاید ہی کوئی فیسٹول ہوگا جس میں حبیب صاحب نہ آئے ہوں۔ کبھی کوئی ناٹک لے کر آجاتے اور کبھی ناٹک دیکھنے چلے آتے۔ وہ جب بھی بمبئی میں ہوتے، دوستوں، چاہنے والوں اور عقیدت مندوں سے گھرے رہتے۔ عام طور پر تو وہ سنتے ہی رہتے تھے لیکن اگر کوئی ایسی بات بول دی جائے جس کا تعلق ان کی ذات یا ان کے کام سے ہو تو پھر بولتے بھی تھے اور خوب بولتے تھے۔ ان کی کھرکھراتی ہوئی آواز، بندیل کھنڈ کے پٹھانوں جیسا لہجہ اور دھاردار جملے سامنے والے کو دم لینے یا سنبھلنے کا موقع نہیں دیتے تھے، اور بہت کم

ایسا ہوتا کہ مقابل ہتھیار ڈالے بغیر بیٹھ گیا ہو۔ ان کی باتوں میں نہ سیاسی دوغلا پن ہوتا تھا جسے ڈپلومیسی کہا جاتا ہے اور نہ وہ خیال خاطر احباب کے باعث اپنی رائے کو گھما پھرا کر اور قابل قبول بنا کر پیش کیا کرتے تھے۔ غصہ بھی جلدی سے آ جاتا تھا اور کھری کھری سنانے سے کبھی نہیں ہچکچاتے تھے۔ میں چونکہ بھگت چکا ہوں، اس لیے مجھے معلوم ہے کہ حبیب صاحب کس طرح اچھے اچھوں کا پانی اتار دیا کرتے تھے۔

ایک دفعہ میں نے اپنے کام کے بارے میں ان کی رائے جاننا چاہی تھی۔ انھوں نے میرے تین ناٹک دیکھے تھے اور میری خوش بختی کہ انھیں تینوں ہی اچھے لگے تھے۔ 'تمھاری امرتا' کے بارے میں ان کی رائے تھی کہ اسے فوری طور پر شائع ہونا چاہیے اور یونیورسٹیوں میں پڑھایا جانا چاہیے۔ مگر وہ 'بیگم جان' سے کچھ زیادہ خوش نہیں تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ بیگم جان کے کردار میں جو گہرائی، وقار اور دبدبہ ہے وہ نکل کر نہیں آتا۔ میرا کہنا تھا کہ میں نے بیگم جان کے کردار میں کچھ دراڑیں چھوڑی ہیں جن میں سے بہت کچھ دکھائی دیتا ہے اور باقی تصور کے لیے چھوٹ جاتا ہے۔ مگر حبیب صاحب کی رائے تھی کہ دراڑیں اگر صرف دراڑیں رہتیں تو بہت خوبصورت لگتیں مگر کچھ دراڑیں کھڑکیاں اور دروازے بن گئیں۔ اصل میں میری کردار نگاری سے زیادہ انھیں نادرہ ظہیر ببر کی اداکاری پر اعتراض تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ کسی اداکار کو یہ حق ہی نہیں ہے کہ وہ کردار کی حدوں سے باہر نکل جائے۔ ان کے خیال میں ایسا وہی ہوتا ہے جو کیریکٹر کے اندر اترنے کے بجائے کیریکٹر کو اپنے اندر اتار لیتا ہے۔

مجھے یاد ہے، ایک ملاقات میں میں نے ان سے تھیٹر کی زبان کے بارے میں پوچھا تھا اور حبیب صاحب نے کہا تھا: ''تھیٹر کی زبان تھیٹر کی زبان ہوتی ہے۔ وہ ہندی ہوتی ہے نہ اردو۔ لکھنے والا چاہے اردو کا ادیب ہو یا ہندی کا لیکھک، اسے وہی زبان لکھنی ہے جو اس کا کردار بولتا ہے، اور کردار لکھنے والے کی نہیں اپنی زبان بولتا ہے۔'' میں سمجھتا ہوں کہ جو بات حبیب صاحب نے کہی وہ ان تمام ڈراما نگاروں کے لیے جو اسٹیج پر آ چکے ہیں یا آنے کی کوشش کر رہے ہیں، ایک نشانِ راہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ ڈرامے سے متعلق دوسرے مسائل پر بھی ان کی رائے صاف ستھری ہوتی تھی اور زیادہ تر ان کے اپنے تجربات کی بنیاد پر کھڑی ہوتی تھی۔ مثال کے طور پر وہ ہمیشہ اس بات کی وکالت

Scanned with CamScanner

کرتے تھے کہ اگر ہندوستان میں ناٹک کی اکھڑتی ہوئی جڑوں کو مضبوط کرنا ہے تو پروفیشنل تھیٹر کا قیام ناگزیر ہے۔ وہ کہتے تھے، ''کوئی بھی ایکٹر اس وقت تک اچھی ایکٹنگ نہیں کر سکتا جب تک اسے روٹی کپڑے کی فکر سے آزاد نہ کر دیا جائے۔'' ان کے ''نیا تھیٹر'' میں، اور اس سے پہلے ''ہندوستانی تھیٹر'' میں جو انھوں نے بیگم قدسیہ زیدی کے ساتھ مل کے بنایا تھا، زیادہ تر آرٹسٹ اور ٹیکنیشین تنخواہ دار ملازم تھے۔ ''نیا تھیٹر'' میں تو سارے کے سارے ایکٹر نہ صرف یہ کہ نوکر تھے بلکہ ان کے بال بچوں کی کفالت بھی تھیٹر ہی کیا کرتا تھا۔ رائے پور و بلاس پور کے چھتیس گڑھی بولنے والے انگوٹھا چھاپ ناچا کلاکار جو ہل چلاتے چلاتے اور سائیکل کے پنکچر جوڑتے جوڑتے حبیب صاحب کی بدولت بین الاقوامی سٹیج تک پہنچے اور عظیم شہرت پائی، صرف اس لیے کامیاب ہو سکے کہ انھیں ہل چلانے اور پنکچر جوڑنے کے لیے واپس نہیں جانا تھا۔

آج بمبئی شہر میں اردو، ہندی اور انگریزی کے ایک درجن سے زیادہ ڈراما گروپ ہیں جو سال بھر تک کچھ نہ کچھ کرتے رہتے ہیں مگر ان گروپس میں جو ایکٹر ہیں وہ سب شوقیہ ہیں۔ دن بھر کچھ اور کرتے ہیں اور شام کو ریہرسل یا شو کے ذریعے اپنا شوق پورا کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ تمام محنت کے باوجود ان میں وہ بات نہیں آسکتی جو اس ایکٹر میں ہوتی ہے جسے دنیا کی کوئی فکر نہیں ہوتی سوا اپنے کردار کے، اور اسی لیے حبیب صاحب آخری وقت تک اپنے 'کنبے' کو سمیٹے بیٹھے رہے، جس میں ان کی بیٹی نگین، بیوی مونیکا کے علاوہ دیپک، پونم، مالا بائی، رام چرن، ملوا، گووند اور نہ جانے کون کون شامل تھے۔

حبیب صاحب مارکسزم میں نہ صرف یہ کہ یقین رکھتے تھے بلکہ اس پہ عمل بھی کرتے تھے۔ ان کی کہنی اور کرنی میں کبھی کوئی فرق نہیں ہوتا تھا۔ ہم سب نے دیکھا ہے کہ ان کی اکلوتی بیٹی نگین تھیٹر کے دوسرے آرٹسٹوں کے ساتھ سفر کرتی تھی اور انھیں کے ساتھ ٹھہرائی بھی جاتی تھی۔ پروڈیوسر ڈائریکٹر کی بیٹی ہونے کے باوجود اسے یہ حق نہیں تھا کہ وہ کسی بہتر سلوک کا مطالبہ کر سکے۔

حبیب صاحب کو ناٹک کی دنیا نے ہی نہیں نوازا، اس دنیا نے بھی سر آنکھوں پہ بٹھایا جو اسٹیج سے باہر ہوتی ہے۔ انھیں درجنوں اعزازات دیے گئے، بڑے اور ذمے دار عہدے تفویض کیے گئے، پدم شری اور پدم بھوشن سے نوازے گئے، مگر وہ وہی رہے جو تھے۔ میرا خیال ہے 2005 کے

Scanned with CamScanner

نومبر کی بات ہے کہ پرانے ترقی پسند ادیب عنایت اختر کا فون آیا۔ کہنے لگے: "ارے بھائی، رات کو حبیب تنویر آ رہے ہیں میرے گھر۔ آپ بھی آ جائیے۔"

میں نے پوچھا: "کیوں آ رہے ہیں حبیب صاحب؟ کیا آپ کی مزاج پرسی کے لیے؟"

اختر صاحب بہت زور سے ہنسے۔ کہنے لگے: "مزاج پرسی تو بہانہ ہے، اصل میں وہ پائے کھانے آ رہے ہیں۔ یہ ان کا چالیس برس پرانا سلسلہ ہے۔ جب بھی بمبئی آتے ہیں اور موقع مل جاتا ہے تو میری بیوی کے ہاتھ کے پائے کھائے بغیر نہیں جاتے۔"

میں نے کہا: "زہے نصیب! حاضر ہو جاؤں گا۔"

اختر صاحب کہنے لگے: "بھئی میرے پاس پیسے نہیں ہیں، شراب آپ کو لانی پڑے گی۔"

میں نے وعدہ کر لیا اور رات کو اختر صاحب کے گھر پہنچ گیا۔ جے جے اسپتال کی ایک پتلی سی گلی میں ایک دو منزلہ عمارت ہے جس کا نام ہے صفیہ منزل۔ جس میں ابھی تک لکڑی کی سیڑھیاں ہیں جن پر دن میں بھی اندھیرا رہتا ہے۔ دوسری منزل پر عنایت اختر کا گھر ہے۔ اسے گھر کہنا تو بڑی زیادتی ہے کیونکہ یہ آٹھ فٹ بائی آٹھ فٹ کا کمرہ ہے جس میں ایک پرانی مسہری، ایک الماری، کونے میں ایک نل، اس کے برابر دو فٹ کا باورچی خانہ، زمین پر بچھا ہوا لینولیم اور دیواروں پر چپکی ہوئی سیلن ہے۔ یہ کل کائنات ہے اس آدمی کی جس نے اپنی زندگی کے ساٹھ سال ادب، صحافت و علم کی خدمت میں لگا دیے۔ ہم چھ سات آدمی لینولیم کے فرش پر جم گئے۔ حبیب صاحب نے کمر مسہری سے لگائی اور پائپ کی خدمت میں مصروف ہو گئے۔ میں نے اپنے بریف کیس میں سے بوتل نکالی اور دھک سے رہ گیا۔ غلطی سے وسکی آ گئی تھی اور مجھے معلوم تھا کہ حبیب صاحب رم پیتے ہیں۔ کچھ عجیب سی شرمندگی محسوس ہو رہی تھی، سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ بوتل بڑھاؤں یا واپس بریف کیس میں رکھ دوں۔ حبیب صاحب شاید تاڑ گئے کہ کچھ گڑبڑ ہے۔ "کیا ہے، کیا ہے؟ دکھائیے۔" یہ کہہ کر انھوں نے ہاتھ بڑھایا۔ میں نے بوتل ان کے ہاتھ میں دے دی اور دھیرے سے کہا: "سوری، یہ غلطی ہو گئی۔ نوکر سے رم رکھنے کے لیے کہا تھا، اس نے یہ رکھ دی۔ میں ابھی کسی کو بھیجتا ہوں، شاید کوئی دکان کھلی ہو۔"

حبیب صاحب نے وسکی کا لیبل دیکھا اور خوش ہو کر بولے: "بلیک اینڈ وہائٹ! ارے واہ

Scanned with CamScanner

واہ! آج تو یہی پئیں گے۔ اس کے ساتھ ہماری بڑی یادیں وابستہ ہیں۔ ہم اور بڑے بھائی یہی پیا کرتے تھے۔ رم کی عادت تو اس لیے لگ گئی کہ وہ ذرا سستی پڑتی تھی۔'' ایک قہقہہ پڑا اور ماحول بالکل بدل گیا۔ کسی کو خیال ہی نہیں رہا کہ ہمارے درمیان پدم بھوشن حبیب تنویر بیٹھے ہیں یا اپنا پرانا کامریڈ جو ممبئی میں اپنے قیام اور اپٹا کی پرانی سرگرمیوں کی کہانی سنا رہا ہے۔ میں نشے میں نہیں تھا مگر مجھے ایسا لگ رہا تھا کہ یہ آٹھ فٹ بائی آٹھ فٹ کا کمرہ بڑا ہوتا جا رہا ہے، اس کی دیواریں اونچی ہوتی جا رہی ہیں اور ایک عجیب سی روشنی پھیل رہی ہے جس سے اندھیرے میں ڈوبی ہوئی لکڑی کی سیڑھیاں تک منور ہو چکی ہیں۔ آہ! کیا یادگار رات تھی۔

میرا خیال ہے حبیب صاحب کی شخصیت کا آئینہ دار ان کا وہ بیگ تھا جو ہر وقت ان کے ساتھ رہتا تھا... یہ بیگ ویسا ہی تھا جیسے میڈیکل کمپنیوں کے ایجنٹ لے کر گھومتے ہیں۔ اس کے اندر پانچ خانے ہوتے تھے۔ پہلے خانے میں حبیب صاحب کے اسکرپٹ، ان کی نوٹ بک اور کچھ قلم ہوا کرتے تھے۔ دوسرے خانے میں ایک رجسٹر ہوتا تھا جس میں ''نیا تھیٹر'' میں کام کرنے والے تمام لوگوں کو دی گئی یا دی جانے والی رقموں کا اندراج ہوتا تھا اور اخراجات کی دیگر تفصیل لکھی ہوتی تھی۔ تیسرے خانے میں ان کی دوائیں ہوتی تھیں اور اسی میں رم کی ایک بوتل منہ چھپائے بیٹھی ہوتی تھی۔ چوتھا حصہ حبیب صاحب کے شہرۂ آفاق پائپ اور اس کے لوازمات کے لیے مخصوص تھا جن میں تمباکو کا ڈبا، پائپ صاف کرنے کے آلات اور دیگر ضروریات ہوتی ہیں۔ اور آخری حصے میں ایک آل انڈیا ریلوے ٹائم ٹیبل اور شوز کی تفصیلات ہوا کرتی تھیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس بیگ میں جھانک کر دیکھ لینے کے بعد حبیب تنویر کو جاننے کے لیے کسی اور چیز کی ضرورت نہیں پڑتی۔

صاف گوئی حبیب تنویر کی طاقت بھی تھی اور سب سے بڑی کمزوری بھی۔ وہ کبھی بھی سیاست کے ناز بردار نہیں رہے، نہ ہی ہر پانچ سال بعد بدل جانے والے حاکموں کے استقبال میں اپنی ٹوپی بدلی، اس لیے انھیں وہ درجہ کبھی نہیں مل سکا جس کے وہ مستحق تھے۔ بہت سے صاحب اقتدار ان کی صاف گوئی سے اتنا ڈرتے تھے کہ انھیں کسی اہم اور ذمے دار جگہ پر پہنچنے سے روکنے کے لیے پورا زور لگا دیتے تھے۔ کچھ لوگوں نے تو حبیب صاحب کو مالی اور ذہنی نقصان پہنچانے کی ہی نہیں بلکہ جسمانی تکلیف پہنچانے کی بھی کوشش کی۔ [illegible] گھر سے بے گھر کیا گیا، اور غنڈوں کے

Scanned with CamScanner

دریئے ڈراموں کے شوز کوائے گئے، مگر حبیب تنویر نے کبھی ہتھیا نہیں ڈالے۔ نہ شہر چھوڑ کر بھاگے، نہ اپنے کام کی رفتار کو مدھم کیا۔ وہ تیکھا پن جوان کے کردار کا ایک حصہ تھا، آخر وقت تک قائم رہا۔ وہ اپنے چھوٹے سے لشکر کے سپہ سالار تھے، اور سالار کی شان یہی ہوتی ہے کہ خود گر جاتا ہے مگر پرچم کو نہیں گرنے دیتا۔

حبیب صاحب ڈراما نگار تھے، ڈائریکٹر تھے، ایکٹر تھے، میوزک ڈائریکٹر تھے، گیت کار اور شاعر تھے، ڈیزائنر، پروڈیوسر اور منیجر بھی تھے۔ اب اس طلسم ہفت پیکر کے سارے دروازے کھولنا ممکن نہیں ہے، اور اگر کوشش کی بھی جائے تو ایک آدمی کا کام نہیں ہے، کیونکہ حبیب صاحب کی شخصیت کا ہر ایک پہلو کم سے کم ایک بسیط مقالے کا تقاضا کرتا ہے۔ میں تو بس اتنا ہی کہہ سکتا ہوں کہ وہ اسٹیج کی ایک مکمل شخصیت تھے، ایک ایسی شخصیت جو صدیوں میں کبھی کبھی پیدا ہوتی ہے۔

❀❀

اکبری بوا

گیلے کپڑے سے ڈھکی ہوئی ایک بڑی سی ٹوکری سر پہ اٹھائے، وہ یا سا گری جوتی کھٹکھٹاتی اکبری بوا نے جیسے ہی آنگن میں قدم رکھا تو گھر کی ساری ہلچل رک گئی۔۔۔

دوڑتے بھاگتے شور مچاتے بچوں نے بوا کو دیکھا تو کھیلنا چھوڑ دیا اور ان کی آنکھوں میں چمک آگئی۔ فیاضی بیگم نے حقے کی منھ نال ہونٹوں سے ہٹا کر خوشبودار دھواں چھوڑا اور مسکرائیں۔ باجی باورچی خانے میں تھیں، وہیں سے جھانک کر دیکھا اور چلائیں، "ارے اکبری بوا آئی ہیں۔۔۔" کمروں دالانوں سے کئی آپائیں اور باجیاں باہر نکل آئیں۔ بوا نے چبوترے پہ اپنی ٹوکری رکھی، کمر پہ ہاتھ رکھ کر سیدھی ہوئیں، کالے رنگ کی میلی اوڑھنی سے ماتھے کا پسینہ پونچھا اور بولیں: "بی بی سلام۔"

فیاضی بیگم نے سر ہلایا۔ "سلام، کیسی ہو؟"

"آپ کی دعا، مالک کی مہربانی۔ ہاتھ پاؤں چل رہے ہیں، کسی کی قرض دار نہیں ہوں، پیالی بناؤں؟"

"میں تو نہیں کھاؤں گی، بچوں کو کھلا دے۔۔۔" فیاضی بیگم نے کہا اور پھر اپنے حقے میں مصروف ہو گئیں۔ بچوں کو اتنا اشارہ کافی تھا انھوں نے بوا کو گھیر لیا اور فرمائشیں شروع ہو گئیں۔ باجی کی آواز باورچی خانے سے سنائی دی: "بوا، میرے لیے ادھر ہی بھیج دینا، مرچیں کم، ایو۔۔۔"

بوا نے ایک پیڑھی گھسیٹی اور اپنی ٹوکری کے پاس بیٹھ گئیں۔ انھوں نے کسی جادوگر کی طرح ٹوکری پہ ڈھکا ہوا گیلا کپڑا ہٹا دیا۔ بوا کی ٹوکری کے بیچ میں ایک بڑی سی مٹکی ہوتی تھی جس میں دہی بھرا ہوتا تھا۔ ایک دوسری چھوٹی مٹکی میں بیسن کی پھلکیاں رکھی رہتی تھیں۔ مٹکی کے چاروں طرف بڑے سلیقے سے مٹی چینی کی چھوٹی بڑی پیالیاں، مسالوں کے ڈبے اور چمچے سجے ہوتے تھے۔ بوا ایک پیالی

Scanned with CamScanner

اٹھاتیں، اسے سوکھے کپڑے سے رگڑ کر صاف کرتیں، پھلکیوں والی مٹکی سے کچھ پھلکیاں نکالتیں اور انھیں پیالے میں رکھ کے ہاتھ سے توڑ دیتیں۔ پھر باری باری سے نمک، موٹی موٹی کٹی ہوئی لال مرچ، گرم مسالہ اور چاٹ مسالہ ڈال کر چمچے سے مکس کرتیں۔ پھر اتنا دہی ڈالتیں کہ پیالی بھر جاتی۔ دہی کے اوپر ہرے دھنیے کی چار چھ پتیاں رکھتیں اور پابھنا زیرا اس طرح چھڑکتیں جیسے پیالی کو نظر کا ٹیکا لگا رہی ہوں۔ آخری کام ہوتا پیالی میں ایک چمچہ ڈالنا اور کسی پھیلے ہوئے ہاتھ پہ رکھ دینا۔ ٹوکری پر رکھے ہوئے گیلے کپڑے کا راز بتانا بھی ضروری ہے۔ اسے گیلا اس لیے کیا جاتا تھا کہ مٹکی ٹھنڈی رہے اور کپڑا ہوا سے اڑ نہ جائے۔

اکبری بوا کی دہی پھلکیاں دور دور تک مشہور تھیں مگر گھروں کے اندر...

انھوں نے کبھی سڑک پر اپنا خوانچہ نہیں سجایا۔ نہ ہی اپنی ٹوکری لے کے میلے ٹھیلے میں گئیں۔ ایک گھر سے دوسرے اور دوسرے سے تیسرے میں گھومتی رہتی تھیں۔ ان کے ہاتھ میں ایسی لذت تھی کہ جہاں جاتی تھیں، ہاتھوں ہاتھ لی جاتی تھیں۔ ریاست کے شاہی رکاب دار بھی بوا کی پھلکیاں کھا کے پیالی اور انگلیاں دونوں چاٹ لیا کرتے تھے۔ یہی حال ان کے سیخ کباب کا بھی تھا۔ جب سردیاں آتیں اور بہت سے لوگ دہی کا نام سنتے ہی چھینکنے کھانسنے لگتے تو بوا پھلکیوں کی جگہ گرم گرم سیخ کباب ٹوکری میں لے کے نکلتیں اور اکثر ایسا ہوتا کہ سارے کباب ایک دو گھروں میں ہی ٹھکانے لگ جاتے۔ اس لیے بوا نے ایک اصول بنا لیا تھا کہ کسی ایک گھر میں مہینے میں چار دفعہ سے زیادہ نہیں جاتی تھیں۔

بوا کسی باورچی کی اولاد نہیں تھی۔ کباب اور پھلکیاں بنانا اور بیچنا ان کا خاندانی پیشہ بھی نہیں تھا۔ بقول بوا کے "یہ سب تقدیر کے کھیل ہیں بھیا، کہانی شروع کہاں سے ہوتی ہے اور کہاں جا کے ختم ہوتی ہے۔"

اکبری بوا اصل نسل کی ترک تھیں۔ کہا جاتا ہے کہ مغربی یوپی میں جو لوگ ترک کہلاتے ہیں ان کے پرکھے ترکی سے آئے تھے اور یہاں رس بس گئے تھے۔ اب یہ لوگ تُرک (بروزن 'سلک') کہلاتے ہیں۔ لمبا قد، بھرا ہوا بدن، اونچی ناک، بڑی بڑی آنکھیں اور موٹے مگر چھوٹے ہونٹ۔ جب میں نے انھیں دیکھا تھا تو بال سفید ہو چکے تھے، رنگ جو کبھی گورا رہا ہوگا سانولا ہو چکا تھا اور

Scanned with CamScanner

ہاتھوں پہ جھریاں پڑ چکی تھیں۔ ڈھیلا کرتا اور آڑا پانجامہ پہنتی تھیں۔ اوڑھنی ہمیشہ کالی ہوتی تھی۔ ہاتھوں میں کانچ کی دو دو چوڑیاں پڑی رہتی تھیں اور کان میں چاندی کی بالیاں۔ میں جب بھی انھیں یاد کرتا ہوں، سب سے پہلے گلے میں پڑا ہوا بڑا سا چاندی کا چوکور تعویذ یاد آتا ہے، جس پر سفید پتھر کا چاند جڑا ہوا تھا جو دھوپ میں دور سے چمکتا تھا۔

شہر سے باہر اس علاقے میں جو اب بھی ''پکا باغ'' کہلاتا ہے، املی اور نیم کے پیڑوں سے گھرا ہوا محمد احمد کا طویلہ ہوا کرتا تھا۔ جس میں دس پندرہ بھینسیں دودھ دینے اور جگالی کرنے میں لگی رہتی تھیں۔ محمد احمد کے باپ دادا کھیتی باڑی کرتے تھے مگر پتا نہیں کیا سوجھی کہ محمد احمد نے ہل چلانے والے بیلوں کو خدا حافظ کہا اور بھینسیں پال کر دودھ کا کاروبار کرنے لگا۔ وہ بڑا نیک اور ایماندار آدمی تھا۔ جمعے کی نماز اور نماز کے بعد شاہ بغدادی کی درگاہ پر حاضری دینا کبھی نہیں بھولتا تھا۔ دودھ میں پانی ملانے کو حرام سمجھتا تھا۔ اگر کبھی بیماری کی وجہ سے کسی بھینس کا دودھ پتلا ہو جاتا تو غریبوں میں بانٹ دیا کرتا تھا، مگر اپنے خریداروں کو دھوکا نہیں دیتا تھا۔ ہر ایک بھینس کو سامنے کھڑے ہو کے دھلواتا، سرسوں کے تیل کی مالش کرواتا، یہاں تک کہ بھینسوں کی کالی کھال سنگ موسیٰ کی طرح چمکنے لگتی۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ اتنا نمازی پرہیزگار مسلمان اپنی بھینسوں کے نام ہندو دیویوں کے نام پر رکھتا تھا۔ اس کے طویلے میں لکشمی، سرسوتی، گنگا، رادھا، سیتا اور پاروتی سبھی موجود تھیں۔ بوا بتاتی تھیں ایک مولانا نے ٹوکا بھی تھا:

''میاں کیسے آدمی ہو، اتنے پکے مسلمان ہو اور کافروں کے نام رکھتے ہو؟''

اور یہ بھی سنا ہے کہ محمد احمد نے ہاتھ باندھ کر عرض کیا تھا: ''ارے مولبی صاب، جا تو نہ ہندو نہ مسلمان، اس سے کیا فرق پڑتا ہے! اور ہمارے لیے نام ایک پہچان ہے، تو ہمیں بھی کیا فرق پڑتا ہے'' مجھے یقین ہے مولانا اس عالمانہ دلیل پر اپنا سا منھ لے کر رہ گئے ہوں گے۔ یہ سب قصے اکبری بوا پیان بناتے بناتے مزے لے لے کر سنایا کرتی تھیں، اور سننے والے ڈبل مزہ لیا کرتے تھے، پیان کا بھی اور قصے کا بھی...

محمد احمد کا تھوڑا سا ذکر اور سن لیجیے۔ اللہ نے اور تو سب کچھ دیا ہی تھا، دو خوبصورت بیٹیاں بھی دی تھیں۔ بیٹے کا بڑا ارمان تھا۔ کہا کرتا تھا، اگر بیٹا ہوا تو حج کو جائے گا۔ مگر افسوس، بیچارے کی آرزو پوری نہ ہوئی۔ بیوی اس کا ارمان پورا کیے بغیر ہی چل بسی۔ تب لوگوں نے سمجھایا کہ داماد بھی تو بیٹے

جیسے ہوتے ہیں۔ بیٹیوں کی شادی کرادو، بیٹے کی کمی پوری ہو جائے گی۔

چنانچہ بڑی بیٹی افسری کا رشتہ چندوسی میں ڈھونڈ آگیا۔ لڑکا پڑھا لکھا تھا، مکان دومنزلہ تھا اور چالیس بیگھے میں کھیتی ہوتی تھی۔ بیٹی بہت خوش تھی مگر دور چلی گئی تھی، اس لیے محمد احمد نے فیصلہ کیا کہ اکبری کی شادی اپنے ہی شہر میں کرے گا۔ ترکوں کی برادری کافی بڑی تھی مگر اتنی بڑی بھی نہیں تھی کہ جیسا لڑکا محمد احمد کو چاہیے تھا ویسا آسانی سے مل جاتا۔ گھوم پھر کر نظر ایک دور کے رشتے دار الطاف پہ ٹھہری۔ لڑکا نیک تھا۔ اچھی بات یہ تھی کہ وہ بھی دودھ کا کاروبار کرتا تھا مگر طویلے میں چار ہی جانور تھے، اس سے جو مل جاتا تھا وہی کل آمدنی تھی۔ ایک اچھی بات اور بھی تھی کہ بالکل اکیلا تھا۔ ماں باپ مر چکے تھے، کوئی بہن بھائی بھی نہیں تھا، اس لیے اکبری کو ساس نندوں کے نخرے بھی نہ اٹھانے پڑتے۔ یہی سوچ کر محمد احمد نے الطاف کو بلایا اور اس پر اپنا ارادہ ظاہر کیا تو وہ جھٹ راضی ہو گیا۔ ہونا بھی چاہیے تھا۔ ایک تو اکبری خوبصورت، اوپر سے امیر باپ کی بیٹی۔ الطاف کی امید یہ بھی تھی کہ ایک نہ ایک دن تو محمد احمد کا سب کچھ اسی کو ملے گا۔

شادی بڑی دھوم دھام سے ہوئی۔ محمد احمد نے بیٹی کو وہ سب کچھ دیا جو دے سکتا تھا۔ زیور، کپڑے، برتن، بھانڈے تو دیے ہی دیے، گنگا اور لکشمی جیسی دودھاری بھینسیں بھی جہیز میں دیں۔

الطاف نے تو سپنے میں بھی نہیں سوچا تھا کہ ایک دن چھپر پھٹے گا اور اس کا آجڑ گھر یوں بھر جائے گا۔ اس نے اکبری کی تازبرداری میں کوئی کمی نہیں کی مگر جلدی ہی دونوں کو معلوم ہو گیا کہ ان کی عادتیں، مزاج اور سوچ ایک دوسرے سے بالکل الگ ہیں۔ ایک پورب ہے تو دوسرا پچھم، ایک آم ہے تو دوسرا املی۔ اکبری اور الطاف کا پہلا جھگڑا شادی کے چودھویں دن ہوا۔

صبح کا وقت تھا۔ الطاف دکانوں مکانوں پر دودھ بھجوا کر ناشتہ کرنے بیٹھا۔ اکبری نے جھاگ جیسا سفید تازہ مکھن گرم پراٹھوں پر رکھا اور تانبے کے لاہوری گلاس کو دودھ سے بھر دیا۔ الطاف نے ناشتہ کرتے کرتے اپنے طویلے کی طرف دیکھا اور بولا، ''میں نے تیری دونوں بھینسوں کے نام سوچ لیے ہیں۔''

اکبری ہنس پڑی۔ ''اے ہو، تمہیں اتنا بھی نہیں معلوم؟ ان کے نام تو پہلے سے ہیں، گنگا لکشمی...''

الطاف نے منھ کا توالہ دودھ سے نیچے اتارا اور بولا: "یہ ہندوؤں کے نام ہیں، میرے گھر میں نہیں چلیں گے۔ آج سے ان کے نام ہوں گے لیلا اور منی۔"

اکبری کو غصہ تو بہت آیا مگر پی گئی۔ بس اتنا کہا: "ابا نے رکھے ہیں، سنیں گے تو اچھا نہیں لگے گا۔"

"نہیں لگے گا تو نہیں لگے، اب یہ میری چیز ہے، جو جی چاہے کروں۔"

ناشتہ کر کے الطاف دکان پہ گیا تو اکبری سے رہا نہ گیا۔ وہ سیدھی اپنی بھینسوں کے پاس پہنچی۔ گنگا جگالی کر رہی تھی، لکشمی اس کے پاس چپ چاپ کھڑی تھی۔ دونوں نے جیسے اکبری کو دیکھا تو زور زور سے سر ہلانے لگیں۔ لکشمی نے منھ سے ہلکی سی آواز بھی نکالی جیسے شکایت کر رہی ہو: "ہمارے پاس آنے کی فرصت مل گئی تم کو...؟"

اکبری نے لکشمی کے سر پر ہاتھ پھیرا اور ماتھا چوم لیا۔ اس نے گنگا کے ہونٹوں پر لگا جگالی کا جھاگ مہندی بھری ہتھیلی سے پونچھا اور اس کی گردن میں ہاتھ ڈال کر بڑے پیار سے بولی: "میری گنگا، میری لکشمی..." لکشمی نے اپنی بڑی بڑی کاجل بھری آنکھوں سے اکبری کو دیکھا، سر کو ایک زوردار جھٹکا دیا۔ گنگا بھی اپنی لمبی لمبی پلکیں جھپکا رہی تھی، جیسے کہہ رہی ہو: "کسی کو کچھ بھی بولنے دو، ہم تو وہی ہیں جو تھیں... گنگا اور لکشمی..."

رات کو الطاف آیا تو اکبری نے اونچی آواز میں کہا: "سنو جی، بھینسوں کے نام نہیں بدلے جائیں گے..."

الطاف چونک پڑا، نئی دلہن کے یہ تیور اس کے لیے نئے تھے۔ "اچھا؟ کیوں؟" الطاف کی آواز بھی کافی اونچی تھی۔

"یہ جانور میرے ہیں، میں جہیز میں لے کر آئی ہوں، تم نے خریدے نہیں ہیں۔"

الطاف کھڑا ہو گیا۔ "بڑی اترا رہی ہے اپنے جہیز پہ! چار جوڑے کپڑے اور بڑھیا بھینسوں کو جہیز بولتی ہے تو... ارے کوئی گاؤں، جاگیر لکھوا کر لاتی تو ایک بات بھی تھی..."

"میری جاگیر یہ جانور ہیں، وہ لے کر آئی ہوں۔ اور کون سی جاگیر چاہیے تھی تمھیں..."

جھگڑا دیر تک چلتا رہا اور اس وقت ختم ہوا جب الطاف نے اکبری کے باپ کو گالی دی۔ اور اکبری رونے لگی۔

Scanned with CamScanner

الطاف نے کھاٹ اٹھائی اور سونے کے لیے باہر چلا گیا۔ اکبری رات بھر روتی رہی۔

شروع شروع میں یہ جھگڑے بڑے ڈراؤنے لگتے تھے۔ جب بھی الطاف سے لڑائی ہوتی، اکبری سوچتی، "مولا، اس آدمی کے ساتھ ساری عمر کیسے کٹے گی..." مگر عمر کٹتی رہی اور پانچ برس گزر گئے اور جھگڑوں نے ایک نیا رخ لے لیا۔

الطاف اٹھتے بیٹھتے طعنے دینے لگا تھا کہ "افسری چار بچوں کی ماں بن چکی ہے اور اکبری نے چوہے کا بچہ بھی نہیں جنا ہے..."

ایسا نہیں تھا کہ اکبری کو ماں بننے کا ارمان نہیں تھا یا اس کی چھاتیاں درد نہیں کرتی تھیں۔ مگر وہ کرتی بھی تو کیا کرتی۔ بڑے اسپتال کی ڈاکٹرنی نے کہا تھا، "تم میں کوئی خرابی نہیں ہے۔ بچہ ہونا چاہیے۔" وید جی کا کاڑھا پیا، حکیم جی کی جوارش چاٹی، مگر پیٹ میں کوئی ہلچل نہیں ہوئی۔ اکبری کے کہنے پر الطاف نے بھی اپنا ٹیسٹ کرایا۔ اس کی رپورٹ بھی نارمل تھی۔ تو اب کیا کہا جا سکتا تھا، سوائے اس کے کہ اللہ کی یہی مرضی تھی۔ مگر الطاف اللہ کی مرضی کے آگے سر جھکانے کو تیار نہیں تھا۔ وہ خود اپنے گھر کی اکیلی اولاد تھا۔ بھائی بہن، عزیز رشتے دار کوئی نہ تھا۔ اس لیے اس کی خواہش تھی اس گھر کو ایک وارث تو ملنا ہی چاہیے۔ اس کی یہ آرزو جنون کی حیثیت اختیار کر چکی تھی۔

جب سات برس گزر گئے اور خالی گود خالی ہی رہی تو اکبری نے ایک فیصلہ کیا اور الطاف سے کہا، "میں تمھارا دوسرا بیاہ کراؤں گی اور ایسی دلہن لے کر آؤں گی جو سال بھر کے اندر ہی اس گھر کے اندھیرے میں دیا جلا دے گی۔"

اکبری کا دل رکھنے کے لیے الطاف نے اسے بہت روکا مگر اکبری اس مسکراہٹ کو دیکھ چکی تھی جو نئی بیوی اور بچے کے تصور سے الطاف کے ہونٹوں پہ پھیل گئی تھی۔

اکبری نے چھ مہینے میں کوئی درجن بھر لڑکیاں دیکھ ڈالیں مگر ایک بھی پسند نہیں آئی۔ وہ ایک ایسی لڑکی ڈھونڈ رہی تھی جو الطاف کے گھر میں اس کی اپنی کمی کو پورا کر دے۔ سچ پوچھیے تو وہ خود کو ڈھونڈ رہی تھی اور خود کو ڈھونڈنا آسان نہیں ہوتا۔

رمضان کا چاند دکھائی دیا تو اکبری چاند مبارک کہنے کے لیے باپ کے گھر آئی۔ ہمیشہ کی طرح طویلے میں کام کرنے والے سبھی لوگ آ کر ملے۔ ان میں وشوا گھوسی بھی تھا۔ وشوا اور محمد احمد بچپن کے

Scanned with CamScanner

ساتھی تھے۔ کہنے کو محمد احمد مالک، اور وشوا نوکر تھا، مگر اکبری افسری اس کو وہی عزت دیتی تھیں جو ایک لاڈ پیار کرنے والے چاچا کو دی جا سکتی ہے۔

وشوا اکبری کا ہاتھ پکڑ کے کونے میں لے گیا اور دھیرے سے بولا:

''سنا ہے، تو الطاف کا دوسرا بیاہ کرا رہی ہے؟''

اکبری نے ٹھنڈی سانس لی اور مسکرا دی۔ ''تمھیں تو سب معلوم ہے، چاچا۔ بانجھ کے سر پہ سوت نہیں آئے گی تو کون آئے گا؟''

وشوا سر جھکا کے کچھ سوچتا رہا، پھر بولا، ''رمضانی کی بیٹی حسینہ کو دیکھا ہے تو نے؟''

رمضانی بھی وہیں طویلے میں کام کرتا تھا اور وہ بھی وشوا کی طرح پرانا آدمی تھا۔ اس کی پانچ بیٹیاں تھیں۔ سب سے بڑی حسینہ تھی۔

اکبری نے اور کچھ نہیں سنا، بس ٹھیلا منگایا اور رمضانی کے گھر پہنچ گئی۔ حسینہ کی وہی عمر تھی جس میں اکبری کی شادی ہوئی تھی۔ آنکھوں میں وہی مستی اور خواب تھے جو آٹھ برس پہلے اکبری کی آنکھوں میں ہوا کرتے تھے۔

رمضانی کا کام تھا بھینسوں کی مالش کرنا اور ان کو چرانے نہلانے کے لیے تالاب پر لے جانا۔ تنخواہ کے علاوہ آمدنی کی کوئی صورت نہیں تھی اور کھانے والے تھے سات۔ ظاہر ہے کہ مفلسی در و دیوار سے ٹپک رہی تھی۔ مگر اکبری نے کچھ بھی نہیں دیکھا، بس حسینہ کو دیکھا اور دیکھتی ہی رہ گئی...

یہ جوانی بھی عجیب چیز ہوتی ہے۔ گھر بار، حال احوال، پیسہ، پیشہ کچھ نہیں دیکھتی۔ بسنت رت کی طرح چپکے سے آ جاتی ہے اور ویرانوں میں بھی پھول کھلا دیتی ہے۔ گدڑی میں لعل کی کہاوت سنی تھی مگر حسینہ اس کی زندہ مثال تھی۔

اکبری کی بات سن کر رمضانی پریشان ہو گیا۔ عمر میں دگنے کا فرق تھا۔ حسینہ اٹھارہ کی تھی الطاف چھتیس کا۔ پھر یہ کہ شادی شدہ تھا، مگر جب اکبری نے اس کے سامنے پلو پھیلایا تو وہ انکار نہیں کر سکا۔ اکبری کے باپ کے بہت احسان تھے اس پہ، اور الطاف کا شمار کھاتے پیتے لوگوں میں ہونے لگا تھا۔ چلتا کاروبار تھا، مکان تھا، دکان تھی۔ اور کیا چاہیے۔ اب رہ گئی بات عمر کی تو حسینہ سے بڑا تھا، مگر تھا تو جوان...

Scanned with CamScanner

رمضانی کی ہاں سننے کے بعد اکبری نے وہ کیا جو بیٹیوں کی شادی میں مائیں بھی نہیں کرتی ہیں۔ اس نے حسینہ کے سارے جوڑے اپنے ہاتھ سے سیے شادی کا کارچوبی گھاگھرا بنوانے کے لیے مرادآباد تک دوڑی چلی گئی۔ ڈھولک پیٹ پیٹ کر اتنے سہاگ گائے کہ آواز بیٹھ گئی۔ ساری برادری کو نیوتا دیا۔ باراتیوں کی ارڑ چاول اور اصلی گھی کے زردے سے تواضع کی گئی۔ اور جب الطاف اپنی نئی دلہن کو لے کر کوٹھری میں گیا تو اکبری سجدے میں گر پڑی۔ ''مالک اب میری بات کی عزت تیرے ہاتھ ہے...''

لوگ کہتے ہیں، اکبری نے اپنی سوت کو وہ جگہ دی جو کسی بہن بیٹی کو بھی نہیں ملتی۔ اس نے حسینہ کو ہل کر پانی بھی نہیں پینے دیا۔ اور پھر جب دس مہینے بعد ایک دن حسینہ کو ابکائی آئی تو اکبری کے منھ سے چیخ نکل گئی۔ وہ دودھ کی بالٹی چھوڑ کر بھاگی اور حسینہ سے لپٹ گئی۔ اور جب حسینہ نے شرماتے شرماتے سر ہلایا تو اکبری جیسے پاگل ہوگئی۔ اس نے دونوں ہاتھوں میں اپنی اوڑھنی پکڑی اور آنگن میں ناچنا شروع کر دیا۔ اس کی پھٹی ہوئی آواز میں زچہ گیری سن کے حسینہ ہنسے ہنستے دوہری ہوگئی۔

پچھواڑے بیٹھ کے سونٹھ کھائی
منھ پونچھن گھر کو آئی
موری زچہ بڑی ہوسیار
ہورااما، موری زچہ بڑی ہوسیار...

اکبری نے حسینہ کو پہلے ہی چھوئی موئی بنا رکھا تھا، پاؤں بھاری ہو تو پلنگ پر ہی قید کر دیا۔ حد یہ ہے کہ اس کے ہاتھ بھی اپنے ہاتھ سے دھلواتی تھی۔ ساتویں مہینے گود بھرائی کی رسم کی تو محلے بھر میں مٹھائی بانٹی، سب کو کھانا کھلایا، دودھ دوہنے والے سے لے کر گوبر اٹھانے والے تک سب کو جوڑے دیے اور حسینہ کو سونے کا وہ جھومر دے دیا جو اپنے میکے سے لے کر آئی تھی۔

اکبری کو دیکھ کر ایسا لگتا تھا جیسے اس کے پیروں میں پر لگ گئے ہوں۔ فجر کی نماز پڑھ کر جو کھڑی ہوتی تو اس وقت تک کام کرتی رہتی جب تک جوڑ جوڑ پکے ہوئے پھوڑے کی طرح درد نہ کرنے لگتا۔ دوسرے دن پھر وہی...

اس کے جوش کو دیکھ کے الطاف ہنستا تھا۔ ''اپنی خدمت کے بدلے تو کیا لے گی؟''

Scanned with CamScanner

"ایک بیٹا!" اکبری تڑ سے جواب دیتی۔ پھر وہ دن بھی آیا جب بچے کے رونے کی آواز سنائی دی۔ اکبری قرآن پاک سینے سے لگائے کوٹھری کے باہر کھڑی تھی۔ آواز سنتے ہی بلک بلک کے خود بھی رونے لگی۔ ایسا لگتا تھا جیسے آٹھ برس کے رکے ہوئے آنسو ایک ساتھ بہہ جائیں گے۔ رام پیاری دائی نے بچے کو صاف کر کے کپڑے میں لپیٹا اور اکبری کی گود میں رکھا تو اکبری کی آنسو بھری آنکھوں میں ایسی چمک آئی جیسے بارش کے بیچ میں دھوپ نکل آئے۔

برسوں کی سوکھی ہوئی چھاتیاں اچانک درد سے پھٹنے لگیں۔ اسے ایسا لگا جیسے انگیا دودھ سے گیلی ہوگئی ہو۔ اس نے بچے کو الطاف کی گود میں ڈالا اور بھاگتی ہوئی گھر سے نکل گئی۔ پورے چار دن تک شہر کی ہر درگاہ، ہر مزار اور ہر مندر کے چکر کاٹتی پھری۔ کہیں چادر چڑھائی، کہیں چڑھاوا دیا، کہیں اگربتی سلگائی، اور ان سب کا شکریہ ادا کیا جنھوں نے اتنی منتوں اور مرادوں کے بعد اس کی گود بھر دی تھی۔ عقیقہ کیا تو آٹھ بکرے کاٹے اور گیارہ کالی مرغیوں کا صدقہ اتارا۔ الطاف کو یہ سب کچھ اچھا نہیں لگا۔ اس نے اکبری کو ٹوکا:

"ارے تو پاگل ہوگئی ہے! دونوں ہاتھ سے خرچ کیے جا رہی ہے، گھر لٹائے گی کیا؟"

اکبری زور سے ہنسی۔ "گھر بھرنے والا جو آگیا ہے..."

اکبری نے بچے کا نام 'اللہ دیا' رکھا جو حسینہ کو بالکل پسند نہیں آیا۔ "یہ کوئی نام ہوا، میں تو اپنے بچے کا نام منظور رکھوں گی۔" اکبری کو برا تو لگا مگر چپ رہی، کیونکہ حسینہ کا حق زیادہ تھا۔

ایک دودھ پلانے کو چھوڑ کے، بچے کا ایسا کوئی کام نہیں تھا جو اکبری نہ کرتی ہو۔ اس نے اپنی کھاٹ کوٹھری کے باہر ہی ڈال دی تھی۔ رات کو بچہ چوں بھی کرتا تو اٹھ کر بیٹھ جاتی۔ منظور بھی، جو اب پیار سے منجو کہلانے لگا تھا، شاید پہچان گیا تھا کہ پیٹ بھلے ہی حسینہ کا ہو مگر ماں تو اکبری ہی ہے۔ بندریا کے بچے کی طرح ہر وقت اکبری کی چھاتی سے چپکا رہتا تھا، اور وہ اللہ کی بندی بھی اپنے سارے کام منجو کو گود سے اتارے بنا کیا کرتی تھی۔ دودھ دوہنا ہو، کھلی توڑنا ہو، سانی بنانا ہو یا کھانا پکانا ہو، منجو تعویذ کی طرح اس کی گردن سے لٹکا رہتا۔ جب تک بچے کو پالنے اور سنبھالنے کی ضرورت تھی تب تک حسینہ نے کچھ نہیں کہا، مگر جیسے ہی وہ قدم دو قدم چلنے لگا اور اپنی توتلی زبان سے اماں ابا بولنے لگا تو حسینہ نے الطاف سے شکایت کی:

Scanned with CamScanner

''آپا اپنے لاڈ پیار میں بچے کو خراب کر رہی ہیں۔ میری تو وہ سنتا ہی نہیں ہے، جب دیکھو ان کے پاس گھسا رہتا ہے۔ میں گود میں لیتی ہوں تو چیخیں مارنے لگتا ہے، جیسے میں ماں نہیں سوتیلی ماں ہوں...''

''کیسی باتیں کرتی ہے تو؟'' الطاف نے اسے ہنس کے ڈانٹ دیا۔ ''معصوم بچہ سگا سوتیلا کیا جانے؟ منجو بڑا ہوگا تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔''

منجو بڑا ہوتا گیا اور اس کو لے کر دونوں ماؤں کے جھگڑے بھی بڑے ہوتے گئے۔

ایک دن تو حد ہو گئی۔ حسینہ کہیں سے مٹھائی لے کر آئی اور منجو کو کھلانے لگی۔ مگر اس نے برا سا منھ بنا کے تھوک دی۔ حسینہ کو غصہ آ گیا۔ اس نے منجو کو زور دار تھپڑ لگایا اور گالیاں دینے لگی: ''حرام کے جنے، سور کی اولاد، آپا سے بھینسوں کو کھلانے والا گڑ مانگ کے کھاتا ہے اور میں اتنی اچھی مٹھائی دے رہی ہوں تو تھوک رہا ہے کمینہ!'' بچہ بلک کے رونے لگا۔ اکبری نے منجو کے رونے کی آواز سنی تو روٹی توے پہ چھوڑ کر بھاگی۔ ''کیا ہوا، ارے کیا ہوا؟ رو کیوں رہا ہے میرا بچہ؟''

''میں نے مارا ہے، اور بھی ماروں گی۔'' اکبری کو اپنی آنکھوں اور کانوں پہ یقین نہیں آیا۔ اس نے حسینہ کے یہ تیور پہلے کبھی نہیں دیکھے تھے، اور نہ ہی اس طرح کی بات سنی تھی۔

''مگر ہوا کیا؟'' اس نے پوچھا۔

''سب تمہاری للو چپو کا نتیجہ ہے۔ اتنا ضدی بنا دیا ہے حرامی پلے کو کہ بات ہی نہیں سنتا۔''

''کیا نہیں سنا اس نے؟''

''مٹھائی لائی تھی۔ منھ میں رکھتے ہی تھوک دی، جیسے میں زہر دے رہی تھی حرامی کو...''

اکبری نے اپنی اوڑھنی سے منجو کی آنکھیں اور ناک پونچھی اور دھیرے سے بولی: ''معصوم بچہ ہے بہن، اچھی اور بری چیز کی پہچان نہیں ہے۔ کہاں ہے مٹھائی، لاؤ میں کھلاؤں...''

اکبری نے جیسے ہی مٹھائی کے دونے کی طرف ہاتھ بڑھایا، حسینہ نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔ ''نہیں، آج سے حد ہے یہ جو کچھ بھی کھائے گا، میرے ہاتھ سے کھائے گا۔ نہیں تو بھوکا ماردوں گی کتے کو!''

اکبری نے بڑی حیرت سے حسینہ کو دیکھا، پھر بچے کو دیکھا جو اب تک سسکیاں لے رہا تھا، اور

Scanned with CamScanner

بہت دیر تک کچھ سوچتی رہی۔ ''تو ٹھیک کہتی ہے دلہن، مگر یہ کام اتنی آسانی سے نہیں ہونے کا ہے۔ تجھے ماں بننا ہے تو پہلے اپنی ماں تو کھا، پھر اس سے اپنا حق مانگیو۔''

''یہ سب باتیں رہنے دو!'' حسینہ چمک کر بولی۔ ''تم ماں بننا بند کرو تو یہ اپنی ماں کو ماں سمجھے گا۔''

اکبری کی آنکھوں میں آنسو آ جانے چاہیے تھے مگر وہ مسکرا دی۔ اس نے منجو کے سر پہ ہاتھ پھیرا، اور کوٹھری سے باہر نکل گئی۔

توے پہ رکھی روٹی جل کر راکھ ہو چکی تھی اور دھواں اٹھ رہا تھا۔ اس کے بعد اکبری نے بہت کوشش کی کہ منجو اس سے دور ہو جائے۔ وہ جھڑکتی تھی، ڈانٹتی تھی، بار بار بھگا دیتی تھی، مگر منجو تو جیسے اس کی اوڑھنی کے پلو سے بندھ گیا تھا، وہ اسے کہاں چھوڑنے والا تھا۔ پیڑ کی چھال کی طرح چپکا ہی رہتا تھا، اور حسینہ دیکھ دیکھ کے سلگتی رہتی۔

آئے دن کی دانتا کل کل سے الطاف بھی پریشان ہو چکا تھا۔ حسینہ نے نوٹس دے دیا تھا کہ اگر اس نے اکبری کو گھر سے نہیں نکالا تو وہ خود کہیں چلی جائے گی۔ مگر الطاف اکبری کو کیسے نکال سکتا تھا، طویلہ تو اسی کے دم سے چل رہا تھا۔ ایک رات جب وہ گھر آیا تو گھر میں کھانے کو کچھ نہیں تھا۔ پتا چلا کہ حسینہ اور اکبری میں پھر جھگڑا ہوا تھا جس کی وجہ سے اکبری اپنے باپ کے گھر چلی گئی ہے، اور حسینہ نے جو کچا پکا سامنے رکھا وہ کھانے کے لائق نہیں تھا۔ ایک تو غصہ، اوپر سے بھوک، الطاف نے حسینہ کو اتنا مارا کہ اس کی چوڑیاں ٹوٹ گئیں اور بدن پہ نیل پڑ گئے۔

الطاف اکبری کو منا کے لے آیا مگر گھر میں چولھے الگ ہو گئے۔ حسینہ اور اکبری ایک دوسرے سے بات بھی نہیں کرتی تھیں۔ منجو کو پڑھانے کے لیے ایک ملا آنے لگا تھا۔ وہ ملا پشاور سے مدرسہ عالیہ میں پڑھنے کے لیے آیا تھا۔ اس محلے کی مسجد میں امامت کرتا تھا اور رہتا بھی وہیں تھا۔ اکبری اس ملا کو رات کا کھانا اور دو روپیہ مہینے دے دیا کرتی تھی۔

محمد احمد نے اللہ سے دعا کی تھی کہ بیٹا ہو گا تو حج کو جائے گا۔ بیٹا نہیں ہوا تو دعا بدل گئی۔ اللہ بیٹیوں کا گھر بسا دے اور اچھے داماد دلا دے تو جائے گا۔ اور اب جبکہ اس کی ساری آرزوئیں پوری ہو چکی تھیں تو اس نے حج کی نیت باندھ ہی لی۔ جتنے جانور رہ گئے تھے ان کو بیچ ڈالا، گھر بند کیا اور اللہ کی راہ میں چل پڑا۔ جس زمانے میں محمد احمد جانے کی تیاری میں لگا ہوا تھا، افسری اور اکبری دونوں

Scanned with CamScanner

اس کے پاس آ گئی تھیں۔ اکبری باپ کو ٹرین پہ چڑھانے کے لیے اسٹیشن تک گئی۔ افسری بھی اسی ٹرین سے اپنے گھر کے لیے روانہ ہو گئی۔ اکبری آنسو پونچھتی بھاری دل سے گھر پہنچی تو سہم کر دروازے ہی میں کھڑی رہ گئی۔ کوٹھری میں حسینہ اور منجو کے ملاپ میں کچھ چھینا جھپٹی ہو رہی تھی اور دونوں زور زور سے ہنس رہے تھے۔ اکبری کو پسینہ آ گیا۔ وہ گھر سے باہر نکل گئی اور اس وقت تک گلی میں گھومتی رہی جب تک ملا مسجد کو نہیں چلا گیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ دل کہتا تھا کہ الطاف کو بتا دے، مگر دماغ سمجھاتا تھا کہ اگر کچھ اونچ نیچ ہو گئی تو بدنامی اپنے ہی گھر کی ہو گی۔

ایک دن اکیلے میں اکبری نے حسینہ کو سمجھایا کہ نادان لڑکی، جو تو کر رہی ہے وہ آگ سے کھیلنے کے برابر ہے۔ ابھی یہ بات کسی اور کو نہیں معلوم ہے مگر ایسی باتوں کو چوکھٹ پار کرتے دیر نہیں لگتی۔ اور خدانخواستہ ایسا ہوا تو الطاف تجھے زندہ نہیں چھوڑے گا۔ ناک کان تو کاٹ ہی لے گا۔ حسینہ نے قرآن اٹھا لیا۔ اس نے کہا، "شہد کی مکھی گھس آئی تھی، ملا جی اسے بھگا رہے تھے، کوئی مستی مذاق نہیں کر رہے تھے۔" اکبری کا جی چاہا کہ جھوٹی کا گلا گھونٹ دے، مگر قرآن کی قسم کو جھٹلا بھی نہیں سکتی تھی اس لیے خون کا سا گھونٹ پی کر رہ گئی اور صرف اتنا کہا، "ہو سکتا ہے، میں نے غلط دیکھا ہو۔" حسینہ اب اتنی اناڑی بھی نہیں تھی کہ اکبری کے تیور اور حالات کا رخ نہ پہچان سکے۔ اس نے ملا کا آنا تو بند کرا دیا مگر اکبری اس کی آنکھوں میں کانٹے کی طرح چبھنے لگی اور اس نے فیصلہ کیا کہ اگر اس کانٹے کو ہمیشہ کے لیے نہیں نکالا گیا تو وہ کبھی سکھ سے نہیں رہ سکے گی۔

رجب کا مہینہ آیا۔ حسینہ نے کونڈوں کی نیاز رکھی، مگر زیادہ لوگوں کو نہیں بلایا۔ بس گھر والے تھے اور پڑوسی۔ رات کو جب اکبری نے نیاز کے خالی کونڈے تالاب میں ٹھنڈے کرنے کے لیے اٹھائے تو اسے چکر آ گیا۔ پہلے تو وہ سمجھی، دن بھر کی تھکن سے ایسا ہو رہا ہے، مگر چکر بڑھتے ہی گئے اور سر گھومنے لگا تو الطاف کو آواز دینے کے لیے اٹھی، مگر اٹھ نہیں سکی۔ اسے ایسا لگا جیسے پیٹ میں بجلی سی کوند گئی ہو۔ درد اتنا شدید تھا کہ اس کے منھ سے چیخ نکل گئی۔ الطاف، حسینہ اور دوسرے کچھ لوگ جاگ گئے۔ اکبری کو بڑے اسپتال لے جایا گیا تب تک وہ بے ہوش ہو چکی تھی۔

ڈاکٹر نے بتایا کہ اکبری کو زہر دیا گیا ہے۔ قسمت اچھی تھی کہ جان بچ گئی۔ مگر پولیس کا کیس بن گیا، انکوائری شروع ہوئی۔ ہوش آیا تو اکبری نے بتایا کہ حسینہ کی بنائی ہوئی میٹھی پوریوں کے سوا اس

Scanned with CamScanner

نے کچھ اور نہیں کھایا تھا۔ مگر میٹھی پوریاں تو سب نے کھائی تھیں۔ کسی کے پیٹ میں درد نہیں ہوا۔ پولیس حسینہ کا بیان لینا چاہتی تھی مگر الطاف نے تھانیدار کے سامنے ہاتھ جوڑ دیے۔ ''آپ خود سوچیے سرکار، پوریوں میں کچھ ہوتا تو باقی سب بھی اسپتال میں ہوتے۔''

مگر زہر کا معاملہ تھا، موت بھی ہو سکتی تھی، اس لیے تھانیدار الطاف کی بات ماننے کو تیار نہیں تھا۔ ''تو پھر تیری بیوی کو دھتورے کے بیج پیس کر کس نے کھلا دیے، اور کیسے کھلائے؟''

کونے میں بیٹھی حسینہ روئے جا رہی تھی۔ اس کے گالوں پہ آنسوؤں کی لکیریں بن گئی تھیں۔ الطاف تھوڑی دیر تک سوچتا رہا، پھر بولا، ''سرکار مالک ہیں، جو چاہے فیصلہ کریں، مگر میری سمجھ میں ایک بات آرہی ہے۔'' تھانیدار نے سر ہلایا۔ ''بول کے دیکھ لے، شاید مجھے اچھی لگے۔'' الطاف نے سر ہلایا اور آہستہ سے بولا، ''دونوں سوتن ہیں سرکار، دونوں میں بنتی بھی نہیں ہے، دن رات ٹکا فضیحتی ہوتی رہتی ہے۔ دونوں کے چولہے بھی الگ ہیں۔ مجھے لگتا ہے، اس نے اپنی جان کو ختم کرنے کے لیے کھالیا ہوگا دھتورا۔''

''تیرا مطلب ہے یہ اقدامِ خودکشی کا کیس ہے؟''

''اب یہ تو نہیں معلوم سرکار، کاہے کا کیس ہے، مگر بات یہی ہے۔''

''ہوں'' تھانیدار نے کہا اور ٹہلتا ہوا نکل گیا۔

چونکہ نہ کوئی ثبوت تھا نہ کوئی گواہ اور نہ ہی اکبری کسی پہ الزام لگا رہی تھی اس لیے تھانیدار نے بھی وقت برباد کرنا ٹھیک نہیں سمجھا اور کوئی کیس ہی نہیں بنایا۔

اکبری آٹھ دن تک اسپتال میں پڑی رہی اور جب واپس آئی تو اس میں چلنے کی طاقت بھی نہیں تھی۔ پھر بھی اس نے اپنی پھولی ہوئی سانسوں کو سنبھالتے ہوئے الطاف سے کہا:

''اس نے جھوٹی قسم کھائی، تو نے جھوٹی گواہی دی، تم دونوں کا حشر اچھا نہیں ہوگا۔''

الطاف نے غصے میں آنکھیں چمکائیں اور بولا، ''تو سمجھتی ہے یہاں گدھے بستے ہیں؟ سب کو معلوم ہے تیرا منصوبہ کیا تھا۔''

''منصوبہ؟'' اکبری کے منہ سے نکلا۔

''اور نہیں تو کیا! تو یہی چاہتی تھی نا کہ حسینہ جیل چلی جائے اور منجو تیرے پاس رہے۔ زہر ہی

کھانا تھا تو، زہر یا وہ کھا لیا ہوتا، سب کی جان چھوٹ جاتی۔"

اکبری پھٹی پھٹی آنکھوں سے الطاف کو دیکھتی رہی، اس کے کانپتے ہوئے ہونٹوں سے ایک ہلکی سی بھرائی ہوئی آواز نکلی: "اللہ تجھے معاف نہیں کرے الطاف، کبھی معاف نہیں کرے گا۔"

"ارے چل چل!" الطاف برا سا منھ بنا کر بولا: "کوے کے کوسے سے ڈھور نہیں مرتے۔" اور اٹھ کر چلا گیا۔

اکبری جہاں بیٹھی تھی، وہیں بیٹھی رہی۔ اس کی آنکھیں اس طرح لال ہو گئی تھیں جیسے ان میں خون بھر گیا ہو۔ پھر نہ جانے کہاں سے اس میں اتنی طاقت آ گئی کہ وہ اٹھی، اوڑھنی سر پہ ڈالی اور باہر نکل گئی۔

چار دن کے بعد جب الطاف کو پنچایت میں آنے کا حکم ملا تو وہ پریشان ہو گیا۔ ایسی تو کوئی بات ہوئی ہی نہیں تھی کہ اسے پنچایت میں بلایا جاتا۔ کسی سے لین دین پہ جھگڑا بھی نہیں ہوا تھا اور گھر میں بھی سب خیریت تھی، پھر یہ طلبی کیوں...

الطاف پنچایت میں پہنچا تو سب لوگ جمع ہو چکے تھے۔ چاچا غفور کے طویلے کے باہر برگد کے پیڑ کے نیچے جو چبوترا تھا اس پر پنچ اور سرپنچ بیٹھے ہوئے تھے اور حقے کا دور چل رہا تھا۔ نیچے ایک پرانی دری پہ بیٹھنے والے بیٹھے تھے۔ ان سے تھوڑی دور پر ایک چارپائی پر چار پانچ عورتیں بھی بیٹھی ہوئی تھیں جنھوں نے مردوں کی نظر سے بچنے کے لیے یا بڑوں کے ادب میں اوڑھنیوں کے گھونگھٹ نکال لیے تھے۔ الطاف نے پنچوں کو سلام کیا اور سرپنچ سے پوچھا: "مجھے کیوں بلایا گیا ہے چاچا؟"

غفور چاچا نے ایک لمبا کش لے کر حقہ برابر والے کو پکڑا دیا اور اپنی بڑی سی سفید پگڑی دونوں ہاتھوں سے سیدھی کرتے اونچی آواز میں بولا: "تیری بیوی اکبری کو تجھ سے طلاق چاہیے۔"

"طلاق؟"... اکبری کو طلاق چاہیے یہ بات تو الطاف نے کبھی سوچی ہی نہیں تھی۔ اس نے عورتوں کی طرف دیکھا اور پہچان لیا کہ کالی اوڑھنی میں اکبری بھی بیٹھی ہوئی ہے۔

"اے سوچ کیا رہا ہے؟ کچھ ہاں یا نہ بول۔"

الطاف نے کھل کر صاف کہا: "اکبری کو مجھ سے شکایت کیا ہے جی؟ میں نے اس پہ کبھی ہاتھ نہیں اٹھایا، گالی بھی نہیں دی، ہمیشہ کھانے کپڑے کا دھیان رکھا، جو اس کے من میں آیا کرنے دیا۔ اب چودہ برس کے بعد اسے طلاق کی کیا سوجھ رہی ہے؟ رہ گئی بات دوسری بیوی کی تو پنچوں کو تو سب معلوم

Scanned with CamScanner

ہے، جب اس نے سات برس تک کوئی بچہ نہیں جنا، خود اس نے میرا بیاہ کرایا، لونڈیا بھی اسی نے پسند کی تھی۔ اس کو مجھ سے شکایت کیا ہے؟''

وہ چپ ہوا تو سب کی آنکھیں اکبری کی طرف مڑ گئیں۔

اکبری کھڑی ہو گئی۔ اس نے اپنی اوڑھنی سرکائی اور ہاتھ جوڑ کر بولی، ''انھوں نے جو کچھ بھی بولا اس کا ایک ایک حرف صحیح ہے۔ مجھے ان سے کوئی شکایت نہیں ہے۔ شکایت تو مجھے اپنے آپ سے ہے کہ میں ان کی، ان کی بیوی کی اور ان کے بچے کی ویسی خدمت نہیں کر سکتی جیسی مجھے کرنی چاہیے۔ اور آپ سب لوگ تو تجربے والے لوگ ہیں، آپ کو تو معلوم ہے جو بھینس دودھ دینا بند کر دے اسے طویلے سے نکال دیتے ہیں۔ مجھے ان سے کچھ نہیں چاہیے۔ اس گھر میں میرا جو کچھ بھی ہے آج سے ان کا ہے۔ میں اپنا مہر بھی معاف کرتی ہوں۔ اگر یہ دے سکتے ہیں تو میری دو چیزیں لوٹا دیں، احسان مانوں گی۔''

''کون سی دو چیزیں؟'' الطاف نے پوچھا۔

''میری گنگا اور لکشمی...''

الطاف ہنسا۔ ''شوق سے لے لے، میں کیا کروں گا بڑھیا بھینسوں کو رکھ کے، مگر تو اس عمر میں جائے گی کہاں اور کرے گی کیا؟''

اکبری نے پہلی مرتبہ مڑ کر الطاف کو دیکھا اور بولی، ''تو میری چنتا مت کر، یہ تر کنی کے ہاتھ ہیں جو مرتے وقت تک چلتے رہتے ہیں۔ دودھ دوہنے کو نہیں ملا تو گوبر تو اٹھا ہی سکتی ہوں...''

ایک پنچ نے اشارے سے اکبری کو روکا اور الطاف سے پوچھا، ''ہاں بھئی الطاف، کیا ارادہ ہے تیرا؟... فیصلہ تو کرے گا یا پنچایت کر دے؟''

الطاف تھوڑی دیر تک سوچتا رہا، شاید دل ہی دل میں حساب لگا رہا تھا کہ اکبری کو چھوڑنے میں فائدہ ہے یا رکھنے میں۔ اس نے کن انکھیوں سے اکبری کی طرف دیکھا۔ مرجھایا ہوا چہرہ آنکھوں پہ کالے داغ، سر میں سفید بال۔ وہ آگ جو کبھی اکبری تھی، بجھ چکی تھی۔ ''ٹھیک ہے جی...'' اس نے پنچوں سے کہا، ''اگر اس کی یہی مرضی ہے تو یہی سہی، میں طلاق دینے کو تیار ہوں۔ آگے جو پنچوں کا حکم...''

اکبری کی طلاق ہوگئی۔ وہ اپنی دونوں بھینسوں کو لے کے باپ کے گھر میں رہنے لگی۔ جس دن اس نے بند طویلے کا دروازہ کھولا اسی دن یہ منحوس خبر ملی کہ محمد احمد مکہ شریف میں اللہ کو پیارا ہو گیا۔ اکبری بہت روئی مگر یہ سوچ کر دل کو تسلی بھی دیتی رہی کہ باپ نیک آدمی تھا، ایسی جگہ مرا جہاں مرنے والا سیدھا جنت میں جاتا ہے۔

اکبری نے اپنی زندگی کو ایک نئے سانچے میں ڈھالنے کی کوشش شروع کر دی۔ فجر سے پہلے اٹھتی، دودھ نکالتی، سانی پانی کرتی، گراہکوں کے گھر دودھ پہنچاتی اور پھر دن بھر لکشمی اور گنگا سے باتیں کرتی رہتی۔ اسے کسی بات کا دکھ نہیں تھا، مگر جب کبھی منجو کا خیال آجاتا تو ایسا لگتا جیسے جلتے کوئلے پہ ہاتھ پڑ گیا ہو۔ جب اس نے سنا کہ منجو میونسپلٹی کے اسکول میں جانے لگا ہے تو اس سے ملنے بھی گئی۔ منجو اس سے لپٹ گیا۔ اکبری نے بہت سے کھلونے اور مٹھائی جو اپنے ساتھ لے کر گئی تھی، اسے دے کر کہا: ''خوب پڑھنا، بڑا افسر بننا اور ماں باپ کا نام روشن کرنا۔''

کوئی چھ مہینے بعد کی بات ہے کہ الطاف آدھی رات کو اس کے گھر پہنچا۔ اس کی حالت دیکھ کر اکبری ڈر گئی۔ منھ پہ ہوائیاں اڑی ہوئی تھیں، بال بکھرے ہوئے تھے، کپڑے میلے تھے اور ننگے پاؤں تھا۔

اکبری کو سامنے دیکھ کے اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ پتا چلا کہ حسینہ اور منجو دوپہر سے غائب ہیں۔ سارے شہر میں وہ جہاں جہاں جا سکتی تھی، ڈھونڈا جا چکا ہے، مگر اس کا کوئی پتا نہیں ہے۔ پولیس میں رپٹ بھی لکھائی جا چکی ہے اور پولیس والے دونوں کا حلیہ شہر شہر بھیج رہے ہیں مگر ابھی تک کوئی خبر کہیں سے نہیں آئی ہے۔ الطاف زمین پر بیٹھ گیا اور اپنے بچے کو یاد کر کے رونے لگا۔ اکبری بھی اس کے پاس بیٹھ گئی اور رونے میں شریک ہو گئی۔ اکبری بھی کئی دن تک ڈھونڈتی پھری مگر نہ حسینہ ملی نہ منجو...

کوئی آٹھویں دن دہلی سے آنے والے ایک آدمی نے بتایا کہ اس نے حسینہ اور منجو کو لاہور جانے والی ٹرین میں بیٹھتے ہوئے دیکھا تھا۔ ان کے ساتھ ایک پٹھان ملا بھی تھا۔ الطاف تو جیسے پاگل ہو گیا۔ حسینہ کی بیوفائی، بچے کی جدائی اور اپنی بدنامی کا ایسا اثر ہوا کہ اس نے شراب پینی شروع کر دی۔ نشے میں جھومتا سڑکوں پہ گھومتا رہتا تھا اور کوئی جان پہچان والا مل جاتا تو اس سے ایک ہی بات پوچھتا: ''منجو کو دیکھا ہے تم نے؟''

Scanned with CamScanner

اکبری نے اسے کئی بار سمجھانے کی کوشش کی مگر اس کی دماغی حالت ایسی ہو چکی تھی کہ وہ کچھ بھی سوچنے یا سمجھنے کے قابل نہ تھا۔ اس کی لاپرواہی اور شراب نوشی کے نتیجے میں پہلے جانور بکے، پھر طویلہ بکا اور آخر میں گھر بھی بک گیا۔

الطاف سب کی شراب پی گیا۔ وہ اپنے ہی گھر کے پاس اس چھپر میں پڑا رہتا تھا جہاں کبھی اس کی بھینسوں کے لیے چارا رکھا جاتا تھا۔

اکبری کے حالات بھی ٹھیک نہیں تھے لکشمی مر چکی تھی اور گنگا مشکل سے دو تین سیر دودھ دیتی تھی اور بس۔ مگر عورت جی دار تھی، اس نے گنگا کے تھوڑے سے دودھ کا دہی بنانا اور دہی پھلکیاں بنا کر بیچنا شروع کر دیا۔ شروع شروع میں تو لوگ چڑتے تھے کہ ایک ترکنی دہی پھلکیاں اور کباب بیچنے لگی ہے مگر دھیرے دھیرے اس کے ہاتھ کی لذت شہرت میں اور شہرت عزت میں بدل گئی۔

یہ بات بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ گھر گھر جا کے ایک آنے دو آنے کی پیالیاں بیچنے والی اکبری ہر مہینے الطاف کی پڑوسن کو تیس روپے دیا کرتی تھی۔ ہوا یوں کہ کسی نے اکبری کو خبر پہنچائی کہ الطاف بہت بیمار ہے اور کوئی اس کا پرسانِ حال بھی نہیں ہے۔ الطاف نے جو کچھ بھی اس کے ساتھ کیا تھا وہ تو ایسا تھا کہ اکبری کو اس کی صورت بھی نہیں دیکھنی چاہیے تھی مگر اکبری کی نرم دلی اور شریف طبیعت آڑے آگئی۔ الطاف کے طویلے میں پہنچی تو وہ بے ہوش پڑا تھا مگر یہ بے ہوشی بیماری کی نہیں، شراب کی تھی۔ ہڈیوں کا ڈھانچہ رہ گیا تھا۔ بال روکھے اور الجھے، کئی دن کی بڑھی ہوئی داڑھی جو سفید ہو گئی تھی، اور اتنے میلے کپڑے کہ ان میں سے بو آرہی تھی۔ جھونپڑے میں سامان نام کی کوئی چیز نہیں تھی، بس ایک ٹوٹی کھاٹ تھی جس پر الطاف پڑا ہوا تھا اور کھاٹ کے نیچے خالی بوتلوں کا ڈھیر۔ اکبری کو ترس تو بہت آیا مگر کر بھی کیا سکتی تھی۔ اس نے اپنی پرانی پڑوسن کو بلایا، اس کے ہاتھ میں کچھ روپے رکھے اور کہا کہ اگر وہ الطاف کو دونوں وقت کھانا کھلا دیا کرے، اس کے کپڑے دھو دیا کرے اور جھونپڑے کی صاف صفائی کر دیا کرے تو مہینہ داری دینے کو تیار ہے۔ پڑوسن تیس روپے مہینے پر الطاف کی خدمت کرنے کے لیے تیار ہو گئی۔

زندگی پھر اسی طرح ٹھوکریں کھاتی چلنے لگی۔ اکبری اسی طرح سر پہ ٹوکری اٹھائے کباب اور پھلکی لیے گھروں کے چکر لگاتی رہی کہ اچانک ایک دن غائب ہو گئی۔

Scanned with CamScanner

وہ جن گھروں میں جاتی تھی ان میں سے کسی کو بھی نہیں معلوم تھا کہ وہ کہاں چلی گئی۔ کسی نے کہا، بیمار ہوگئی ہوگی، کسی نے کہا، اپنی بہن کے پاس چلی گئی ہوگی، کسی کی رائے تھی کہ اس نے کوئی دوسرا کاروبار شروع کر دیا ہوگا۔ مگر جب بھی شام ہوتی تو بہت سے گھروں میں اکبری کو یاد کیا جاتا۔ ''اے اتنا اچھا موسم ہے، اگر اکبری بوا گرم گرم کباب لے کے آجاتی تو کیا مزہ آتا!'' مگر اکبری نہیں آئی...

اور پھر کوئی چھ مہینے بعد ایک دن اچانک بوا نمودار ہوگئیں۔

گیلے کپڑے سے ڈھکی ہوئی بڑی سی ٹوکری سر پہ اٹھائے، وہ دیاساگری جوتی سے کھٹ کھٹ کرتی ہوئی اکبری بوا نے جیسے ہی آنگن میں قدم رکھا، گھر کی ساری ہلچل ایک دم رک گئی۔ دوڑتے بھاگتے شور مچاتے بچوں نے کھیلنا چھوڑ کر بوا کو دیکھا اور ان کی آنکھوں میں چمک آ گئی۔

باجی باورچی خانے سے چلائیں، ''ارے اکبری بوا، اللہ کتنے دنوں کے بعد آئی ہو...''

فیاضی بیگم حقے کا کش لیتے لیتے رک گئیں اور آواز اونچی کر کے بولیں: ''اے اکبری، تو کہاں غائب تھی اتنے مہینوں سے؟''

بوا نے ٹوکری چبوترے پہ رکھی اور ایک پیڑھی گھسیٹ کر ٹوکری کے پاس ہی بیٹھ گئیں۔

''اے کیا پوچھ رہی ہوں میں؟ کیا بیمار تھی؟'' فیاضی بیگم پھر بولیں۔

بوا نے اپنی میلی اوڑھنی سے پسینہ پونچھا اور کہا، ''عدت میں تھی۔''

''عدت، کیا تو نے دوسرا نکاح کر لیا تھا؟''

''اے اللہ نہ کرے! میں کیوں کرتی دوسرا نکاح۔ وہ الطاف گزر گیا نا...''

تب تک باجی بھی باورچی خانے سے باہر آ چکی تھیں۔ وہ چونک پڑیں۔ ''الطاف؟ مگر اس نے تو تمھیں طلاق دے دی تھی۔''

''ہاں وہ تو دے دی تھی، مگر میرا مرد تو تھا نا۔''

''طلاق کے بعد وہ تیرا مرد کیسے رہا؟ شوہر مر جائے تو اس کی بیوہ چار مہینے دس دن گھر میں بیٹھتی ہے۔ تو اس کی بیوی تھی کیا جو عدت کر رہی تھی؟''

بوا کچھ پریشان ہوگئیں۔ ''پہلے تو تھی نا...''

''ہٹ دیوانی!'' فیاضی بیگم ہنس پڑیں۔ ''عدت تو اسے کرنی چاہیے تھی، کیا نام تھا اس کا، ہاں حسینہ۔ بیوہ تو وہ ہوئی ہے۔''

اکبری نے برا سا منھ بنایا اور ہاتھ نچا کر بولی، ''اس حرمزادی کو تو خبر بھی نہیں ہوگی۔ وہ تو اپنے یار کے ساتھ عیش کر رہی ہوگی پاکستان میں۔''

فیاضی بیگم نے کہا، ''ارے کسی ملا سے ہی پوچھ لیا ہوتا۔''

''اب جو ہوا سو ہو گیا۔ وہ میرا مرد تھا یا نہیں تھا، مجھے جو کرنا تھا میں نے کیا۔ اس کا موت گزرا کیا، تیجہ، دسواں، چالیسواں بھی کیا۔ میں نے اپنا فرض پورا کر دیا، اب میرے جی پہ کوئی بوجھ نہیں ہے۔''

باجی ہنسیں اور بولیں، ''طلاق کے بعد عدت! اکبری بو، تم سچ مچ دیوانی ہو۔''

''اے خاک ڈالو ان باتوں پہ! یہ بتاؤ، چھوٹی پیالی بناؤں یا بڑی؟... پھلکی ایک دم تازہ ہے...''

❀❀

سٹی پریس میں دستیاب مطبوعات

بے افسانہ

مرزا اطہر بیگ

قیمت: ۲۰۰ روپے

ناشر: سانجھ پبلی کیشنز، (لاہور)

غلام باغ

مرزا اطہر بیگ

قیمت: ۶۰۰ روپے

ناشر: سانجھ پبلی کیشنز، (لاہور)

مغالطے مبالغے

مبارک حیدر

قیمت: ۲۰۰ روپے

ناشر: سانجھ پبلی کیشنز، (لاہور)

صفر سے ایک تک

مرزا اطہر بیگ

قیمت: ۳۰۰ روپے

ناشر: سانجھ پبلی کیشنز، (لاہور)

تعلیم اور ہماری قومی الجھنیں

ارشد محمود

قیمت: ۳۰۰ روپے

ناشر: سانجھ پبلی کیشنز، (لاہور)

تہذیبی نرگسیت

مبارک حیدر

قیمت: ۱۵۰ روپے

ناشر: سانجھ پبلی کیشنز، (لاہور)

سیلاب ڈائری

وسعت اللہ خان

قیمت: ۳۰۰ روپے

ناشر: پاکستان اسٹڈی سینٹر، جامعہ کراچی (کراچی)

تصورِ خدا

ارشد محمود

قیمت: ۲۰۰ روپے

ناشر: گلشن ہاؤس، (لاہور)

سٹی پریس میں دستیاب مطبوعات

افسانے کی حمایت میں

شمس الرحمٰن فاروقی

قیمت: ۲۴۰ روپے

ناشر: شہرزاد پبلی کیشنز، (کراچی)

افسانے کی تلاش

نیر مسعود

قیمت: ۲۴۰ روپے

ناشر: شہرزاد پبلی کیشنز، (کراچی)

دھنی بخش کے بیٹے

حسن منظر

قیمت: ۲۰۰ روپے

ناشر: شہرزاد پبلی کیشنز، (کراچی)

دو مختصر ناول

حسن منظر

قیمت: ۱۲۰ روپے

ناشر: شہرزاد پبلی کیشنز، (کراچی)

خاطرِ معصوم

ضمیر الدین احمد

قیمت: ۱۸۰ روپے

ناشر: شہرزاد پبلی کیشنز، (کراچی)

تدیدی

حسن منظر

قیمت: ۲۰۰ روپے

ناشر: شہرزاد پبلی کیشنز، (کراچی)

شادیانے

نجیب محفوظ؛ ترجمہ: فہمیدہ ریاض

قیمت: ۱۸۰ روپے

ناشر: شہرزاد پبلی کیشنز، (کراچی)

یہ خانۂ آب و گل

انتخاب و ترجمہ: فہمیدہ ریاض

قیمت: ۲۲۰ روپے

ناشر: شہرزاد پبلی کیشنز، (کراچی)

نئی کتابیں

آج

(پہلی جلد)

ترتیب: اجمل کمال

Rs.795

ثقافتی گھٹن اور پاکستانی معاشرہ

ارشد محمود

(نیا اضافہ شدہ ایڈیشن زیرِ طبع)

تیسری جنس

سندھ کے خواجہ سراؤں کی

سماجی حیثیت کا ایک مطالعہ

مؤلف: اختر حسین بلوچ

Rs.200

شہزادہ احتجاب

(ناول)

ہوشنگ گلشیری

فارسی سے ترجمہ: اجمل کمال

Rs.70

ریت پہ بہتا پانی

(شاعری)

قاسم یعقوب

Rs.160

اردو کا ابتدائی زمانہ

(تنقید و تحقیق)

(تیسرا ایڈیشن)

شمس الرحمٰن فاروقی

Rs.250

تبادلہ

(ناول)

وبھوتی نرائن رائے

ہندی سے ترجمہ: زیبا علوی

Rs.200

انگلی کے دیس میں

(ناول)

ولاس سارنگ

مراٹھی سے ترجمہ: گوری پٹوردھن، اجمل کمال

Rs.150

Scanned with CamScanner

ژولیاں

میراجی کے لیے

(ناول)

Scanned with CamScanner

ژولیاں فرانسیسی نژاد ژولیاں کولومو (Julien Columeau) کا قلمی نام ہے جسے وہ اپنی اردو اور پنجابی تحریروں کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ ژولیاں 1972 میں فرانس کے علاقے پرووانس میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے اپنی زبان پرووانسال کے علاوہ فرانسیسی میں بھی لکھا ہے۔ ہندوستان میں اپنے آٹھ برس کے قیام کے دوران انھوں نے ہندی اور اردو سیکھی، اور اب پچھلے سات برس سے پاکستان میں مقیم ہیں۔ وہ انٹرنیشنل کاؤنسل آف ریڈ کراس سے وابستہ ہیں۔ اردو میں ان کا پہلا ناول ساغر 2010 میں شائع ہوا جو شاعر ساغر صدیقی کی زندگی کو ایک تخلیقی ہیئت اور منفرد لسانی تجربے کی صورت میں پیش کرتا ہے۔ ان کا ایک اور ناول زلزلہ ہے جس کا ایک حصہ کچھ عرصہ پہلے کراچی کے رسالے دنیازاد میں شائع ہوا تھا۔

اگلے صفحات میں ژولیاں کا ناول میراجی کے لیے پیش کیا جا رہا ہے جس کا موضوع، ظاہر ہے، میراجی کی نجی اور تخلیقی زندگی ہے۔ ژولیاں نے

Scanned with CamScanner

1

تم ازل سے ہجرت کر رہے ہو۔ تمھارے پردادے ازل سے ہجرت کر رہے تھے۔ شنید ہے کہ انھوں نے ابتدائی برفوں کے پگھلنے کے فوراً بعد ایشیائے وسطیٰ کے میدانوں کا رخ کیا، اور وہاں سے گزر کر کشمیر میں جا آباد ہوئے۔ وہاں وہ صنم پرستوں سے ہندو ہو گئے اور ہندوؤں میں پنڈت بن گئے۔ پھر برفباری اور قحطوں نے ان کو کشمیر سے بھگایا۔ وہ پنجاب آ گئے، مشرف بہ اسلام ہو گئے اور برطانوی سرکار کے دفتروں میں ملازمت کرنے لگے۔

آج اس ازلی ہجرت کا ایک نیا باب شروع ہو گیا جس کے موقعے پر تمھارے خاندان کے افراد پہلی دفعہ بحیرۂ عرب کی ہواؤں سے ملاقی ہو جائیں گے۔ آج تمھارے والدین گجرات کی طرف ہجرت کرنے لگے ہیں۔ تمھارے باپ کو بلول بلایا گیا۔ وہاں اسٹیشن کے چیف انجینئر کی آسامی اس کے لیے مخصوص ہوئی ہے۔

تم اس وقت ایک مولودِ نو ہو، جسے ایک جوان جوڑی ایک پنگھوڑے میں چھپا کر بہت دور لے جانے والی ہے۔ لاہور سے سورت جانے والی ٹرین میں دو سیٹیں اس جوڑی کے لیے مختص ہوئی ہیں۔ ان سیٹوں کے درمیان تمھارے پنگھوڑے کو رکھا گیا ہے۔ دھوئیں، شور، سیٹیوں اور ہچکولوں نے تمھاری چھوٹی سی ذات کو بہت پریشان کیا۔ لیکن تم روتے نہیں رہے ہو۔ تم چپ ہو۔ نامعلوم سفروں کا تحیر تمھاری رگ و پے میں اترنے لگا ہے، اور یہ تحیر تمھارے نوخیز وجود کو خاموشی سے پُر کر چکا ہے۔

2

ٹرین روانہ ہو گئی۔ تمھارا پنگھوڑا تمھارے ماں باپ کے درمیان جھول رہا ہے۔ تمھاری آنکھیں ابھی تک بینائی کی نعمت سے نا آشنا ہیں۔ تمھارے ماں باپ کی آنکھیں تمھاری خاطر کھڑکی کے بھاگتے منظروں کو تاک رہی ہیں۔ شوریدہ سر شہر، بل کھاتی ندیاں منہمک دیہات . . . ان کی آنکھوں

Scanned with CamScanner

سے کوئی منظر نہیں بچنے پاتا ہے۔ یہ سب مقامات ان کے لیے بے نام اور اجنبی ہیں، لیکن تھوڑا بہت غور کرنے سے ان پر ظاہر ہوتا ہے کہ ٹرین مسلم کشوروں سے گزر رہی ہے۔ شہر ہوں، دیہات یا نہریں، یہاں سب کے دلوں میں خدا کا خوف موجود ہے۔ شہروں کے گنبد اور مینار رات دن انسانوں کی منتوں سے پُر اور آباد ہیں۔ کھیتوں کی گندم، مکئی اور سورج مکھیاں سجدے کے لیے جھکی ہوئی ہیں۔ ندیوں کے سرسبز جزیرے اوپر والے کے لیے پانیوں سے تیمم کرتے ہیں۔ جی ہاں، کھیتوں میں، سڑکوں اور ساحلوں پر، بہت سے حاجی صاحب دیکھے جا سکتے ہیں جن کی سرمہ آگیں آنکھیں ہواؤں کو چیر کر ملک الموت کے سبز رنگ نقشِ قدم پر لگی ہوئی ہیں اور تمام کنوؤں، بر خلقِ خدا کی فرمانبردار مستورات نظر آ رہی ہیں جنھوں نے اپنی نازاں زلفوں کو حیادار چادروں سے ڈھانپ اور اپنے دراز جسموں کو ڈھیلے ڈھالے کپڑوں میں چھپا رکھا ہے۔ نہ ان کے بازو، نہ ان کے سینے، نہ ان کی ٹانگیں اور نہ ان کے ٹخنے نمایاں ہونے پاتے ہیں۔ عریاں صرف ان کی جھکی ہوئی گردنیں اور ان کے منہمک چہرے ہیں۔

پھر آہستہ آہستہ کھڑکی کے منظر دوسرے خدوخال اختیار کرنے لگے ہیں۔ آسمان کی بھیگی ہوئی وسعتوں سے حتیٰ مخلوقات اور تعمیرات ستیزہ کار تھیں، سب صفحۂ ہستی سے یکایک مٹ گئیں۔ کھیت اور کنویں ریت کے ٹیلوں تلے سو گئے، مکانات اور عبادت گاہیں ناگ پھنیوں میں ڈھل گئیں، اور ندیاں اور جزیرے زمین سے منہا ہو گئے۔ یہاں دھرتی غریب ہے اور آسمان زرخیز۔ یہاں اوپر والے نے کسی کو بسنے کی سہولت نہیں دی۔ یہ اس کی سلطنت کا علاقہ غیر ہے جس کا ذکر کتابوں میں نہیں ملا۔ جس کا نقشہ انسانوں کی دسترس میں نہیں ہے۔ ٹرین تھل کے علاقے میں داخل ہو گئی ہے۔

رات ڈھل گئی۔ ٹرین میں تمام مسافر سونے کی تیاری کر رہے ہیں۔ سب اپنی برتھوں پر سمٹ کر بُنی موٹی چادروں میں روپوش ہو رہے ہیں۔ باری باری سارے قمقمے بجھ رہے ہیں۔ اندھیرا چھا رہا ہے، اور چند منٹ کے سیاہ سکوت کے بعد آوازوں کی آتش بازیاں چھوٹنے لگتی ہیں۔ ڈکاریں، خراٹے، غرغرے، پاد... فحش آوازوں سے رنگین جشن کا آغاز ہوا ہے۔ تاریکیوں کی بکل مارتے ہی فوراً ہم سفر تہذیب کا دامن چھوڑ گئے، ورنہ دن کے سنجیدہ چہرے ان سب آوازوں کو دبوچ کر سینوں تلے کچلے جا رہے ہیں۔ رات بھر ہچکیوں اور رنگ برنگی آوازوں کی ہاتھا پائیاں تھکے ہارے ماں باپ پر نیند کی فرحتیں حرام کریں گی۔ رات بھر ان دونوں کی آنکھیں کھلی رہیں گی، اور ان

آنکھوں کے آگے اصلی آسمان کے بجائے ایک آہنی آسمان ہوگا، اصلی کہکشاں کی جگہ کیلوں کی ایک کہکشاں موجود ہوگی۔

3

اچانک کھڑکیوں سے روشنی کی کچھ دھاریں پھوٹ آئی ہیں اور نسیم کے جھونکے انھیں کھڑکیوں کے پاس محسوس ہونے لگے ہیں۔ مسافر ایک ایک کر کے نیند سے بیدار ہو رہے ہیں، اور جلد ہی، ان کے بے چین سائے ڈبے کی الگ الگ دیواروں پر سرکنے، جھومنے اور ایک دوسرے سے الجھنے لگتے ہیں۔

پھر ایک سیٹی کے ساتھ ٹرین ایک اسٹیشن پر رک رہی ہے۔ اس اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر کچھ نامانوس حلیے رکھنے والی مخلوقات منتظر ہیں۔ اس دور افتادہ اسٹیشن کے محترم مسافر یقیناً کسی اور عہد اور سیارے سے تشریف لائے ہیں۔ مسافر عورتوں کی پوشاکیں آگ اور پانی سے تیار ہوئی ہیں۔ ان میں شعلوں کی رنگینی ہے اور ندیوں کی روانی۔ یہ عورتیں سفر میں اپنی کل دولت، اپنا سارا سونا اور اپنی ساری چاندی، کانوں، ٹخنوں اور گالوں میں ٹانکنے کی عادت رکھتی ہیں۔ ان کے برعکس، ان کے میاں مفلس اور نیم برہنہ ہیں لیکن وہ اپنی اس نیم برہنگی کو ایک شاہی خلعت کی طرح زیب تن کرتے ہیں۔

ان کا لباس ان کی کھردری اور گندی جلد ہے۔ ان کے زیورات ان کے گھاؤ اور ان کی خراشیں ہیں۔

ان کے تن کے سب نشیب و فراز صاف نظر آتے ہیں لیکن ان کی آنکھوں کے احساسات نگاہوں سے اوجھل رہتے ہیں، اور یہ بے حس اور بے نیاز آنکھیں اپنی راہوں میں کوئی بھی رکاوٹ گوارا نہیں کرتی ہیں۔ ان سب زنانہ یا مردانہ مسافروں کی پیشانیوں پر کچھ کانٹے دار مرغولے لہرا رہے ہیں۔

پھر ٹرین چل پڑتی ہے۔ اسٹیشن کے عجیب و غریب مسافر پلیٹ فارم پر اٹل مورتیاں بنے ہیں۔ وہ آہستہ آہستہ، اپنے اسٹیشن کے ساتھ، کھڑکیوں سے غائب ہو رہے ہیں۔ پھر دو چار بستیاں ان کھڑکیوں سے گزر رہی ہیں۔ میلے سے مکان، سفید بت خانے، سیدھے سادے آنگن۔ یہ بستیاں سادہ لگتی ہیں لیکن ان سے دھوکا نہیں کھانا چاہیے۔ جادو ٹونے کے انتہائی پرانے الفاظ ان کی چھتوں تلے ہر دم دہرائے جاتے ہیں۔

پھر ہلول کا اسٹیشن آ رہا ہے۔ تمھاری زندگی کا پہلا سفر یہاں ختم ہو رہا ہے۔

4

ہلول میں تم پہلی دفعہ آنکھیں کھول رہے ہو۔ تمھاری نادان آنکھوں کے سامنے ایک کھلا ہوا جھروکا ہے، جہاں سے یک قدیم سا منظر جھانک رہا ہے۔ منظر کا مرکز ایک دیونما پہاڑ ہے، جس کے سر پر ایک گمبھیر مندر کا تاج جھلک رہا ہے۔ اس پہاڑ کے موٹے گلے میں گھنے بادلوں کا ایک گجرا ہے۔ بادل یاترا کر کے یہاں سانس لینے آئے ہیں۔ وہ دھیان گیان میں اپنا مضطرب من پرچانے آئے ہیں۔ مندر میں ایک رشی خوابیدہ ہے۔ آس پاس کے بادل اس کے چیلے ہیں۔ وہ صدیوں سے انتظار کی گھڑیاں کاٹ رہے ہیں۔ وہ خاموش اور ساکت ہیں، اس ڈر سے کہ کہیں ان کی گھن گرج اور حرکتوں سے رشی بیدار نہ ہو جائے اور تاؤ کھا کر، اپنی ترشول سی جیبھ سے ان کو ایک جان لیوا شراپ نہ دے۔

رشی کا یہ مندر، ایک پوتر اور اَدبھت جھلک بن کر، تمھاری آنکھوں کے راستے، تمھارے من میں اترتا جا رہا ہے اور من کی گہرائیوں میں ایک اذان کی آواز سے اس کی مڈبھیڑ ہو رہی ہے۔ یہ وہ اذان ہے جو کہ تمھارے والد صاحب نے چند ہفتے پہلے، تمھاری پیدائش کے موقعے پر، تمھارے نوخیز کانوں میں دی ہے۔ اس طرح تمھارے من کی تہہ میں ایک رشی کا آسرا آباد ہوگا، جس میں ایک مسلمان باپ کی اذان گونجتی رہے گی۔

تمھاری آنکھیں جھروکے کے منظر کو، الوداع کہہ کر اپنے گرد و پیش کا جائزہ لینے لگی ہیں۔ تمھارا پنگھوڑا ایک چھوٹے کمرے کی چھت سے لٹک رہا ہے۔ نسیم کی نادیدہ انگلیاں اس کو جھلا رہی ہیں۔ پاس میں ایک نسائی پیکر موجود ہے۔ یہاں ایک وستر ہین اپسرا، اپنے اشنان سے فارغ ہو کر، ایک چمکدار کنگھی سے اپنی کشمیری اور طویل تر زلفوں کو سنوار رہی ہے۔ اشنان کے بعد اس کا جسم بالکل سیال ہوا ہے۔ پانی نے اس نازاں جسم پر بہہ کر اس کے انگ انگ کو اپنی چنچلتا، کوملتا اور شفافیت تفویض کی ہیں، اور اس کی زلفوں کی تاباں کہکشائیں سورج کو شرمندہ کرتی ہیں۔ سورج ان سے جلتا ہے۔ اس کی کمان سے کرنوں کے منتقم تیر برستے جا رہے ہیں اور سب ان زلفوں کی طلسمی ہالے کو چھو کر دھواں ہو جاتے ہیں۔ یہ اپسرا تمھارے تخیل پر ایک انمٹ چھاپ چھوڑے گی۔ تم عمر بھر اس کے سیال جسم کی عبادت کرو گے اور بہت ساری اپسراؤں کے فرضی یا اصلی جسم اس مقدس جسم سے جڑ

Scanned with CamScanner

جائیں گے اور ہر جسم پچھلے کا نعم البدل ہوگا۔ لیکن اس مقدس جسم کا نعم البدل کبھی پیدا نہیں ہوگا۔ وہ دراصل ایک جوان اور پاکباز ماں کا جسم ہے، اور تم اس ماں کے پہلے بچے ہو۔

5

ان دنوں میں تم اسکول کی چھٹی جماعت میں پڑھتے ہو۔ ہلول کے چھوٹے اسکول میں تم روزانہ سولہ بچوں کے ساتھ بیٹھ کر اساتذہ کے لیے درس سنتے ہو۔ تاریخ ہو، ریاضی یا جغرافیہ، سب مضامین یوریت کے حامل ہیں۔ ان میں لے دے کے صرف اردو کا مضمون تمھیں پسند ہے۔ تم اردو شوق سے پڑھتے ہو۔ دربارِ اکبری اور مسدس حالی جیسی نصابی چیزیں تمھاری نظر سے گزر چکی ہیں لیکن تم کو زیادہ لطف امراؤ جان ادا جیسا ممنوع ناول پڑھنے میں آتا ہے لکھنؤ کی طوائفوں کی حرکات وسکنات تم کو دلچسپ لگتی ہیں، لیکن وہ، اکبر کی جنگوں کی طرح، تمھارے حال احوال سے غیر وابستہ ہیں۔ مغلوں، عربوں یا نوابوں کی ان فرسودہ کہانیوں سے کیا حاصل، ہلول جیسے علاقے میں جہاں مہابھارت سے قبل کے ہندو آباد ہیں، جن کے گیت ستاروں کی طرح لازوال ہیں ور ریت رواج آسمانوں کی طرح۔ فانی۔ اور ان دنوں میں ایک مغل ملکہ یا ایک لکھنوی رقاصہ کی کتابی اور شائستہ ادائیں نہیں بلکہ ایک اصلی اور جنگلی سی ہندو لڑکی کی ازلی اور بے ڈھب سندرتا تم کو تڑپاتی ہے۔ اس لڑکی کا نام یمونہ ہے، اور وہ تمھارے گھر کے بھیل چوکیدار کی بیٹی ہے۔

یمونہ اسکول نہیں جاتی ہے اور، چونکہ وہ دورِ حاضر کی بوجھل تعلیم سے ناآشنا ہے، وہ آزادی سے پرانے زمانے کی روشوں میں سانس لیتی ہے۔ وہ اب تک ہندوؤں کے رزمیوں کی اساطیری مستورات کے گہنے اور ملبوسات پہنتی ہے۔ اس کے گلے میں چاندی کا ایک بڑا سا طوق چمکتا ہے جسے ایک غیر مرئی ہار ایشور کے غیبی ہاتھ سے جوڑتا ہے۔ اس کی چولی کے نیچے اس کا کانسی کا پیٹ نظر آتا ہے، جس کے بیچوں بیچ ناف کی سیاہ آنکھ جھانک رہی ہے۔ اس کے گھاگرے کے نیچے اس کی پازیبیں آپس میں نوک جھونک کر رہی ہیں۔ یمونہ کی نادان ہستی کسی کے آگے سر جھکانے کے لیے تیار نہیں ہے۔ اس کی چال میں پرانے یُگ کی رسم ستی ادا کرنے والی رانیوں کی بے ساختہ رعونت ہے۔ یمونہ کی ہٹ دھرمی اس کے بے پناہ حسن کا سرچشمہ ہے۔

Scanned with CamScanner

ہر دوپہر، جب یمونہ سوکھی ٹہنیاں جوڑنے کے لیے جنگل کی طرف چلی جاتی ہے، تم چوری چھپے اس کا تعاقب کرتے ہو۔ یمونہ، ان لمحوں میں، ایک اذیت کش دیوی معلوم ہوتی ہے۔ وہ چلتے چلتے پگڈنڈیوں کی دھوپ میں ہانپ رہی ہے۔ اس کے چہرے کے آئینے پر پسینے کے قطرے فروزاں ہو رہے ہیں۔ اس کے سینے کے ساحل سے بے چینی کی موجیں ٹکرا رہی ہیں، لیکن اس کا وجود، ہر قدم کے ساتھ، مزید مستحکم، مزید خوش ہو رہا ہے۔ اس کے بازو، اس کے پاؤں اور اس کے شانے لو اور حبس کے [illegible] سے بھی مضبوط ہو رہے ہیں، اور جب وہ اس جنگل کے دہانے پر پہنچتی ہے، اس کی دلیر ہستی اس [illegible] اور اونچے نباتات میں، جو کہ صدیوں سے مکمل استقلال اور خندہ پیشانی سے آسمان کی بھاری وسعتوں کو اپنے سروں پر اٹھائے ہیں، اس قدر گھل مل جاتی ہے کہ وہ پوری طرح اس [illegible] ہو چکی ہے۔ وہاں وہ اپنے کام میں جت جاتی ہے۔ اس کی [illegible] آواز [illegible] میں تحلیل ہو رہی ہے۔ [illegible] پازیبیں اوپر نیچے کھنک رہی ہیں، اور اس کے ہاتھوں میں سوکھی ٹہنیاں ایک دوسرے سے رگڑ کھاتے ہوئے ایک چتا کی سلگتی لکڑیوں کی طرح سرسرا رہی ہیں۔ اس کا جسم صدیوں اور [illegible] کا ایک سڈول شجر ہے اور تم، ایک مردہ پیڑ کے پیچھے چھپ کر، [illegible] پرورش کر رہے ہو، لیکن اس کا حسن تم سے دیر تک نہیں دیکھا جاتا [illegible] بے بسی اور پستی کا دردناک احساس ہوتا ہے۔ تم اس درخت کے [illegible] کی روش اپنا چکے ہو۔ تم بے کل اور بے [illegible] حاصل کرنے کے لیے ایک ہی راستہ باقی ہے۔ یمونہ کا جوش بھرا امرت نوش کرنا لازم ہوا ہے۔

لیکن [illegible] حاصل کرنا تمھارے بس کا روگ نہیں۔ وہ تم کو دیکھ کر ضرور بھاگ جائے گی [illegible] درخت اور نباتات مانع ہونے میں اس کی پوری مدد کریں گے۔ تم اگر [illegible] میں کامیاب ہو گئے تو اس بات کا خدشہ ہے گا کہ اس کا جسم تمھارے [illegible] ہاتھوں [illegible] جائے اور دھوئیں کی ایک اونچی محراب چھوڑ کر ہواؤں میں تحلیل ہو جائے۔ [illegible]، نہ تمھارا ہاتھ چھو سکتے ہیں۔ بس تمھارا [illegible] ہی اس کو ٹٹول سکتا ہے۔ [illegible] کے لیے، یمونہ کا خاکہ اتارنے کا عادی ہو جاتا ہے۔ تمھارے

Scanned with CamScanner

اسکول کی کاپی اس کی لفظی تصویروں سے بھری پڑی ہے:

خاموشی میں کھوئی ساری ہانک پکار
ختم ہوئے اب ہیرے پھیرے، ختم شکار
بھیل کی بیٹی! رکھ دے اٹھا کر تیر کمان
ساز اٹھا، کچھ ناچ دکھا، چل کہنا مان
رات کی گود میں جھولنے دے اب گیتوں کو
انشٹ کر دے اپنے بل سے لمحوں کو

یہ اداس سی کاپی، جو پہلے ہندسوں، اشکال، نقشوں اور تاریخوں سے اٹی پڑی تھی، راتوں رات تصویروں کا ایک رنگین اور سریلا البم بن گئی اور راتوں رات ان تصویروں میں دھوتوں یا حکم ناموں کا رنگ بھرنے لگا ہے، گویا لکھتے وقت تمھاری پریمیکا بھی اور عناصر قدرت بھی تمھارے محکوم ہوئے ہیں:

آ! ہو آ! ان زلفوں کو لہراؤ
زلفوں میں پنہاں ہیں شانے دکھلاؤ
ندی ان گالوں کی گرمی دور کرے
مست مدھر سانسوں کی نرمی دور کرے
بکھرے بال بنیں ناگن اور بس گھولیں
سندرتا کے بھید اندھیرے میں کھولیں

تمھاری اس بے انتہا طاقت کے سامنے یمونہ کی مزاحمت کب تک جاری رہ سکتی ہے؟ وہ جلد یا بہ دیر تمھاری گرفت میں آئے گی اور تم ایک نئی نویلی کیفیت سے دوچار ہو گے، جہاں نہ شرم نہ تہذیب نہ عقل کارفرما ہے۔ ایک مکروہ فعل اس کیفیت کا نتیجہ ہوگا اور تم اس کے ارتکاب سے ایک ابدی پاپی ہو گے۔

6

دوپہر کے تین بج گئے۔ دھوپ کی تپش سے دھرتی میں جا بجا گڑھے پڑ گئے، اور ان گڑھوں سے زیرِ زمین سے آتش فشانوں کا دھواں اٹھنے لگا ہے۔ تم دیر سے ایک درخت کے پیچھے چھپ کر یہ تماشا دیکھ رہے ہو۔ وہ حسبِ معمول زمین سے سوکھی ٹہنیاں اٹھا رہی ہے۔ چراگاہ تک، وہ ایک پوشیدہ آواز سن کر ٹھٹک رہی ہے اور ایسی چوکس ہو رہی ہے گویا اس نے پاس کی جھاڑیوں میں کسی گمراہ شیر کی آہٹ یا جنگل کے شکاری دیوتاؤں کی چہ میگوئیاں سنی ہیں۔ اور وہ اپنی نظروں کی گرفت میں زمین پر دو قدم چل رہی ہے، اور ایک پرانے درخت کے سائے میں اکڑوں بیٹھ رہی ہے۔ پھر وہ اپنے ذخیرے کا دھیان کرتے ہوئے دامن اٹھا رہی ہے، اور اس کی رانوں کے سنگم پر اس کی اندام نہانی صاف نظر آنے لگ پڑتی ہے جس پر تھوڑا سبزہ اگا ہوا ہے۔ یعنی سن بلوغت کو پہنچی ہے۔ اس کا بچپن کچھ دیر پہلے ختم ہو چکا ہے۔ اس کا چھوٹا جسم ایک عورت کے جسم سے مشابہ ہونے لگا ہے۔ کیا پتا؟ شاید اس کا بیاہ ہو چکا ہے۔ اس کا پتی کوئی چرواہا ہوگا، جو کہ پربتوں کے مرغزاروں میں اپنے مویشی لے گیا ہے۔ وہ چند ہفتے بعد پربتوں سے اتر کر سہاگ رات کی لذتیں تازہ کرنے اپنی چھوٹی دلہن کے پاس آئے گا۔ یکدم، یعنی دونوں رانوں کے درمیان سے گرم جل کی ایک دھارا نکلنے لگی ہے۔ نیچے مٹی، ہوا اور گھاس تینوں اس جل میں تر بتر ہو رہے ہیں۔ مٹی کے شرمیلے ذرے سرخ ہو رہے ہیں، ہوا کے جھونکے خوشی سے جھوم رہے ہیں اور گھاس کی فرمانبردار ڈنڈیاں گردن جھکا کر تسلیم بجا لا رہی ہیں۔ اس جل کی گرمی میں قدرت کا دربار لگ رہا ہے۔ کرکٹ، چیونٹیاں، کیڑے اور سنپولیے گھاس کی خم کھاتی ڈنڈیوں پر رینگ رینگ کر حاضری کے لیے آ رہے ہیں۔ ان تمام مخلوقوں کی طرح تمھارا جوان دل اس جل کی طرف کھنچ رہا ہے۔ اس جل کی حرارت میں نہانا تمھاری شدید ترین آرزو ہے۔ کاش اس سے جادو کا کوئی منتر ازبر ہوتا۔ اس سے، وہ چار شبد جپ کر تم اس قدرتی دربار کے حاضرین کی مانند خفیف اور نادیدہ ہو جاتے اور پھر جل کے اشنان سے لطف اندوز ہو جاتے۔ لیکن تمھاری طرح کے مسلمان بچوں کو کوئی منتر یاد نہیں ہے۔ پھر وہ اپنی حاجت سے فارغ ہو کر ایک جھٹکے کے ساتھ اٹھ رہی ہے اور اپنے گھر کی سمت میں دو تین قدم اٹھانے کے بعد، ایک ہاتھ سے لکڑی کی گٹھری اٹھا کر چل دیتی ہے۔ جنگل کے چوبی مکینوں کی

Scanned with CamScanner

بے نور آنکھوں سے دور، تمھاری بے تاب آنکھوں سے دور۔

تم پر ایک ہذیانی کیفیت طاری ہوئی ہے۔ تمھارا گلا سوکھ رہا ہے۔ تمھارا سینہ دھڑک رہا ہے۔ تمھاری آنتیں تمھارے پیٹ میں زقندیں بھر رہی ہیں اور تمھاری چھوٹی ناگن تمھاری شلوار کے بیچوں بیچ سر اُٹھا رہی ہے۔ پھر، خود بخود، تمھاری شلوار کا ازار بند کھل رہا ہے، اور سارا جہاں تمھاری ناگن کا دیدار کرنے لگتا ہے۔ پھر تم خطرے سے غافل ہو کر ناگن کو اپنی مٹھی میں پکڑ رہے ہو اور اس کو جھٹکے دے دے کر مروڑ دیتے ہو۔ یہ شاید وہ متنازعہ عمل ہے جسے بڑے بزرگوں نے 'تن آسانی' کے لقب سے نوازا ہوا ہے۔ تمھارا سارا جسم اس ناگن کے ساتھ جھوم رہا ہے، ڈول رہا ہے، گویا تمھارے پاؤں ایک جنبان اڑن کھٹولے پر کھڑے ہیں، اور اس بے چین تن آسانی سے گزرنے کے بعد تمھاری ناگن اپنا زہر تھوکنے کو تیار ہو رہی ہے۔ اس کا زہر نکلتا ہے، جس کی بوندیں موتیوں کی طرح شفاف ہیں۔ دریں اثنا، قدرت کی چھوٹی مخلوقات، گرگٹ، چیونٹیاں، کیڑے اور سنپولیے، گھاس کی اوٹ میں اپنی پنچایت بٹھا چکی ہیں۔ کچھ نسلیں تمھارے بہادر موتیوں کی تعریف کرتی ہیں، کچھ نسلیں تمھاری بے ہودگی کی مذمت، لیکن اس وقت کوئی توصیف یا مذمت تم پر اثر انداز نہیں ہونے پاتی ہے کیونکہ احساسِ گناہ کا سارا میل تمھارے دل سے نکل گیا ہے۔ یمونہ نے اپنے جل کی نمی مٹی کے حوالے کی ہے اور اس نمی سے فیض پا کر تمھاری تن آسانی براہِ راست یمونہ کے تصور کے آب و گل تک پہنچ گئی ہے۔

تمھاری زندگی کا پہلا جنسی منظر اور تمھاری پہلی تن آسانی واقعی بیان ہونے کے لائق ہیں۔ سو تم دونوں کو الفاظ میں ڈھال کر اپنی اسکول کی زرد کاپی میں رقم کرتے ہو اور کاپی کے ورقوں میں، ان الفاظ کے تخموں سے، ایک نظم خود بخود کھل اٹھتی ہے۔ تم آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اس نو شگفتہ نظم کو دیکھ رہے ہو۔ وہ عجائب کا ایک انوکھا سا پودا ہے۔ تمھارا قلم کتنا زرخیز نکلا! اور کتنا بے ہودہ بھی! تم نے کسی فحش حرکت یا جنسی احساس بیان کرنے سے دریغ نہیں کیا، اور اپنی اس معجزاتی نظم کو پڑھ کر تمھارے اندر ایک تشنگی سی پیدا ہو رہی ہے۔ تمھاری ناگن توجہ اور پیار کا ایک خراج مانگ رہی ہے اور تمھارا بایاں ہاتھ اس کے رعب میں آ کر اس کی خدمت کرنے لگ پڑتا ہے اور اسی طرح پہلی تن آسانی کی ہوس انگیز روداد پڑھ کر تم دوسری بار تن آسانی کا عمل پورا کرتے ہو:

Scanned with CamScanner

میں بھی موجود تھا، اک کرمکِ بے نام و نشاں
میں نے دیکھا کہ گھٹا شق ہوئی، دھارا نکلی
برق رفتاری سے اک تیر کماں نے چھوڑا
اور وہ خم کھا کے لچکتا ہوا تھرّا کے گرا
قلۂ کوہ سے گرتے ہوئے پتھر کی طرح

تم آئندہ بہت دفعہ چوری چھپ کر بھونہ کا درشن کرو گے لیکن آگے تمھیں نہ اس کی اندام نہانی، نہ اس کے جل کی دھارا دیکھنے کا اتفاق ہوگا۔ اور ڈیڑھ سال بعد جب ملتان ڈویژن میں تمھارے والد صاحب کی بدلی ہوگی تم کو ان کھٹے میٹھے اور حیرت انگیز درشنوں کو ہمیشہ کے لیے الوداع کہنا ہوگا۔

7

تم لوگ کافی دنوں سے ملتان ضلعے کے ایک دیہات میں رہتے ہو۔ تم نے ہول چھوڑتے وقت اپنے بچپن کو خیرباد کہا۔ تم بچے سے لڑکے بن گئے ہو اور لڑکا بن کر تم ایک بہت بڑے راز کے مالک بن گئے ہو۔ اب تمھاری اسکول کی کاپی میں تیس رازدارانہ جنسی نظمیں مرقوم ہوئی ہیں۔ ان نظموں کے لیے تمھاری آنکھیں اور ہین بن گئیں اور وہ دور و نزدیک کی بے پروا عورتوں کے درشن اپنی گرفت میں لیتی گئیں۔ یہاں ایک آم کے درخت کے سائے میں ایک نچلی ذات کی عورت اپنے ننھے منے بچے کو اپنی فیض چھاتی کا دودھ پلا رہی ہے۔ وہاں ایک عیسائی لڑکی اسکول جا رہی ہے جس کی فراک کے نیچے دو کالی کالی عریاں ٹانگیں نظر آ رہی ہیں، اور تمھارے گھر کے آنگن میں ایک ہندو نوکرانی جھاڑو دے رہی ہے جس کے ننگے بازو اور ننگا پیٹ دھوپ میں ایک بے ہنگم ناچ ناچ رہے ہیں۔ ہر دو چار دن بعد تم نے ان درشنوں کو اپنی اسکول کی کاپی میں درج کیا۔ اس وقت تمھارا دایاں ہاتھ تمھارے قلم کو گردشیں دے رہا تھا اور بایاں ہاتھ تمھاری ناگن کو نچا رہا تھا، اور یہ کہنا ناممکن تھا کہ ان دونوں ہم تال اور ہم رفتار ہاتھوں میں کون استاد تھا اور کون شاگرد۔

یہ اسکول کی کاپی جس کے بھی ہاتھ لگ جائے گی، وہ تمھاری نظمیں پڑھنے کے بعد تم کو ایک

Scanned with CamScanner

جنسی خبطی قرار دے گا۔ سو تم زمانے کے عتاب سے بچنے کے لیے اپنے اشعار کی جنسیت کو نامانوس علامات کی ایک ہلکی سی ردا میں چھپا لیتے ہو۔ تم نے اپنے اسکول کی چھوٹی سی لائبریری میں میر، غالب اور داغ کے دیوان پڑھے اور ان کے بے شمار شعر رٹ کر ان کی مخصوص زبان کو اپنے اندر پوری طرح اتارا ہے اور اب، نظمیں لکھتے وقت، جب یہی زبان تمھاری نس نس سے امڈتی ہے تو تم اس کو مجروح و مضروب کرتے ہو۔ ان جراحتوں اور ضربوں سے الفاظ روایتی اضافت اور ترکیبات کی زنجیروں سے آزاد ہو جاتے ہیں۔ پھر تم اپنی پسند کے مطابق ان الفاظ کو آپس میں بیاہ دیتے ہو۔ تمھارے سامنے مذاقِ عام نہیں بلکہ بے ربطیوں کا نادر آہنگ ہے۔ تم سے نہ استعارے، نہ تشبیہیں بنتی ہیں۔ تم سے بنتی ہیں صرف چند علامتیں، جو کہ تمھاری جنسیت کی ژولیدہ بیاں ترجمان ہیں، اور جب ضرورت پڑتی ہے، تم ایک بحر اپنی ناگن کو نچانے والے بائیں ہاتھ کی تال سے مستعار لیتے ہو اور اپنی ساری علامتوں کو اس بحر کی ڈوری سے باندھ لیتے ہو۔ تم بیک وقت اپنے اشعار کے خالق، ہم راز، منتظم اور نگران ہو۔

پھر یہاں پر تم کو اپنی زندگی کا دوسرا جنسی منظر دیکھنا نصیب ہوگا اور یہ منظر، پہلے والے سے آمیز ہو کر، تمھاری نمو پانے والی جنسیت کی تکمیل کرے گا۔ ایک روز دوپہر کے وقت، تمھارے والدین اپنے کمرے میں سو رہے ہیں اور تم گھر کے آنگن میں ایک آرام کرسی پر بیٹھ کر داغ کا دیوان پڑھتے ہوئے مسلسل جمائیاں لے رہے ہو۔ داغ صاحب بور شاعر ہیں۔ ان کا لہجہ پارینہ ہے۔ ان کی لفظیات گھسی پٹی ہے۔ ان کے استعارات اور تشبیہات ندرت اور تاثیر سے خالی ہیں۔ ان کے یہاں جنسیت نہیں ہے بلکہ ایک معمولی چھیڑ چھاڑ۔ اچانک دروازہ کھل جاتا ہے اور دہلیز پر ایک لڑکی نمودار ہو جاتی ہے۔ وہ ایک ہمسائی کی بیٹی ہے، اپنے گھر کے بے تکلف کپڑوں میں ملبوس: ایک تنگ سی نیلے رنگ کی بلاؤز اور ایک سفید لنگی اس کے جسم کو ڈھک رہی ہیں۔ اس نے دائیں ہاتھ میں ایک تھالی پکڑی ہوئی ہے۔ اس کا بایاں ہاتھ دروازے کو کھلا رکھنے میں مصروف ہے۔ تھالی میں ایک مشہور مندر کا پرساد ہے، جسے وہ تمھارے گھر والوں کے سامنے پیش کرنا چاہے گی "آپ کے ماتا پتا کدھر ہیں؟" وہ پوچھ رہی ہے، لیکن تمھاری زبان جواب دینے کے قابل نہیں رہی۔ اس لڑکی کی لنگی نے تمھارے اوسان پر زیادتی کی ہے اور تمھاری زبان پر قفل لگا دیا ہے۔ اس لنگی نے اپنے اندر سورج کا

Scanned with CamScanner

سارا نور جمع کیا اور وہ پوری طرح شفاف ہو گئی، اور چونکہ یہ پڑوسن گھر پر زیر جامہ نہیں پہنتی ہے، اس کا نہاں خانہ پوری وضاحت سے لنگی کے آر پار نظر آنے لگا ہے۔ اس طرح وہ تمھارے سامنے جیوں ہو کر بھی اتنی ہی ننگی ہے جتنی کہ وہ اپنے حمام میں ہوتی ہوگی۔ یہ ننگا جسم تم سے صرف ایک میٹر کی دوری پر ہے لیکن اس کا مس تم سے کتنا دور ہے! شرافت، تہذیب اور آداب اس دوری کے خالق اور محافظ ہیں۔ تم پھر لاچاری سے اپنے والدین کے کمرے کی طرف اشارہ کرتے ہو۔ لڑکی اس طرف چل دیتی ہے اور تمھاری آنکھوں سے اوجھل ہو جاتی ہے، لیکن اس کو نہ دیکھ کر بھی تم اس کا درشن کرتے ہو۔ تمھاری روح اس کی لنگی کے ایک ایک دھاگے سے الجھ گئی ہے۔ تمھاری روح دھاگوں کے اس جنگل میں الجھ کر محوِ تماشا ہوئی ہے۔ تمھارے سامنے ظہور اور خفا، ایک شفاف لنگی میں پناہ لینے کے بعد، دیر تک کھیلتے رہے، الگ ہوتے رہے، ایک دوسرے میں پیوست ہوتے رہے۔ تم فوراً ہر طرح کی شفاف اشیا پر فدا ہو جاتے ہو۔ تم فدا ہو جاتے ہو ان ساری جالیوں، چلمنوں، اور روزنوں پر جن میں دیدہ اور نادیدہ کی بازیوں کا دیدار ممکن ہے۔

8

تمھارے والد صاحب کا تبادلہ ایک بار اور عمل میں آیا اور ملتان ڈویژن سے تم لوگ سکھر چلے گئے، اور سکھر شہر میں تمھاری ملاقات پنڈت کول سے ہوئی ہے۔

ہر شام تم اسکول کی چھٹی کے بعد دریائے سندھ کے روشن گھاٹ کی اور سدھار جاتے ہو۔ وہاں تک پہنچنے کے لیے تم کو دو چار تنگ بازاروں سے گزرنا پڑتا ہے۔ ادھر گلیوں پر تنی ہوئی چادروں کے سائے میں، گاہکوں، اشیا، خوانچوں اور دکانداروں کی باہمی زور آزمائی ہر وقت جاری ہے اور بوئیں بھی آپس میں زور آزما ہیں۔ پسینے کی بو، نالیوں کا تعفن اور عطر کی مہک ایک دوسرے کو پچھاڑ پچھاڑ کر باری باری تمھاری شامہ تک آ رہی ہیں، لیکن دریا کی بے پناہ کشش تم کو ان سب مجازی آزمائشوں سے بے نیاز کرتی جا رہی ہے اور تم چلتے جا رہے ہو۔ پھر بازاروں کی قطار ختم ہو رہی ہے۔ دریائے سندھ، سوا سمندر کر کے اور اپنے کنگنوں کو چھنکاتے ہوئے، اپنی سیج سے اٹھ کر تمھاری آؤ بھگت کو آ رہا ہے۔ تم ایک کشتی پر سوار ہو رہے ہو اور سادھو بیلا کے لیے روانہ ہو رہے ہو۔ دریا سے

Scanned with CamScanner

سندھ آہستہ آہستہ گنگا ندی کا ابہام اور تقدس اختیار کر رہا ہے۔ اس کی گہرائیوں سے پرانے یگ کے رشیوں کی آتمائیں لہروں کی سطح پر آ رہی ہیں۔ اس کا طاس سورگ باسیوں کی دنیاوی راکھ جذب کر کر کے روسیاہ ہوا ہے اور اس کی منجدھار میں اتنی شانتی محسوس ہوتی ہے کہ وہاں پر ایک منٹ بتا کر بھٹکتے ہوئے یاتری برسوں کی تپسیا کا پھل پا سکتے ہیں۔ پھر تم سادھو بیلا کی سیڑھیاں چڑھ کر مندر کے صحن میں داخل ہو رہے ہو اور، صحن سے گزر کر، تم ایک پرانے دروازے پر کھڑے ہوتے ہو۔ اس کے پیچھے پنڈت کول، مورتی بنانے والے، کا کمرہ ہے۔

سفید بال، گھن گرجتی آواز، گلابی گال اور نیلی آنکھیں، کول ایک انگریز آفیسر کا بہروپ بھر چکا ہے لیکن وہ ایک کشمیری پنڈت ہے، تمھارے پرداووں کی طرح، اور ایک عزلت نشین فنکار جس نے سالوں سے اپنا کمرہ نہیں چھوڑا۔ بہار کا مندر، دریا پار کے گھاٹ، گھنٹوں پار کے بازار، سب اس کے لیے ماضی کے قصے ہی ہیں۔ کول چوبیس گھنٹے اپنی شاہکار مورتی کی طرف متوجہ رہتا ہے۔ اس مورتی میں رادھا اور کرشنا کی پوتر جوڑی راز و نیاز میں مبتلا نظر آ رہی ہے۔ یہ مورتی مشرق اور مغرب کے فن کا سنگم ہے۔ یہ مورتی شاید کرۂ ارض پر کول کی واحد یادگار رہے گی لیکن کول اس کو مکمل کرنے سے قاصر ہے۔ وہ گھنٹوں تک اپنے لاچار اوزار ہاتھ میں لیے اس کو دیکھتا ہے، اور اس کو ستانے کے لیے نقص اور عیب باری باری اس کی آنکھوں پر یورشیں کرتے ہیں۔ وہ ایک مورتی نہیں بلکہ اپنے فن کی ہزیمت دیکھ رہا ہے۔ کول اپنے من بہلاوے کے لیے اکثر تمھیں بلاتا ہے۔ تمھاری صحبت میں اس کا تخلیقی کرب وقتی طور پر دور ہوتا ہے اور تمھارے سوالوں کے حضور میں اس کو اپنے سے بہتر طور پر کلام کرنے کا موقع ملتا ہے۔ ان خود کلامیوں کے دوران وہ اپنی جوانی کے دنوں کو یاد کرتا ہے، جب وہ پیرس کی فنونِ لطیفہ کی اکیڈمی (Academie des Beux Arts) میں مغربی مجسمہ سازی کے گوناگوں اسالیب سیکھ رہا تھا۔ اس کے والد صاحب بکھور ہے تھے کہ اس کا فرزند سعادت مند لندن میں وکالت پڑھ رہا ہے لیکن آوارہ گردی کا شوق تو کول کو کب کا پیرس لا چکا تھا! اس نے اکیڈمی کے شعبۂ مجسمہ سازی میں داخلہ لیا تھا اور اس کی راتیں کیفے پروکوپ کے مذموم اور معتوب شعرا کی سنگتوں میں گزرتی تھیں۔

تم ایک تبسم زیرِ لب کے ساتھ کول کی کہانیاں سنتے ہو۔ یہ عزلت نشین بزرگ خود کو ایک سندباد جہازی کہنے میں کوئی عار محسوس نہیں کرتا ہے، اور تم جب اس کی بڑھکوں اور مبالغہ آرائیوں سے تنگ

آتے ہو، تم اس کے کمرے کی ایک کھڑکی پر نظر ڈالتے ہو جس میں دریائے سندھ کی پیچ و تاب کھاتی ہوئی لہریں نظر آ رہی ہیں۔ سورج اس کے پانیوں میں ڈوبنے کو ہے۔ ساحل کے درخت ان پانیوں کو اپنے سایوں کی لمبی باہوں سے سجا کر مغموم کیے جا رہے ہیں۔ ڈوبیاں جا بجا ابھر کر ڈبکیاں مار رہی ہیں۔ دریائے سندھ ان مسلسل خودکشی کرنے والے ڈوبیوں کا ازلی مسکن ہے۔ گھاٹوں پر کچھ عورتیں اشنان کر رہی ہیں۔ ان کے جسم ایک ایک کر کے پانی کی تاریکیوں میں غرق ہو رہے ہیں۔ اب اشنان کرنے والی عورتیں کنول کی مورتی کی طرح ادھوری معلوم ہو رہی ہیں۔

کنول محسوس کر رہا ہے کہ تمھاری توجہ اس کی کہانیوں سے کنارہ کر گئی ہے۔ وہ چپ ہو جاتا ہے۔ اس کی آواز کے بند ہونے سے کمرے کا منظر پھر ویران لگنے لگا ہے۔ سو تم اس میں کچھ رونق بھرنے کے لیے اس سے پوچھ رہے ہو، ”کنول جی، یہ یورپ کے شاعر کیسے تھے؟“ کنول، جس کے حوصلوں کو تمھاری ہمت افزائی نے بہت بڑھایا، ایک نئی کہانی چھیڑ رہا ہے، ”وہ عجیب تھے۔ ان کی پوشاک دفتروں کے ملازموں کی سی تھی لیکن اس پوشاک تلے ان کے تن اتنے عریاں اور لاغر تھے جتنے کہ قدرت نے تخلیق کیے ہوتے ہیں۔ وہ اپنی پوری روح کے ساتھ Absinthe پیتے تھے اور ان میں کچھ بیہودہ بخت تھے۔ اور ان میں سے کچھ طوائفوں اور جواریوں کے ساتھ افیم کے پائپ بھی پھونکتے تھے۔ ان سب کی باتیں مبہم تھیں۔ وہ علامتوں کے ذریعے باتیں کرتے تھے۔ ان کا پیر ایک چھوٹا سا توتلا سا انگلش کا ماسٹر تھا۔“ تم کو آج تک احساس ہو رہا ہے کہ چھوٹا سا توتلا سا انگلش کا ماسٹر اصل میں تمھارا اپنا روپ تھا۔ اور اب تم ایک مخصوص تجسس کے ساتھ پوچھتے ہو، ”وہ آدمی اصل میں کون تھا؟“ کنول تمھارے اس تجسس سے لطف اندوز ہو کر کہتا ہے، ”وہ ایک شاعر تھا۔ پتا نہیں اس طرح کے لوگ شاعر کہلانے کے لائق ہیں۔ نہیں اس کی نظمیں بکھری علامتوں اور غیر منطقی فقروں کے مغلوب تھیں۔“ کنول کے اس بیان سے تم کو ہنسی آتی ہے، کیونکہ تم ایک عرصے سے ان پرانے علامت پسندوں کا ورثہ سنبھالے آ رہے ہو۔ تم ان لوگوں کی طرح اپنے ذاتی احساسات کے زیور ابہام کی تجوری میں رکھنے کے عادی ہو۔ اس کی کنجی صرف تمھارے پاس ہے۔ پھر تم کنول سے اس بھولے بسرے فرانسیسی شاعر کا نام پوچھتے ہو اور وہ عجیب غروروں کے ساتھ غالباً استیفان ملارمے (Stephane Mallarme) کہتا ہے۔

اس دن ایک کھوج کی شروعات ہوئی ہے: ملارمے کی انگریزی میں مترجمہ نظموں کی کھوج۔ لیکن اس گورے غیر معروف شاعر کی نظمیں پورے سکھر کیا، پورے سندھ میں نہیں ملیں گی اور تم برسوں تک ان کے لیے ترستے رہو گے۔ پھر تمھارے والد صاحب کی ایک بار اور بدلی ہوگی، لاہور میں، اور وہاں جا کر تمھاری پیاس بجھے گی۔

9

لاہور آنے کے بعد ملارمے کی صدا تم تک پہنچی۔ پنجاب پبلک لائبریری میں تم کو ملارمے کی ایک چیز مل گئی۔ تم ان دنوں میں میٹرک کر رہے ہو اور اپنا سارا وقت اسی لائبریری میں گزارتے ہو۔ تمھارے والدین اس دھوکے میں ہیں کہ تم وہاں کے پرسکون ماحول سے فائدہ اٹھا کر پڑھائی کر رہے ہو، لیکن وہاں جا کر تم میٹرک کی کتابوں کو اپنے بستے میں پڑا رہنے دیتے ہو، بنچ کرسی کے پایوں کے پاس۔ تم فزکس، ریاضی اور تاریخ کی خشک اور محدود کتابوں کی جگہ ایک خوشبودار اور جہاں نما کتاب پڑھتے ہو، ساری دنیا کے شاعروں کی منظومات کی ایک ضخیم انتھولوجی۔ چینی، جاپانی، سنسکرت یا فرانسیسی سے بے شمار تراجم اس میں شامل ہیں۔ اس میں ملارمے کی 'L'apres-midi d'un faune' کا ایک ترجمہ بھی موجود ہے۔

تم نے اس نظم کو بیسیوں دفعہ پڑھا، ایک لغت میں نامانوس الفاظ کے معانی ڈھونڈ ڈھونڈ کر، اور جلد ہی تم کو کول کے ساتھ متفق ہونا پڑا۔ ملارمے کی شاعری ناقابلِ فہم ہے، لیکن تم نے اس کے اشکال کے سامنے ہتھیار نہیں ڈالے۔ تم نے اس کی ایک تشریح تلاش کی۔ شارل مورو (Charles Moreaux) کی تشریح تمھارے ہاتھ آئی ہے اور اس کی روشنی میں تم ملارمے کی نظم میں معنویت کے ریزے دیکھنے لگے، لیکن انگریزی کے الفاظ ملارمے کی صدا اور تمھارے کانوں کے درمیان کھڑے ہیں۔ سو تم نے نظم کی پوری تفہیم حاصل کرنے کے لیے اپنی زبان میں اس کا ترجمہ شروع کیا اور آہستہ آہستہ، جب اردو کے مانوس الفاظ انگریزی کے شبدوں کی جگہ لینے لگے، معنویت کے ریزے جزیروں، پھر برِ اعظموں کی وسعت اختیار کرنے لگے اور ملارمے کی خلوت نشیں آواز پنجاب پبلک لائبریری کے بلند ترین سقف تک گونجنے لگی۔

Scanned with CamScanner

اب تمھارا سارا وقت اسی نظم کے جنگل میں گزر رہا ہے۔ اس کے قدیم جنگل میں تمھارا اردو ترجمہ قدم بڑھاتا جا رہا ہے۔ اب ملارمے کی بیشتر علامتیں تمھاری محکوم ہیں، غالباً سب کے اردو نعم البدل نصیب ہوے ہیں۔ لیکن ان ادبی کاوشوں نے میٹرک کی پڑھائی کو بہت نقصان پہنچایا۔ امتحان سر پر آ رہا ہے اور تم نے نصابی کتابیں ایک بار بھی نہیں کھولیں۔ تم یقیناً فیل ہو جاؤ گے، لیکن تمھیں پاس یا فیل ہونے کی فکر نہیں رہی۔ تمھیں آخر میٹرک پاس کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے؟ ملارمے کا ترجمہ تمھارا اصلی امتحان ہے، تمھارا فنی اور ذہنی امتحان، جس میں پاس ہو کر تم ایک جدید عالم بن سکتے ہو۔ لیکن ان کاوشوں میں ایک کمی رہ گئی۔ اب تک تم پر ملارمے کی علامتوں کا فقط مجازی رخ روشن ہوا ہے، حقیقی رخ کا دیدار باقی ہے، اور وہ رخ صرف عشق جیسی ہمہ داں اور توانا قوت کی مدد سے اجاگر ہو سکتا ہے۔

10

شام کا وقت ہے۔ پبلک لائبریری کے گرد و نواح میں درختوں کے سینکڑوں سال پرانے سائے طویل ہونے لگے ہیں۔ پبلک لائبریری کا بھاری دروازہ تمھارے پیچھے مقفل ہو رہا ہے۔ لائبریری کل تک بند رہے گی۔ کل تک تم یہی جہاں نما کتاب اور ملارمے کی نظم کی پناہ سے محروم رہو گے۔ تم کو گھر جانا ہے، اور تم یقیناً گھر جاؤ گے، ذرا سی دربدری کے بعد۔ تم اپنے گھر کا راستہ چھوڑ کر پرانے شہر کی طرف جا رہے ہو۔ تمھارا بستہ تمھارے پہلو میں ناچ رہا ہے۔ وہ تمھارے ساتھ اس آوارہ خرامی سے محظوظ ہو رہا ہے۔ بہت سی سڑکیں تم سے طے ہو رہی ہیں اور تم، ایک خودکار نہ پتلی کی نا دیدہ احتیاط کے ساتھ، لاتعداد راہگیروں کے آگے پیچھے سے گزر رہے ہو۔ سامنے کچھ دکھائی نہیں دے رہا ہے، کیونکہ تمھاری پتلیاں ملارمے کی علامات سے پٹی پڑی ہیں اور تمھارے سب خود بخود "گوالے کا سپنا" کے علامتی اشعار دہرا رہے ہیں:

که جب میں اس نیستاں میں
تلاش نے کی خاطر تھا یکسر
تو کیا اس دور کے سبزے کے اک زریں دھندلکے میں

Scanned with CamScanner

جہاں بیلوں نے اپنے جال پھیلائے ہیں چشمے کے کناروں پر
کسی رندہ سفیدی کی وہاں لہریں ہوئیں پیدا؟

اشعار تمھارے لبوں اور گالوں سے مس ہو کر ایک ٹھنڈی اور مبہم خوشبو چھوڑتے ہوئے ہوا میں گھل مل رہے ہیں اور تم کو نہ جانے کیوں محسوس ہو رہا ہے کہ تمھارا ہر قدم تم کو ایک نادیدہ پریمیکا کے نزدیک لا رہا ہے۔

تم لمحوں کا تھان کھینچ رہے ہو۔ دربدری اتنی جلدی ختم نہیں ہونی چاہیے۔ تم کو اور بھی شعروں کی کشتیاں شام کی موج ہوا کے سپرد کرنی ہیں۔ اس وقت ان اشعار میں منتروں اور شلوکوں کا فسوں ہے۔ دھندلاہٹوں بھری شام ان کو سنتے سنتے دوپہروں کے تپاں سماں میں ڈھل رہی ہے اور ''گوالے کا سپنا'' کی فضا سے پوری طرح ہم آہنگ ہو رہی ہے۔ تمھارا من گھر کی واپسی کے تصور سے ہراساں ہے۔ تمھارے والد صاحب گھر کی دہلیز پر کھڑے ہو کر تم سے پڑھائیوں کا حال چال پوچھیں گے۔ تمھاری والدہ ماجدہ کھانا پروس کر تم کو دعائیں اور شاباشیاں دیں گی۔ تمھیں دونوں سے جھوٹ بولنا ہوگا۔ ان دروغ گوئیوں سے بچنے کے لیے تم اپنی دربدری کو طول دے رہے ہو اور یونیورسٹی گراؤنڈ کا راستہ اختیار کر رہے ہو۔

یونیورسٹی گراؤنڈ میں ہریالی چاروں طرف پھیل چکی ہے اور یہ ہریالی اگربتی کی گدار خوشبو سے معطر ہوئی ہے۔ ایک جشن کچھ دیر پہلے ختم ہوا ہے۔ آج شہر کے بنگالی باشندوں نے اس میدان پر اپنی درگا پوجا منائی ہے۔ مورتیاں، گھنٹیاں اور رتھ رخصت ہو چکے ہیں، لیکن بنگالیوں کا ایک ہجوم ابھی تک میدان پر رکا ہوا ہے، اور سب لوگوں نے متفقہ طور پر آواز مدھم رکھنے کی ٹھان لی ہے۔ لہٰذا ہجوم سے صرف چند آہٹیں اور چہ میگوئیاں بلند ہو رہی ہیں، جنھیں شام کا پھلتا پھولتا اندھیرا باری باری مٹا رہا ہے، اور یہ آوازیں، مٹنے سے پہلے، ایک بے نشان مقام کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔ یہاں ایک ڈھکی چھپی اور پوتر گپھا ہے جس میں ایک دیوی اور ایک دیوداسی ساتھ ساتھ تمھارا انتظار کر رہی ہیں۔ اب تمھیں ان کا درشن کرنے کہاں جانا ہے؟

اور اچانک ہجوم دونیم ہو رہا ہے اور درمیان سے ایک جوڑی نظر آ رہی ہے۔ دو بنگالی لڑکیاں، سرخ پیلی ساڑھیوں میں ملبوس، آپس میں محو گفتار، آہستہ آہستہ سیر کر رہی ہیں اور ان کی بے فکری یہ جتا

رہی ہے کہ ان کا نہ گھر ہے، نہ روزگار، نہ پریوار ہے۔ وہ شاید وہ آتمائیں ہیں، جنھوں نے قفسِ عنصری سے پرواز کرنے کے بعد اس میدان کی سیر کو اپنا ابدی شغل بنا رکھا ہے۔ یا شاید اپنی گپھا سے نکلی ہوئی یہ وہ دیوی اور وہ دیوداسی ہیں جن کی طرف ہجوم کی خفیف اور خفیف آوازوں نے تھوڑی دیر پہلے اشارہ کیا تھا۔ ان کا درشن ہوش رُبا ہے۔ تمھاری آنکھیں، تمھارا من، تمھارا وجود، یکایک ان کے اسیر ہو گئے ہیں، اور تم اس جوڑی کا تعاقب کرنے لگتے ہو۔ دیوی اور دیوداسی، ہجوم سے علیحدہ ہو کر، میدان کے ایک تاریک گوشے کو منور کرنے جا رہی ہیں۔ تم ان سے قدم ملا کر پیچھے پیچھے چل رہے ہو۔ دونوں کے رنگ ڈھنگ بہت دلچسپ ہیں۔ دیوداسی میں ایک غضب [illegible]، دیوی کی نازشوں بھری بہادری ہے۔ وہ سینہ تان کر چلتی ہے اور اس کا جسم ایک جھولے [illegible] کی طرح شاداب ہے۔ ہم آہنگ شباب [illegible] درخت، [illegible] خوشے جس کے نیچے ہیں اور اس کے ہونٹوں کی طلسم مسکراہٹ کا [illegible] سے [illegible] کو ایک [illegible] تسلی دیتی ہے۔ اس کے ساتھ دیوی [illegible] سادہ اور بے رنگ [illegible] شاید اس نے جسم کے [illegible] دھوپ اور بارش جیسی نعمتوں سے محروم رکھا ہے۔ دیوی [illegible] رہ گئی، اس کی رنگت [illegible] مائل ہو گئی۔ اس کا چہرہ [illegible] لیکن وہ [illegible] کی طرح اپنے تقدس کی وجہ سے [illegible] اور اس کی آنکھوں میں ایک [illegible] سے ایک ہی چوٹ کھا کر تمھارا [illegible] دیوی نے اس [illegible] کی بدولت تمھارے دل کے میدان میں اپنے [illegible] کے پرچم سے [illegible] کر دیا ہے۔

دیوی اور دیوداسی [illegible] پر بیٹھ گئی ہیں۔ تم [illegible] تاریکی میں چھپ رہے ہو۔ تم ان لمحوں [illegible] کی طرف لوٹ چلے ہو جہاں چھپ کر تم [illegible] کرتے تھے۔ آج بھی تم چھپے [illegible] کر رہے ہو، لیکن یہاں نہ درخت ہیں، نہ [illegible]، نہ [illegible] نہ کیڑے، اور تمھاری [illegible] آتے ہو [illegible] ایسے [illegible] ہیں جو کہ ایک دوسرے کی [illegible] ہیں۔

دیوی [illegible] میں گفتگو کر رہی ہیں، [illegible] ایک مہک کی طرح چاروں طرف پھیل رہی ہے اور [illegible] تمھارے [illegible] اس حد تک منہمک ہو رہے ہیں [illegible] کی [illegible] معلوم ہوتا ہے۔ [illegible] اور میدان خالی

Scanned with CamScanner

ہوئے ہیں۔ اس دن سپنے کی تمام مخلوق سورگ کی اور سدھار گئی ہے۔ نہ فضا، نہ دھرتی پر ان کا کوئی نشان باقی ہے:

مجھے کچھ غور کرنے دو
کہ وہ دوشیزگانِ نازنیں جن کا بیاں کرتے ہو
فسانہ سازِ احساسات کا نقشِ تمنا تو نہیں دونوں؟

کیا اس پورے واقعے کو فقط ایک دن سپنا سمجھنا چاہیے؟ تمھاری چھٹی حس اس کی حقیقت کی قائل ہے اور، تاکہ اس کی حقیقت پوری طرح سامنے آ جائے، تمھیں دیوی اور دیوداسی کی کوئی یادگار ملنی چاہیے۔ سو تم ان کی بنچ پر جا کر ایک زلف، ایک دھاگے یا ایک سوئی کی تلاش کرنے لگتے ہو، لیکن بنچ اس قسم کی یادگاروں سے خالی ہے۔ اس کی آغوش میں واحد ایک شے، ایک مقدس شے، جھلک رہی ہے: ایک اسکول کی کاپی جس میں جیومیٹری کی کلاس کی تمام تعلیمات شامل ہیں، اور جس کے پہلے ورق پر ایک نام درج ہے — میرا سین — اور ایک ایڈریس، جہاں گم ہونے کی صورت میں یہ کاپی لوٹائی جا سکتی ہے، اور نہ جانے کیوں تمھیں فوراً یقین ہو جاتا ہے کہ یہ کاپی دیوی کی ہے۔ آخر دن سپید رنگ لایا! ایک مضبوط شارہ تمھیں ملا ہے جس کی مدد سے تم ایک دیوی کے چرنوں تک پہنچ پاؤ گے۔ تم اگلے دن میرا سین کے ایڈریس پر حاضر ہونے کی ٹھان لیتے ہو۔ یہ کاپی تمھیں درشن کا ایک اور موقع فراہم کرے گی، اور اگر اس دیوی نے تمھیں پاس آنے نہیں دیا تو تمھیں کیا نقصان ہوگا؟ اس کی دیودا سی بھی ڈھونڈے بغیر مل جائے گی، جس کی ملاقات تمھارا احساسِ محرومی مٹا کر تمھیں صرف احساسِ گناہ سے دوچار کرے گی!

11

اگلے دن تم فجر کی اذان کے فوراً بعد اٹھتے ہو اور کاپی ہاتھ میں لیے، تم تاریک گلیوں سے گزر کر، میرا سین کی مدد سے میرا سین کے گھر جا رہے ہو۔ میرا سین ایک سرکاری کوٹھی میں رہتی ہے۔ تم اس کوٹھی کے سامنے، ایک ادھ کٹے درخت کے اپاہج سائے میں بیٹھ کر، اپنے انتظار کی شروعات کر رہے ہو، اور اچانک ایک مخصوص خوف تمھارے سینے میں سرایت کر جاتا ہے۔ میرا سین سے ملنے کا

Scanned with CamScanner

خوف [illegible] اور آس پاس میں سب چیزیں اس خوف کا پرتو بنتی جا رہی ہیں۔ آسمان میں پرندے ایک ناگوار فضا چھوڑ کر فرار ہو رہے ہیں اور گلی کوچوں میں دودھ لے جانے والے سائیکلوں کے پہیوں سے بار بار ٹکرا کر پسپائی کی منادی کرتے جا رہے ہیں۔ بالا خانوں پر خاکروبوں کے لیے جھاڑو قدیم تفنگوں کی احتیاط کے ساتھ اپنا ہدف کھوجتے جا رہے ہیں اور نالیوں میں محلے کے آوارہ کتے نامعلوم بدروحوں کو دانت دکھاتے جا رہے ہیں۔ پھر کچھ دیر بعد، سین پریوار کے مندر میں سویرے کی پوجا شروع ہو رہی ہے جس کی ہر صدا تمہارے خوف کو توسیع دے رہی ہے۔ سنکھوں کے نوحے ایک انہونی داستان سنا رہے ہیں، بھجنوں کی فریادیں بھگوان کے غضب میں نرمی پیدا کرنے کی رائیگاں سعی میں مصروف ہیں، گھنٹیوں کی التجا میں اپنے کمزور بدنوں سے چیاؤں کا سیلاب روکنے میں کوشاں ہے، [illegible] دیدہ و نادیدہ، گزشتہ اور آئندہ آفت سے بے پروا ہو کر، ساتھ ساتھ چلتی تھیں اور میرا سین کا پاک [illegible] سے تھام لیتے ہو۔ تمہیں بے قیمت [illegible] دنیا کی تمام بددعائیں لے کر، زمیں اور آسمان سے تمام [illegible] سے ٹکرا کر، میرا سین کو یہ کالی واپس دیتی ہے

سات بج گئے۔ ایک تانگے نے زنگ آلود پہیوں سمیت پریوار کے گھر کے سامنے رک رہے ہیں۔ گھر کا دروازہ کھل رہا ہے۔ دروازے پر میرا سین نمودار ہو رہی ہے۔ وہ آج تخیل کی ایک شوخ ساڑھی میں سجی ہوئی ہے جو صبح کی مدھم ہوا میں جھوم رہی ہے۔ کل کی شانت اور سادہ سی میرا سین کل کے جیون میں دفن ہو گئی۔ آج کی میرا سین بے اطمینانی اور رعونت میں اپنی مثال آپ ہے۔ وہ فوراً تانگے میں بیٹھ جاتی ہے، اپنی ساڑھی کا پلو غصے سے اپنے کندھے کے اوپر اچھال دیتی ہے، اور ایک [illegible] آواز میں کوچوان کو تھوڑا دوڑانے کا حکم دیتی ہے۔ ہوا میں کوچوان کا چابک سرسرا رہا ہے، اور [illegible] گھوڑے کو ضرب دے جاتا ہے۔ تانگا چل پڑتا ہے۔ میرا سین رخصت ہو رہی ہے۔ تم وہ کالی واپس دینے کے لیے ایک گھڑی بھی نہیں لی، لیکن تم یہ تماشا ترک کرنے پر آمادہ نہیں ہو۔ تم ایک خالی تانگہ روکتے ہو اور اس پر بیٹھ کر میرا سین کا تعاقب کرنے لگتے ہو۔ میرا سین کی چابک و [illegible] ساڑھی، تانگے پر سوار، سڑک کے موڑ پر پہنچ گئی ہے۔ میرا سین ایک دور افتادہ نقطہ بن گئی ہے جو تمہارے لیے کائنات سے بھی وسیع و عریض ہے، کیونکہ اس نقطے میں تمہاری ساری امنگیں، تمہارا سارا تجسس اور تمہاری ساری ذہنی الجھنیں ایک ساتھ سمٹ آئی ہیں۔

Scanned with CamScanner

میرا سین کے تعاقب میں دو سال گزریں گے۔ تمھاری زندگی اس کی زندگی کی گمشدہ جوتی بنے گی۔ تمھارے شب و روز اس کی قدم بوسی کی جستجو میں صرف ہوں گے۔ تم میرا سین کے ایک انجان اور وفادار سیوک بن کر رہو گے، جس کو اپنی خدمت کی بجا آوری سے نہ اپنے میٹرک کی فکر، نہ اپنے والد صاحب کی نصیحتیں، نہ اپنی ماں کے تانے، نہ اپنی دنیا کے انقلاب، نہ اپنے وطن کے جلوس اور فساد، نہ اپنے علاقے کے سیلاب اور زلزلے باز رکھ پائیں گے۔ کائنات کے تیور تمھارے سامنے بدلتے جائیں گے، لیکن تمھارے دل کی کائنات میں ایک ذرہ بھی نہیں بدلے گا۔ اس کائنات کا مرکز وہی میرا سین رہے گی جس کے درشن تمھاری برہنہ اور بے مقصد زندگی کو ملبوس کر گئے ہیں۔ اس کی ساڑھی کے دیدار سے تمھارا تن من ململ اور حریر نے ڈھانپ لیا ہے۔ اس کے گھر کے نظارے سے تمھارے گرداگرد ایک راحت افزا حصار قائم ہوا ہے اور اس کے گھر کے سامنے کے درخت تلے، تمھارے آس اور امید سے بھرپور انتظار سے تمھاری کوری فراغت ایک روحانی مصروفیت میں ڈھل گئی ہے۔

ان دنوں میں تمھارے خواب غیر معمولی حد تک فحش ہو گئے۔ خوابوں کے دوران تم کو بیک وقت شرم اور لطف محسوس ہوتا ہے۔ خوابوں میں تمھارے محبوب ارادے اچانک اپنے سارے لباس اتار لیتے ہیں اور ایک بے ہودہ سی حرارت تمھاری جلد کے مساموں کو تھپتھپانے لگتی ہے۔ تم بے چینی سے کروٹیں لیتے ہو اور سویرے کا اجالا جب تمھارے تپاں لبوں پر آتا ہے، تمھیں محسوس ہوتا ہے کہ تمھاری چادر تمھارے احتلام کی وجہ سے میلی ہو گئی ہے۔ رات کو میرا سین نے تم کو بہت ہوس انگیز خواب دکھائے۔ وہ تمھاری نیند کے خطے میں قدم رکھتے ہی، اپنا پورا جسم تمھارے سپرد کر کے، تمھاری بانہوں میں ایک دیوانی دیوداسی کی طرح لذت سے چیختی رہی، اور جوں ہی سورج کی گولائی تمھاری کھڑکی میں نظر آنے لگی، وہ فضا میں کافور ہو گئی۔ رات کی غلیظ ہم آغوشیاں ختم ہو گئیں۔ اب تم کو اٹھنا ہے، اپنی میلی چادر دھونا ہے، اور صبح صبح شہر کے ماتعداد نوکروں کی طرح، اپنی ملکہ کی کوٹھی پر جانا ہے۔

میرا سین کا ایک ہی تبرک تمھارے پاس ہے: اس کی جیومیٹری کی کاپی، جو کہ تم ایک لافانی کتاب کی طرح، فال نکالنے کے لیے روزانہ کھولتے ہو۔ کاپی کھولنے سے پہلے تم اس کے سرورق کے کونے چومتے ہو۔ یہ بوسے ایک پارینہ بیعت کی تجدید کرتے ہیں۔ پھر ورق گردانی شروع ہوتی

ب۔ مثلث، مربع اور مدوّر اشکال تمھاری نظر سے گزرتی ہیں: یہ اشکال میر امّن کے کڑے اصولوں کے عکس ہیں۔ ج۔ جا بجا روشنائی کے داغ دکھائی پڑتے ہیں: یہ اس کی سیمابی بوریت کے نشان ہیں۔ اور حاشیوں میں لکیروں کے الجھاوے جمع ہوے ہیں: یہ اس کی خواہشوں کے بے ترتیب ابھار ہیں۔ اس کاپی کے ہر صفحے پر عجیب وغریب علامات پھیلی ہوئی ہیں۔ ان علامتوں کے گرد تمھارا ان تعبیروں کے جالے خودبخود بن رہا ہے۔

ان دو سالوں میں میٹرک ایک پل کے لیے بھی تمھیں متوجہ نہیں کر سکا۔ امتحان کے دن تم نگران اساتذہ کے آگے ایک کورا کاغذ جمع کرنے پر مجبور ہو گئے ہو۔ تم سے ایک سوال بھی حل نہیں ہو سکا۔ تم نے گزشتہ دو سال میں اپنے نصاب کی کتابیں ایک بار بھی نہیں کھولیں۔ تم نے ان دو گزشتہ سالوں کو ایک خواب، ایک دن سپنے کے تعاقب میں گنوایا اور اس بے مقصد تگ و دو کا انجام اب دیکھنے میں آ رہا ہے۔

12

لیکن یہ دو سال پوری طرح رایگاں نہیں گئے۔ ان دو سالوں میں تم اپنے ہندو اسلاف کی طرف مراجعت کر گئے ہو۔ تم نے ان کا حلیہ اور ان کے اوصاف اختیار کیے ہیں۔ سب سے پہلے، تمھاری آواز بدل گئی۔ وہ ایک رشی کی آواز معلوم ہونے لگی۔ اس میں اب ایک گپھا کی گہرائی اور ایک مندر کی گونج ہے۔ تمھارے گیسو دراز سے دراز تر ہو کر، میر امّن کے کافر بالوں کے ہم نسل ہو گئے ہیں۔ بھگوان سیوکوں کی شمشیر نما مونچھیں تمھارے چہرے کو جلال اور رعب بخشتی ہیں۔ مسلمانوں کی فرسودہ شلوار قمیص ماضی کی الگنی پر ٹنگ گئی۔ مندر جانے والوں کا کرتا پاجامہ تمھارے حال اور مستقبل کی نئی پوشاک بن گیا۔ سادھوؤں کے ایک ہار نے تمھارے سینے سے اس تعویذ کو ہٹایا جو کہ تمھاری غریب ماں نے برسوں پہلے تمھارے پاکیزہ بچپن کو الوہی قوتوں کا تحفظ فراہم کرنے کے لیے تمھارے گلے میں ڈالا تھا اور، آخرکار، پھولوں کی ایک لمبی مالا تمھارے دھڑ کو ایک گلزار کا روپ اور سگندھ دینے آئی۔ پھر جب تمھارا بھیس اور تمھارا روپ پوری طرح تبدیل ہوئے، تمھارے نام نے، تمھاری پرانی کایا سے ہار مان کر ہجرت کا فیصلہ کیا اور تم ثناء اللہ سے میراجی بن گئے۔

Scanned with CamScanner

میراجی بن کر تم نے اپنی مسلمان برادری میں خاصی بدنامی حاصل کی۔ محلے میں، سب تم کو ثناءاللہ کے نام سے جانتے ہیں، اور تمھاری شخصیت کی تازہ کایا کلپ نے تمھاری راہ پر چہ میگوئیوں اور معنی خیز نظروں کا ایک بے انت قالین بچھا دیا۔ تمھارے والدین اور تمھارے ہمسائے تم کو حقارت آمیز اور قہر آلود آنکھوں سے دیکھتے ہیں اور اس پنجاب لائبریری میں، جس میں تم میرا سین کی کلاس کے دوران بیٹھتے ہو، اور جس کے رجسٹر میں تمھارا نام اب بھی ثناءاللہ لکھا ہے، پڑھنے والے تم کو دیکھ دیکھ کر ایک دوسرے کو کہنی مارتے ہیں۔ تم یہاں سب کی تضحیک اور سب کے فقروں کا ہدف ہو۔ شام کو، میرا سین کو دور سے رخصت کرنے کے بعد، تم اپنے محلے میں جب واپس آتے ہو تو ہر کھڑکی اور ہر دریچے پر ایک بچہ تمھاری راہ تکتا ہے اور وہ "میم صاحب! میم صاحب!" کے نعرے لگا کر تمھارا استقبال کرتے ہیں۔ اور محلے کی زبان دراز عورتیں، اپنے گھروں کی دہلیز پر کھڑی، تم کو ہر شام اسی انداز میں گھورتی ہیں جس میں وہ دن میں راہ چلتے کھسروں اور ہشیوں کو دیکھتی ہیں۔ یہاں تم صرف ایک عجوبہ ہو، گپوں، کہانیوں اور لطیفوں کی ایک چلتی پھرتی کتاب ہو۔ یہاں تم ثناءاللہ کے سائے سے بچ کے نہیں جا سکتے، لیکن اپنے علاقوں میں ہندو عوام نے تم کو میراجی مانا۔ تم جب سنت نگر، کرشن نگر یا بھگوان پورہ سے گزرتے ہو، ہندوؤں کے سلجھے ہوئے بچے "نمستے سوامی جی" کہہ کر تم کو سلام کرتے ہیں، خدا خوفیے بیے، اپنی دکانوں کے تھڑوں پر براجمان، تم سے ہاتھ جوڑ کر آشیرواد مانگتے ہیں اور ساڑھیاں زیب تن کرنے والی ستی ساوتریاں تمھارا درشن پاتے ہی ایک پاکیزہ مسکراہٹ کے ساتھ سر جھکاتی ہیں۔ ان کی سرخ مانگیں تم کو ان کی لاشروط اطاعت کا یقین دلاتی ہیں۔

کتابوں کے معاملے میں بھی میراجی ثناءاللہ سے بہت مختلف ہے۔ ثناءاللہ دن بھر پنجاب لائبریری میں ملارمے پڑھتا تھا، اور اس کے ساتھ پو (Poe) اور وٹ مین (Whitman) جیسے پراسرار یا علامت پسند شاعروں کو۔ میراجی صرف ہندی اور سنسکرت کی کتابوں کا رسیا ہے۔ کالی داس کی کوتائیں، چنڈی داس کے گیت اور میرابائی کے بھجن اس کے دل میں ہر وقت گونجتے ہیں، اور اس طرح میراجی کی زبان پر ہندی اور سنسکرت کے بے شمار الفاظ چڑھ گئے۔ میراجی کے لب عربی کی گرانی یا فارسی کی سکی کے متحمل نہیں ہو سکتے۔ ان کو اب صرف ہندی اور سنسکرت کا اعتدال راس آتا ہے۔

تم نے اپنے ماضی سے چھٹکارا پا کر میراجی کے روپ میں نیا جنم لیا ہے۔ تمھارے پنڈت

Scanned with CamScanner

آباواجداد کا خون، تمھاری رگوں میں تا حال موجزن، تم کو اس ہندوانہ روپ کو اپنانے کے قابل کر گیا۔ ان پرانے پنڈتوں کا آشیرواد لے کر تم نے چند دنوں میں درجن بھر صدیوں کی خلیج کو پاٹ لیا جو کہ تمھارے مذہب اور ان کے دھرم کے مابین حائل تھیں، اور یہ دھرم دوبارہ قبول کرنے کے بعد، تم ہندی مہاکویوں کے وارث بن گئے ہو۔

تم نے ایک نئی کاپی کا بندوبست کیا۔ اس کے صفحے جلدی ہی ہندی گیتوں سے پُر ہو گئے۔ اب نہ مشرق کا تغزل، نہ مغرب کی علامت پسندی تمھارے قلم کو بھاتے ہیں۔ دونوں انداز تمھاری نظر میں باسی اور بے مصرف ٹھہرے ہیں۔ کلاسیکی اور جدید سانچے دونوں کھوکھلے نظر آنے لگے ہیں۔ صرف ہندی گیت تمھاری پوتر اور ستارہ امنگوں کی ترجمانی کرنے کے قابل ہیں۔ تمھاری جوانی کی کاپی، جس میں جنسی اور علامتی نظموں کا ڈھیر ہے، تم کو پلید لگنے لگی ہے۔ تم نے اس کو بن باس دیا۔ وہ کاپی اب تمھارے گھر کے بڑے کلاک کے اوپر دھول کھا رہی ہے اور ثناء اللہ ڈار کی نظموں کا محض حوالہ تم کو ایک فحش تقصیر کے تذکرے کی طرح ناگوار گزرتا ہے۔

میرا سین تمھارے ہر گیت کی راج رواں ہے۔ وہ تم کو روزانہ ایک نیا گیت لکھنے کی پریرنا دیتی ہے، اور ہر گیت پچھلے سے بہتر ہے۔ کیونکہ ہر گیت کے ساتھ میرا سین کے عرش تک ایک نیا زینہ طے ہوا ہے۔ گیت بلند سے بلندتر ہو رہے ہیں اور میرا سین، ہر گیت کی تحریر کے بعد، فرش کے مزید نزدیک آ رہی ہے۔ عین وقت پر، وہ بالکل قریب آ کر تمھاری رانوں پر ایک ہاتھ پھیرتی ہے۔ دوسرا ہاتھ تمھارے قلم کی رہنمائی کر رہا ہے۔ اس کے رسیلے ہونٹ تمھارے الفاظ کو چاٹ رہے ہیں، اس کی نم سی چھاتیاں تمھاری تشبیہات سے مس ہو رہی ہیں، اس کی تانبے کی ٹانگیں تمھاری بحر سے الجھ رہی ہیں اور اس کی شعلہ زن سانسیں تمھارے ٹمٹماتے تخیل کو نئی سے نئی لو دے رہی ہیں، اور یہ ستم ظریفی دیکھو کہ میرا کے لیے سینکڑوں گیت لکھنے کے بعد بھی، تم اس کے نام ایک رقعے میں چار ضروری الفاظ لکھنے کی جرأت نہیں کر سکے۔

میرا سین کی خدمت میں ایک اور سال کا اضافہ ہوا ہے۔ اب تم اس کی زندگی کے ہر کردار اور منظر سے واقف ہو۔ سب تمھارے دیکھے بھالے ہیں۔ اس کا گھر، اس کا کالج، اس کے اساتذہ اور اس کی سہیلیاں۔ اس کے نوکر، اس کی ساڑھیاں، اس کی جوتیاں، اس کی چوڑیاں۔ اس کے مزاج کی

گستاخیاں، اس کے اندیشوں کی آندھیاں، اس کی سنجیدگی کی زیادتیاں۔ اس کی پسندیدہ دکانیں اور اس کے من پر یہ مندر۔ سب تمھارے دیکھے بھالے ہیں، سب کی تصویریں تمھارے ذہن میں محفوظ ہیں، لیکن تمھیں میرا سین کی تصویر کی اشد ضرورت ہے۔ اب تک اس کا درشن اس کی موجودگی کا محتاج رہا، ایک کاغذی تصویر اس درشن کو کل وقتی اور دوامی بنائے گی۔ اور آخر کار ایشور نے تمھاری سن لی۔ اس نے اچانک تم کو ایک تصویر فراہم کر دی، پنجاب پبلک لائبریری میں، ایک پرانے اخبار کے اوراق منتشر ہیں۔ ایک ورق پر کنیرڈ کالج کی طالبات کی ایک گروپ پکچر چھپی ہے، کسی تقریب کے موقعے پر اتاری ہوئی۔ طالبات کے چہروں کی دھندلی صفوں سے میرا سین کا رخ تاباں ابھرا ہوا ہے۔ تم نے فوراً یہ تصویر تراش کر اپنے کرتے کی اندرونی جیب میں چھپا لی، تمھارے دل کے بالکل پاس۔ میرا سین کی تصویر دھندلی تھی اور یہ دھندلاہٹ تصویر کی چوکھٹ سے نکل کر گرد و گرد پھیل گئی۔ تمھارا لاچار دل چھ مہینے تک اس سکون نواز دھندلاہٹ سے فیض اٹھائے گا۔ تم چھ مہینے تک اپنا یہ کرتا پہنے رہو گے اور آہستہ آہستہ تمھارے پسینے کی خفیہ رنجشیں اس کے ایک ایک دھاگے کو کرید لیں گی۔ تمھارا کرتا آہستہ آہستہ تار تار ہو جائے گا، لیکن تمھارا دل تمھیں اس کو نہ سلوانے، نہ، تارنے دے گا۔ اس کی حرکتوں کا محرک آخر کرتے میں چھپی ہوئی وہ تصویر ہے۔ پھر ایک دن، جب کرتے کا ریزہ ریزہ ہوتا تم سے دیکھا نہیں جائے گا، جب تمھاری شامہ اس کی بدبو کی تاب نہیں لا سکے گی، تم پر یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہو گی کہ اگر تم نے میرا سین سے بات کرنے کی ہمت نہیں کی تمھاری زندگی اس درماندہ کرتے کی مانند گل سڑ کر ریزہ ریزہ ہو جائے گی۔ اب میرا سین کا تعاقب عبث ہے۔ اب وہ عہد و پیماں جو تم نے اس کے تصور کے ساتھ کیے، منسوخ ہو گئے۔ اب اس سے تم کو، اپنے تن من کی حدود کو پھلانگ کر، جلد از جلد ملنا ہے۔

اور ایک دن، تم ایک نیا کرتا خریدتے ہو۔ اس میں ایک اندرونی جیب سلواتے ہو اور اس جیب میں بصد احتیاط اپنی متبرک تصویر منتقل کر کے میرا سین سے ملاقات کو جاتے ہو۔ تم نے ملاقات کے لیے ساری تیاریاں کی ہیں۔ تم نے ایک مقام اور ایک وقت طے کیا ہے۔ انارکلی چوک ملاقات کا مقام ہے، جہاں سے مندر جاتے ہوئے میرا سین روزانہ گزرتی ہے۔ شام کے سات بجے ملاقات کا وقت ہے۔ اس وقت، عام طور پر، میرا سین، دل میں ہزاروں شفاف اور نازک احساسات لیے، ایک

آخری پوجا سے پہلے اپنے من پسند مندر کا رخ کرتی ہے۔ تم اس مدھر ملاقات کے لیے پوری طرح تیار ہوئے ہو۔ تم نے اپنے آپ کو میراسین کے قابل بنایا، اپنا روائی کرتا اتار کے ایک نیا کرتا پہنا، اپنے سینے پر تازہ پھولوں کی ایک مالا آویزاں کی، اپنی گردن کو عطر کے ٹھنڈے قطروں سے مہکایا اور اپنے دل کو تسلی دی، تاکہ اس کی ہموار سطح پر ڈھلتے سورج کی آخری لو چمک سکے۔

لیکن آج جب سورج انارکلی چوک پر ڈھلنے لگا ہے، تمھیں احساس ہوا کہ یہ جگہ مناسب نہیں ہے۔ شانتی اور خلوت کہاں نصیب ہوں گی اس جدید چڑیا گھر میں؟ چوک میں دوڑتے کودتے گھوڑے کاروں کے ہارن کی آواز میں جھنجھناتے ہیں، اس جھنجھناہٹ کا جواب ریڈیو سیٹوں میں مقید بیبیاں مہیا کر دیتی ہیں۔ فون اس کی بھنک پا کر کتوں کی طرح بھونکتے ہیں، اور ایک دور دراز کی دکان سے ایک گراموفون میں بند پرندہ، اس شور شرابے سے غافل اور بے نیاز، چہچہاتا جا رہا ہے۔ آج پرندہ ایک رنگ نامفرح پیش کر رہا ہے، جس کی لے میں تانبے کی کھنک اور مشینوں کی گڑگڑاہٹ ایک دوسرے سے واصل ہوتی ہیں۔ یہ چڑیا گھر پہلی ملاقات کے راز و نیاز کے لیے واقعی ناموزوں ہے، لیکن یہ پہلی ملاقات آئندہ پر ٹالی نہیں جا سکتی ہے۔ میراسین انارکلی کی حدود میں درشن دینے لگی ہے۔ اس کے تن پر ایک نارنجی رنگ کی ساڑھی پھڑک رہی ہے۔ اس کے ہاتھ میں رنگ برنگے پرساد کا ایک ڈبا چمک رہا ہے۔ وہ قریب سے قریب آ رہی ہے، اور جب وہ پوری طرح تمھاری آواز کی زد میں آ چکی ہے، تم اس کے مد مقابل آ کر اس سے مخاطب ہوتے ہو اور تم اس وقت، اپنے کسی حرف، کسی لفظ، کسی جملے کے لیے ذمے دار نہیں ہو۔

تم نے ایک تحکمانہ لہجے میں کہا، ''میں نے آپ سے بات کرنی ہے۔'' تمھارے شرمیلے ہونٹ ایک پل کے لیے توصد کر کے ہل گئے لیکن میرا کے بھینچے ہوئے ہٹ دھرم ہونٹ ایک پل بھی جنبش میں آنے سے رہے۔ میرا ایک بے صوت خشم آگیں پتلی ہے۔ اس کا حسن تمھارا محکوم ہونے سے انکاری ہے۔ اس کا تن بے حس اور نارسا ہے اور اس کی آنکھیں تمھیں بھسم کرنے پر پوری طرح آمادہ ہیں۔ اس کے سارے وجود نے ایک غضب ناک سکوت اختیار کیا۔ میرا سے ایک لفظ کی بھی امید کرنا عبث ہے۔ پتھر کے مجسمے نہ کلام، نہ اشارہ کرتے ہیں، اور اب اس کی آنکھیں تم سے ہٹ کر مندر کے راستے کی طرف نگراں ہوئی ہیں اور ان آنکھوں کی ایما پر میرا کا سارا وجود کوچ کر گیا۔ انارکلی

Scanned with CamScanner

کی دیواروں کی اینٹ اینٹ اور سڑکوں کا پتھر پتھر تمھاری محزوں ہزیمت پر ہنس پڑے۔ میراسین کا پیکر خاکی یک لخت غائب ہو گیا، ایک سراغ چھوڑے بغیر۔ اور اچانک ایک کباڑیے کی گدھا گاڑی تمھارے سامنے سے گزرنے لگی جو انت شنت سے لدی ہوئی ہے اور تم کو احساس ہوا کہ اب ان چیزوں کی طرح تمھارے شب و روز اس سنسار میں بے مصرف ہیں۔ پھر ایک گراموفون کی خوش الحان چڑیا ایک راگ چھیڑ گئی — راگ جے جے ونتی — اور یک نامعلوم اشارہ پا کر کباڑیے کی گدھا گاڑی سے ایک مدوّری شے گر پڑی، جو کہ سڑک پر پھسل پھسل کر تمھارے پاؤں تک آ گئی۔ تم نے اس کو اٹھایا۔ وہ ایک لوہے کا گولہ تھا۔

میراسین رخصت ہوتے ہوئے ایک راگ اور ایک گولہ تمھارے حوالے کر گئی۔ یہ رنجیدہ راگ اس کی فرقت اور تمھاری تذلیل کا نوحہ ہے۔ یہ آہنی گولہ تمھاری مجبوری کی علامت ہے۔ تمھارے بدنیت ستاروں نے اس گولے کو ایک غیر مرئی زنجیر کے ذریعے تمھارے پیر سے جوڑا ہوا ہے اور تم کو ہر وقت اس کو یک ہاتھ سے تھامنا پڑتا ہے، اپنے قدموں کو اس کے اذیت ناک بوجھ سے بچانے کے لیے۔

13

لو آج تمھیں میں نے اپنے غمگیں دل سے رخصت دے دی
اور خانۂ دل کے دروازے پر یہ لکھا: 'میں بھول گیا'
گر آئے کوئی اور پوچھے: 'کیا میرا رہتی ہے یہاں پر؟'
میں کہہ دوں گا: 'کیا کہتا ہے؟ میں بات نہیں سمجھا تیری'

تم نے یہ بند میراسین کی ناکام ملاقات کے چند گھنٹوں بعد لکھا ہے۔ تم گھر واپس آئے تھے، عاجز اور ناامید ہو کر، شرم کا ایک پہاڑ سر پر اٹھائے ہوئے، ان قدیم سڑکوں سے گزرتے ہوئے جن میں رات کی مضمحل روشنائی پھیلتی جا رہی تھی، اور جوں ہی تم گھر میں داخل ہوئے، تمھاری ماں نے میز پر تمھارا کھانا پروسا۔ تم جیسے آوارہ بگڑے ہوئے بیٹے کا پیٹ بھرنا اس کا اخلاقی فرض تھا، جیسے کہ معذور یا نابینا بھکاریوں کو سکوں کی خیرات دینا۔ اس نے کریلے بنائے تھے، اور یہ غذا اس کی خاموش

Scanned with CamScanner

شکایتوں کی طرح گزر رہی تھی۔ تمھارے والد صاحب، تمھاری آہٹ پاتے ہی، خود کو اپنے کمرے میں نظر بند کر لیتے تھے۔ وہ پچھلے کئی ہفتوں سے تم سے بے حد خفا تھے۔ میٹرک کے امتحان میں ناکام ہو کر تم نے ان کی ناک کاٹ دی تھی۔ پھر تمھاری ماں کے اصرار پر انھوں نے تم کو سدھار کا ایک موقع دینے کی ٹھان لی تھی اور ایک دوست کے مطب میں ہومیو پیتھک کی تربیت لینے بھیجا تھا۔ وہاں بھی تم نے ان کی عزت مٹی میں ملائی۔ مطب سے وقت بے وقت ناغہ کر کے تم سارا دن میرا سین کا تعاقب کرتے رہے۔ تمھارے والد صاحب اس وقت سے تم سے آنکھیں ملانا بھی پسند نہیں کرتے تھے۔ کریلے تمھارے منھ کو طعنوں اور تہمتوں سے بھر رہے تھے اور تم نادم اور خاموش ہو کر ہر نوالے کی تلخی سہ اندھیرے سے چھپا کر بھگت رہے تھے۔ تمھارے والدین تم کو اگلی تنبیہ کھلاتے اور ... رہے تھے، اور تم ان کا احساس دلانے کے لیے اپنی چلبلی حرکتوں سے سرعام اپنے خاندان کی شان پر دھبہ لگا رہے تھے، اور حد یہ تھی کہ تمھاری دیوانگی میں ایک ایسی عورت سے تمھارا ازلی عشق کارفرما تھا جو کہ تم پر ایک نگاہ ڈالنے کو بھی راضی نہیں تھی۔

کچھ دیر بعد، جب گھر کے تمام فانوس گل ہوئے اور تمام نفوس سو گئے، جب رات نے اپنا عروج پایا اور سکوت اپنی معراج پر پہنچا، تم اپنی کاپی لے کر گھر کے صحن میں بیٹھ گئے اور آسمان کے سیمابی تاروں اور سیاروں سے لو لگایا تھا، پھر لکھا:

لو آج تمھیں میں نے اپنے تخیّل سے رخصت دے دی

یہ اس شب تمھارے آخری الفاظ۔ تم نے ان الفاظ کے ساتھ میرا کی خدمت کو ہمیشہ کے لیے خیرباد کہا، لیکن اس کا سحر باقی تھا، جو تم پر بدستور طاری تھا اور یہ سحر ساحرہ کی تصویر کو پلید اور مسخ کرنے سے ہی ٹوٹ سکتا تھا۔

تم اپنے غسل خانے میں داخل ہو رہے ہو۔ ایک طاقچے میں ایک شمع فروزاں ہے جس کی روشنی میں غسل خانے کا سوراخ اپنے متعفن منھ کا مظاہرہ کر رہا ہے۔ تم اپنے پاجامے کی ڈوری کھولتے ہو۔ اپنی کمان ایک ہاتھ سے پکڑتے ہو، اور دوسرے ہاتھ سے میرا سین کی اخباری تصویر تھامتے ہو۔ پھر تم آنکھیں بند کر لیتے ہو۔ میرا سین کا ایک جیتا جاگتا متنفس ہیولا ان آنکھوں کے پیچھے محفوظ ہے۔ میرا سین تمھارے تصور میں بے لباس ہوتی ہے۔ اس کی ساڑھی، اس کا بلاؤز اور اس کا پیٹی کوٹ

Scanned with CamScanner

غسل خانے کے غلیظ فرش پر بکھرے پڑے ہیں۔ وہ گھٹنوں کے بل بیٹھی ہے۔ اس کی کھلی زلفوں کی لٹیں اس کے شانوں، بازوؤں اور کمر پر بے حیائی سے منڈلا رہی ہیں، اس کے چھوٹے پستان دو مسکین دریوزہ گروں کی طرح اپنے کشکول تھامے ہوئے ہیں، اس کی لاغر رانیں اس کے لاچار دھڑ کے بوجھ تلے کانپ رہی ہیں، اور ان مفلس اور لرزاں اعضا کے بیچ فقط اس کی چوڑیاں شان اور تمکنت کی حامل دکھتی ہیں۔ میرا سین نے اپنے سارے کپڑے اتارے، لیکن اس نے نہ جانے کیوں اپنی چوڑیاں کلائیوں میں رہنے دیں، اور ان چوڑیوں کی چمک اس کی عریانی کو مزید روشن کرتی ہے۔ چوڑیاں ہاتھوں کی جنبشوں کی وجہ سے کھنک رہی ہیں۔ میرا سین نے اپنے شریف ہاتھوں سے، ایک دیوی کی امحدودشفقت کے ساتھ، تمھاری مخش ناگن کو پکڑا ہے، اور اس کو جھٹکے، دھچکے، ٹھوکریں اور ضربیں دے کر قابو میں لا رہی ہے، اور تمھیں محسوس ہونے لگتا ہے کہ یہ غلیظ غسلخانہ دراصل ایک پاک اور قدیم مندر ہے جس کی گھنٹیاں یہ مسلسل بجنے والی چوڑیاں ہیں اور جس کی سیوکا میرا سین ہے، اور اس سیوکا کے تابعدار اور فرض شناس ہاتھ تم کو سماوی لذتوں سے ہمکنار کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔

لذتیں نزدیک سے نزدیک تر ہو رہی ہیں۔ ان لذتوں سے تاراج ہونے سے پہلے ایک آخری بار ہوش کی آنکھیں کھولنا ضروری ہے۔ تم آنکھیں کھولتے ہو۔ سامنے طاقچے میں جھکی ماندی شمع اپنی آخری لو دے رہی ہے اور برابر کی دیوار پر تمھارا سایہ کلبلا رہا ہے۔ یہ سایہ، اس وقت، ایک دم دار مخلوق کا پرتو معلوم ہو رہا ہے۔ پھر اچانک لذتیں تمھاری رگوں میں پورے جوش و خروش کے ساتھ بہنے لگ جاتی ہیں اور ان کا ریلا تمھارے کمزور دل سے گزر کر اس کو بے تحاشا دھڑکنے کی سزا دیتا ہے۔ اوپر تمھارے منھ سے ایک نفس بھری آہ رواں ہو رہی ہے، نیچے تمھاری ناگن اپنا زہر میرا سین کی تصویر پر اگل رہی ہے، اور اس زہر کا ہر قطرہ اس تصویر کے سیاہ سفید رومانی حسن کو مٹانے میں کوشاں ہے۔

اگلے دن، تم اپنے گھر سے رخصت ہو کر، اپنی پرانی روایتیں تازہ کرنے کے لیے پنجاب پبلک لائبریری کی راہ لیتے ہو۔ میرا سین کے گھر کا راستہ تمھارے دل و دماغ سے زائل ہوا ہے۔ اب پنجاب پبلک لائبریری میں جا کر تم کو، پہلے کی طرح، یورپ کی الجھی ہوئی شاعری سے اکڑوں بھڑ بیٹھنا ہے۔

Scanned with CamScanner

14

پنجاب پبلک لائبریری میں تم تین سال پہلے کے اپنے محبوب شعرا سے دوبارہ بغل گیر ہوتے ہو۔ ملارمے، وٹمین اور پو پہلے سے تمھارے ساتھی ہیں۔ اب تم ان کی صف پھاند کر دوسرے شعرا کے حلقے میں آ جاتے ہو۔ پشکن، ورلین، ہائنے اور ہولڈرلن جلدی ہی تمھارے رہبر بن جاتے ہیں، اور نئے رہبروں کی تلاش میں تم چند مہینے بعد یورپ سے کوچ کر کے چین اور جاپان کے ساحلوں تک پہنچ جاتے ہو۔ کنفیوشس اور لی پو کے روشن قول اور گیتاؤں کے چمکتے بول تمھارے ذہن سے ہندوؤں کے آداب کی رٹی رٹائی پکاریوں کو مٹا دیتے ہیں، اور ہر رہبر کی خدمت میں حاضر ہونے کے بعد تم ان کے الفاظ کو اردو میں منتقل کر لیتے ہو۔ اس طرح سینکڑوں کے حساب سے تمھارے اجنبی رہبروں کے الفاظ تمھاری کاپیوں میں پسے ہوئے مسالے کی طرح جمع ہو جاتے ہیں۔ پھر اس شغل سے تنگ آ کر تم ایک نئی تلاش کا آغاز کرتے ہو — اپنے اندرون کے اتھاہ کونوں کی تلاش

ڈاکٹر فرائڈ اس کی تلاش میں تمھارا خضر ہے۔ اس کی کتابوں کے انگریزی ترجمے پڑھ کر تمھاری دروں بینی مکمل ہو جاتی ہے۔ تحلیل نفسی کا سہارا لے کر تم خود کو ٹٹولتے ہو اور ٹٹولتے ٹٹولتے تم اپنے اندرون کے اتھاہ میں جھانکنے میں کامیاب ہوتے ہو، جہاں ایک بے چہرہ سلطان، نفسیاتی الجھنوں کے محافظ دستوں کو اپنے اردگرد تعینات کر کے، تمھاری بھولی بسری نارسائیوں کے انبار پہ متمکن ہوا ہے۔ اس کے فرمانوں سے تمھارا تخیل بانجھ یا زرخیز ہو جاتا ہے۔ اس کا ایک اشارہ تمھاری طبیعت کو چشم زدن میں فرحاں یا ملول کرنے کے لیے کافی ہے۔ اس پر اسرار سلطان کو ڈاکٹر فرائڈ مافوق الشعور کے نام سے پکارتا ہے اور The Defeat of Charles Baudelaire کا مطالعہ اس کے اختیارات کی وسعت ناپنے میں ممد ثابت ہوا ہے۔ اس تحلیل نفسی کی کتاب میں تمھارے ایک ایسے نابغۂ روزگار، تشکک زدہ اور آتش فشاں پیشرو کے مافوق الشعور کا تجزیہ کیا گیا جس کی شخصیت تم سے مشابہ ہے۔ تمھاری طرح، جناب شارل بودلیر نے اپنی عمر کے بیشتر ایام حقیقت سے بچ کر تخیل کی خفیہ پناہ گاہوں میں گزارے۔ تمھاری طرح، اس نے برسوں تک ایک سیہ رنگت عورت کی خدمت کی۔ تمھاری طرح، وہ اپنا لباس، رہائش اور رہن سہن بدلنے میں عار محسوس

Scanned with CamScanner

نہیں کرتا تھا۔ تمھاری طرح، وہ سخت نفسیاتی الجھنوں سے دوچار تھا۔ تمھاری طرح، وہ پوری زندگی دور افتادہ ساحلوں کے فراق میں رہا۔ تمھاری طرح، اس نے ترجمے کیے اور فحش نظمیں لکھیں۔ تم شارل بودلیر کے کشمیری نژاد ہم زاد ہو۔ اس شاعر سے پوری طرح مماثل اور واصل ہونے کی تمھیں شدید خواہش ہے۔ اس خواہش اور اس کی تکمیل میں تمھارا مشرقی ماحول اور غیر روادار خاندان، دونوں حائل ہیں، سو تم کو دونوں سے الگ ہونا پڑے گا اور الگ ہو کر اپنی کفالت خود کرنی پڑے گی، اور اس مقصد کے لیے، تمھیں، لازماً، اپنے اکلوتے آلۂ کار کو، اس بے ہودہ اور ضرر رساں قلم کو، اپنا ذریعۂ معاش بنانا ہوگا۔

تم نے اپنے تمام گیت اور ترجمے ایک فائل میں یکجا کیے اور ان کو لے کر اپنے پرانے ہم جماعتوں کے پاس گئے۔ ان سب لڑکوں نے عملی زندگی کے مصروف خیابانوں میں قدم رکھا تھا۔ سب شادی شدہ تھے، سب برسرِ روزگار۔ ان سب پولیس اور ریلوے کے ملازموں کی کامیابی تم کو شرمندہ کر رہی تھی، لیکن تم نے ان کو اپنی تصنیفات پڑھوانے کی جسارت کی اور سب ان کو پڑھ کر دنگ رہ گئے۔ سب ہی نے تمھیں اب تک ایک رائیگاں سودائی سمجھا تھا۔ ان کو اچانک احساس ہوا کہ تم ان سے زیادہ علم اور بصیرت رکھتے ہو۔ ان میں سے ایک ہم جماعت نے ادبی دنیا کے مدیر سے تمھاری سفارش کی۔ مدیر ایک عرصے سے ایک اداریہ نویس کی تلاش میں تھا۔ اس نے تم کو انٹرویو کے لیے اپنے دفتر میں بلایا۔ تم نے اس کو اپنی تصنیفات پڑھائیں۔ مدیر دو چار نظمیں اور ترجمے پڑھ کر تمھارے جوہر کا قائل ہو گیا۔ تمھارے خیالات اتنے باریک اور انوکھے تھے، تمھارا اسلوب اتنا سلیس اور رواں تھا۔ وہ تمھیں اداریے لکھنے کی نوکری دینے پر تیار ہو گیا۔ سو تم، شارل بودلیر کی طرح، ایک اداریہ نویس بن گئے۔ تیس روپے تنخواہ مقرر ہوئی۔ اتنے پیسوں میں ہر طرح کی عیاشیاں ممکن تھیں۔ شراب، بھنگ اور رنڈیاں آخر تمھاری دسترس میں آ گئیں۔ رنڈیاں خاص کر تمھیں درکار تھیں۔ ان کے گوشت، ان کے کولھوں، ان کے پستانوں اور رانوں میں میراسین کی زہریلی یاد کا تریاق پنہاں تھا۔ تمھیں یاد ہے نا؟ کئی سال پہلے تم نے، میراسین کا پسا درش دیکھنے کے بعد، قسم کھائی تھی کہ اس دیوی سے مات کھانے کی صورت میں تم جلد از جلد ایک دیوداسی سے رجوع کرو گے؟

لیکن، شارل بودلیر کا بہروپ بھرنے والے، تم عیاشیوں میں بے حد اناڑی ہو۔ رنڈیاں تو

Scanned with CamScanner

دور، شراب بھی تمھارے لیے ایک نامانوس چیز ہے۔ سو، منزل بہ منزل بڑھنا چاہیے، اور سب سے پہلے شراب کا نیا نیا لطف اٹھانا چاہیے۔

15

بہت دنوں تک شراب نوشی تمھاری واحد عیاشی رہے گی اور اس میں تم پوری مہارت حاصل کرو گے۔ تم ہر شام ادبی دنیا کے دفتر سے نکل کر بھولا رام کے ٹھیکے کی طرف جاتے ہو اور وہاں، ایک روکھے تھڑے پر بیٹھ کر ٹھنڈی بیئر کی کم از کم پانچ بوتلیں خالی کرتے ہو۔ پھر کچھ گھنٹے بعد، جب تم نشے میں تھڑے سے اٹھ جاتے ہو، تم دریائے راوی کی طرف کوچ کر جاتے ہو۔ سب دریا پر صدیوں سے ایک فیاض اور آگہی گھاس اُگ رہی ہے، جس کی کول ڈنڈیاں مست سوہنیوں کے جھکنے سے ٹوٹنے والے جسموں کو سہلانے کی عادی ہیں۔ تم سب دریا پر لڑھک جاتے ہو۔ راوی کا گدلا پانی تم کو اپنی لوریاں سناتا ہے۔ ایک بوجھل نیند تمھاری آنکھوں پر چھا جاتی ہے۔ تمھیں دو چار بار قے آتی ہے، لیکن تمھارا جسد کروٹ لینے سے معذور ہے۔ قے تمھارے منھ میں جم جاتی ہے اور تمھاری روح کو ان تاریکیوں سے نہ ضرر، نہ گزند تک پہنچتا ہے، کیونکہ وہ ان لمحوں میں تمھارے جسد کو چھوڑ کر پرواز آزما ہے۔

پرواز بھی ہے۔ مراحل کئی ہیں۔ تمھاری روح تھک ہار کر، کہیں نہ کہیں، زمین پر اتر جاتی ہے اور یوں تم پنجاب کے کسی کھیت میں، راجستھان کے کسی قلعے میں، فتح پور کے خرابوں میں، یا وارانسی کے گھاٹوں پر گھومتے ہو۔ پھر پرواز دوبارہ شروع ہوتی ہے، اور تم راوی کے کنارے لوٹ کر میراجی کے جسم میں ایک دوبار جاگ جاتے ہو۔

ایک رات جب کسی شرارتی راہ چلتے نے تمھیں نشے میں دیکھ کر بھنگ پلائی تھی، تم سب دریا سے اڑ کر اپنی پرواز میں بہت آگے گئے تھے۔ نیند کے سیمرغ نے تمھیں اپنے پروبال پر بٹھا کر کلکتہ شہر تک پہنچایا تھا۔ سیمرغ نے تم کو یہاں اتارا، میرا سین کے آبا و اجداد کے اس شہر میں، اور تم نے یہاں پوری رات گزاری۔ رات بہت ویران تھی۔ شہر مکینوں سے خالی تھا۔ سڑکیں ندارد تھیں۔ صرف ایک سیاہ راہ دکھائی پڑتی تھی جس پر چلتے وقت تم محسوس کر رہے تھے کہ تمھارا ہر قدم تمھاری مجبوری پر ہنس رہا ہے۔ راہ کے دونوں طرف مکانوں کے دو بے مہر سلسلے تھے۔ سب در، سب دریچے بند

Scanned with CamScanner

تھے۔ پھر اچانک، ایک دروازہ کھلا، ایک دہلیز نمودار ہوئی جس کے پیچھے ایک پراسراری بیٹھک تھی۔ اس بیٹھک پر ایک گہری دھند چھائی ہوئی تھی۔ بنگالی کے کچھ تیز تیز فقرے اس دھند کو چیر کر باری باری غائب ہو رہے تھے۔ کسی نادیدہ گوشے میں ایک گراموفون بج رہا تھا۔ راگ جے جے ونتی کا توا لگا ہوا تھا۔ پھر بنگالی کے فقرے معدوم ہو گئے، دھند کا پردہ ہٹ گیا، اور پندرہ کالی پیلی اور گوری رنڈیاں اس بیٹھک میں جلوہ گر ہوئیں۔ وہ ایک ہی صوفے پر بیٹھ کر، ٹانگوں پر ٹانگیں جما کر، کنٹوری سی شکلیں بناتے ہوئے، اپنے سگریٹوں سے دھوئیں کے چھلے پھونکتے ہوئے، اپنے شرابی اور آوارہ گاہکوں کا انتظار کر رہی تھیں۔ سب ساڑھیوں میں ملبوس تھیں لیکن ان کے سینوں پر بلاؤز نہیں تھے۔ ساڑھی کے آر پار چھاتیوں کے سوگوار بوجھ، پیٹ کے نالاں شکن اور ناف کی جمائیاں لینے والی پیالیاں نظر آ رہی تھیں۔ تم نے ایک گوری سی رنڈی کا انتخاب کیا۔ وہ تمھارا ہاتھ تھام کر تمھیں اپنے چکلے میں لے گئی۔ وہاں وہ، بتی بجھانے کی زحمت سے گریزاں ہو کر، ننگے ننگے قمقموں کی کٹھن روشنی میں، اپنے کپڑے اتارنے لگی اور جب وہ بے لباس ہو کر تمھارے پاس آئی تم نے اس کے سفید بازوؤں کا گوشت ٹٹولا، ان کی اصلیت کی تصدیق کرنے کے لیے۔ یہ رنڈی واقعی گوشت پوست کی تھی۔ وہ اپنے چکلے کے بستر پر دراز ہوئی۔ اس کا مرمریں بدن دودھ کی ایک ندی معلوم ہو رہا تھا اور تم محسوس کر رہے تھے کہ اس ندی کے خالی دیدار سے تمھیں کچھ نہیں حاصل ہوتا تھا۔ ایک خنجر تمھاری شلوار میں تن گیا تھا۔ اس کی نیت نیک نہیں تھی، لہٰذا وہ اس گوری رنڈی کی باریک جلد میں اس طور کھب گیا کہ خون کا ایک چشمہ یکدم پھوٹ پڑا:

اور اس طرح دل کی گہری خلوت میں ایسی آشائیں کروٹیں لیں
کہ ایک خنجر
اتاروں میں چھپا چھپا کر
سفید مرمر سے مخملیں جسم کی رگوں میں
اور ایک بے بس حسین پیکر
مچل مچل کر تڑپ رہا ہو
مری نگاہوں کے دائرے میں

یہ خونی چشمہ اس محکوم اور ذلیل رنڈی کا انتقام تھا۔ خارش اور تپش دونوں اس کے بہاؤ میں شریک تھے۔ اس رنڈی کے بطن میں شاید تیزاب کا ایک تالاب تھا، جس میں آگے جا کر خون ضم ہونے آتا تھا۔ آتشک کے جراثیم شاید اس تالاب کی مچھلیاں تھے۔ خیر، اب دیر ہو گئی تھی۔ تم اس رنڈی کے خونی چشمے میں تیر کر فارغ ہو گئے تھے۔ تم نے جلدی جلدی اپنی شلوار کا ازار بند باندھا، بستر پر دو چار نوٹ پھینکے، اور تم چل دیے۔ تمھیں پرندوں کے جاگنے سے پہلے اڑ کر کلکتے سے راوی کے کنارے واپس جانا تھا۔ باہر، خیابان میں، تمھاری مڈبھیڑ ایک تیز قدم چلنے والے نرالے حضرت سے ہوئی۔ یہ حضرت سنجیدہ تھے۔ ان کے ہاتھ میں ایک بے مصرف چھتری تھی۔ ان کے بال گلابی رنگ کے تھے۔ ان کی پیشانی پر پریشانی کی شکنیں تھیں۔ تم نے ان حضرت کی تصویر پہلے ہی کسی کتاب میں دیکھی تھی۔ یہ شارل بودلیئر تھے جس کا جہاز ایک ہفتہ پہلے ہندوستان کے مشرقی ساحل پر لنگر انداز ہوا تھا۔ ایک ہفتے سے وہ کلکتے کے قہوہ خانوں اور قحبہ خانوں کا چکر لگا رہا تھا اور وہ تیز قدموں سے اس رنڈی کے پاس جا رہا تھا جس کے چنگل سے تم آ رہے تھے، اور جس کی آغوش سے تمھیں آتشک کے تحفے حاصل ہوئے تھے۔

تمھاری آنکھیں اچانک کھل گئیں۔ لاہور کے آسمان میں گدھوں کی ندی رواں تھی اور نیچے راوی کی سیل لہریں جاری و ساری تھیں۔ گھاس کی ڈنڈیاں شبنم سے تر تھیں۔ تمھارے کپڑے بھی ٹھنڈی شبنم سے تر تھے، اور تم سوچ رہے تھے کہ اس تازہ خواب میں کیسا عجیب و غریب ارشاد تھا۔ ارشاد یہ تھا کہ چونکہ آتشک وہ شے ہے جس کے طفیل تمھارا مقدر شارل بودلیر کے مقدر میں پیوست ہو سکتا ہے، اب وقت آ گیا تھا کسی رنڈی کی بانہوں میں اس مرض سے شناسائی پیدا کرنے کا۔

16

تم چند ہفتوں سے ہر شام ہیرا منڈی کا رخ کرتے ہو۔ ہر شام تم ٹکسالی دروازے سے گزرتے ہو اور منافقت کا لبادہ چھوڑ کر، یہاں رنگینیوں میں مگن ہو جاتے ہو۔ یہاں کی سب بدکار عورتیں تم کو خوب پہچانتی ہیں۔ وہ تمھیں دیکھ کر اپنے بالا خانوں کی بلندیوں سے ایک دوسری کو پکارتی ہیں۔ "حاجی او بیبی، سوامی جی پھر آئے ہیں۔" تمھارے گرد آلود ژولیدہ بال، تمھارے رنگ برنگے کپڑے، اور تمھارا بے جا انہماک دیکھ کر، سب کو جلدی سمجھ آ گیا کہ تم کسی گپھا، کسی آشرم کے بھٹکے

Scanned with CamScanner

ہوئے مکین ہو۔ بالا خانوں کا یکساں سلسلہ تمھاری نظر سے گزر رہا ہے۔ رات ڈھل رہی ہے۔ بالا خانوں کی منڈیروں پر دیے باری باری جلنے لگتے ہیں۔ ان کی روشنی میں عورتوں کے لیے منتظر چہرے یاس و اندوہ کے مینار معلوم ہو رہے ہیں۔ یہاں ہر زندگی ایک الگ مرض کا شکار ہے۔ تپ دق، سرطان، سوزاک، آتشک۔۔۔ دنیا کی کون سی بیماری ان عورتوں کو نہیں ستا رہی ہے؟ یہ جان کر بھی راہ چلتے شہدے ان کو للچائی نگاہوں سے تاکتے رہتے ہیں اور جب شہدوں کو کوئی ادا یا صدا پسند آتی ہے، وہ بہ کر زینے چڑھتے ہیں اور ایک بیمار عورت سے ہم بستری کرتے ہیں۔ پھر وہ فارغ ہو کر زینے اترتے ہیں اور اپنے جسم و جان میں ایک جان لیوا مرض کے چند تخم پال کر سڑک کی تاریکیوں میں جذب ہو جاتے ہیں۔

تم بالا خانے کی ایک عورت سے آتشک کی سوغات لینے کے لیے پوری طرح تیار ہو مجامعتوں کی کثرت سے تمھارا جی گھبراتا ہے۔ ایک ہی عورت سے اور ایک ہی دفعہ مجامعت کرنا تمھارے لیے کافی ہے۔ تم ہر شام ہیرا منڈی کے کونے کونے میں اس نرالی طوائف کی تلاش کرتے ہو جس کی جلد اس قدر زہرناک ہوگی کہ اس سے ایک ہی دفعہ مس ہو کر تم ہمیشہ کے لیے بیمار ہو جاؤ گے۔ پھر ایک لمبی تلاش کے بعد تم کو ہیرا منڈی کی منحوس ترین طوائف کا پتا ملتا ہے۔ اس کا نام خوشبو ہے اور وہ انیس سال کی ایک کالی سی گل اندام دوشیزہ ہے۔ وہ تین سال سے اس محلے میں دھندا کرتی ہے اور گزشتہ دو سالوں میں اس کے سارے تماش بین دیوانے، نابینا یا مفلوج ہو گئے۔ تماش بینوں نے اس کے پاس آنا چھوڑ دیا۔ وہ دن رات اپنے بالا خانے پر کھڑی رہتی ہے، اور چونکہ سب راہ چلتے شہدے اس کی غیر معمولی نحوست سے آگاہ ہیں، وہ ایک نظر بھی اس کے تازہ تازہ حسن، سمور نما تن بدن، آبنوسی کومل جلد، ابابیل سی آنکھوں اور تیرہ و تاریک بالوں پر ڈالنے سے کتراتے ہیں۔ بودلیر کی حبشی معشوقہ کا ہولناک اور بے لگام حسن ہیرا منڈی کی اس ان دیکھی طوائف تک منتقل ہوا ہے۔ اس کے بالا خانے کی زیارت تم پر فرض ہے۔

خوشبو کا چکلا تمھارے کلکتے والے خواب کی تعبیر تھا۔ تم نے، سب سے پہلے، خوشبو کے ننگے بازو ٹٹولے، گویا تم ان کی اصل نسل معلوم کرنے کی کوشش میں تھے۔ پھر ان کی نسل سے مطمئن ہو کر تم نے خوشبو کے پیٹ میں اپنا خنجر گھونپ دیا۔ تمھارا خنجر یک سیخ کی طرح گرم تھا۔ خوشبو کا پیٹ ایک

Scanned with CamScanner

تیر خوردہ ہرن کی طرح لہولہان تھا۔تم دیر تک خنجر سے اس گھائل پیٹ کو کریدتے رہے اور ایک مسلسل جلن تم پر یہ جتاتی رہی کہ خوشبو واقعی زہرناک اور آتش ناک ہے۔ اس پورے عمل کے دوران تم خوشبو کی پیٹھ کو اپنی بانہوں میں جکڑتے رہے۔ اس کی پیٹھ پر رستے پھوڑوں کا ایک جنگل تھا۔تم کو پوری طرح اطمینان ہوا کہ تم آتشک لے کر اس کی آغوش سے بچھڑ جاؤ گے۔

اب فرار لازمی ہے۔ آتشک نے تم کو کم ہی مہلت دی۔ اس کے تخم، جلد ہی، جراثیم کی شکل اختیار کریں گے۔ تمھارا جسم، جلد ہی، مرجھا کر ایک سوکھا پھوڑا بنے گا۔تمھارے اعصاب، جلد ہی، ٹوٹ پھوٹ کر تم پر فالج کی مہر ٹھونک دیں گے۔تمھارا ذہن، جلد ہی، راہ راست سے بھٹکے گا۔لیکن تم یہ سارے تماشے اپنے دیندار والد اور گریہ کناں والدہ کی آنکھوں سے اوجھل رکھو گے اور کہیں چھپ کر سکوت اور خاموشی سے فنا ہو جاؤ گے۔تمھیں جلد از جلد اپنے گھر اور شہر سے فرار ہونا ہے اور آتشک خود بخود تمھیں شارل بودلیر کے قدموں تک پہنچائے گا۔

17

کچھ ہفتوں سے وہ جنگیں جو پہلے گورے ممالک کو تباہ کر رہی تھیں، ہندوستان کے گرد اگرد جھبھنانے لگی ہیں۔ جرمن اور جاپان کی افواج ہندوستان کی حدود کے نزدیک آ رہی ہیں اور اب عوام کو ان دشمنوں کے خلاف بھڑکانے کے لیے آل انڈیا ریڈیو دہلی سے کچھ پروپیگنڈا پروگرام نشر ہونے لگے ہیں۔ آل انڈیا ریڈیو کی طرف سے اشتہار دیے جانے لگے: قومی نشریات کے اسکرپٹ لکھنے کے لیے شعلہ بیان اور جوشیلے قلم کار درکار ہیں۔فرار کا ایک موقع ہاتھ آیا۔تم نے آل انڈیا ریڈیو میں اپنی عرضی بھیجی اور تمھاری عرضی فوراً منظور ہو گئی، کیونکہ وہاں کے شعبۂ نشریات کا سربراہ تمھارے ناولوں کا شوقین قاری رہا ہے۔لیکن دلّی ابھی دور ہے ورد تی کی ٹرین کا مہنگا ٹکٹ اس کی راہ میں حائل۔تم نے اپنے سارے پیسے شرابوں اور عیاشیوں میں اڑائے۔تمھارے پاس کچھ نہیں رہا۔تم شش و پنج میں پڑ جاتے ہو اور ایک شام گھر آ کر، بی ماں کے بنائے ہوئے کریلے کھاتے کھاتے، تم پر ایک سبیل کا انکشاف ہو جاتا ہے۔تم کو، اپنے گھر کے کلاک کے اوپر، اس پرانی کاپی کا ایک کونا نظر آیا جس میں میراجی کے دور سے پہلے کی ناپاک اور مبہم نظمیں محفوظ ہیں۔ ان نظموں کو میراجی کے دور کے گیتوں سے

کیوں نہ ملایا جائے؟ ایک عجیب مجموعہ بنے گا، ناپاکی اور پوترتا کا، ابہام اور سادگی کا، ایک مجموعۂ اضداد۔ تم فوراً اس مجموعے کو ترتیب دیتے ہو اور ایک جانے مانے ناشر کے سپرد کرتے ہو۔ وہ تم کو ایک پیشگی رقم عنایت کرتا ہے، اور جس روز یہ مجموعہ میراجی کے گیت کے نام سے منظرِ عام پر آتا ہے، تم چوری چھپ کر دلی کی ٹرین میں لاہور شہر سے روانہ ہو رہے ہو۔ تمھارے خاندان کے تاریخی سفروں میں ایک اور سفر کا اضافہ ہو رہا ہے۔ تم ٹرین کے تیز پہیوں کی لے سنتے سنتے قسمت کی ستم ظریفی پر سوچ رہے ہو۔ میرا سین نے تم سے سرد مہری برت کر تم سے سینکڑوں گیت لکھوائے اور گیت لکھوا کر تمھیں ایک ناشر کے ہاتھ وہ رقم بھیجی جس کے فیض سے تم، اس کی ضرر رساں نگاہوں سے پرے، نئی دوریوں میں گم ہو جاؤ گے۔ اس نے تمھیں بیک وقت زہر اور تریاق، ضرب اور اندمال، بیماری اور دارو سے نوازا ہوا ہے۔

تمھارا رختِ سفر کتنا مختصر ہے! وہ تین چیزوں سے عبارت ہے۔ تین چیزیں تمھارے پاس ہیں جنھیں لاہور شہر بے پناہ اخلاص اور فراخ دلی سے تم کو مرحمت فرما گیا۔ پہلی چیز تمھارے دل میں دہکتی ہے: وہ ایک نامکمل پیار کا نارسا شعلہ ہے۔ دوسری تمھاری ہتھیلی میں چلّہ کاٹ رہی ہے: وہ لوہے کا ایک سنجیدہ گولہ ہے۔ اور تیسری تمھارے بطون کی اتھاہ کھائیوں میں پھٹنے کو بے قرار ہے: وہ یک جان لیوا مرض کا گم گشتہ تخم ہے۔

18

تمھارے متعلق ہر طرح کی کہانیاں آل انڈیا ریڈیو کی عمارت میں پہلے سے پہنچی ہیں۔ عملے کے تمام لوگ تمھارے رنگ ڈھنگ کے انوکھے پن سے آگاہ ہیں۔ سب کی آنکھیں تمھاری پوتر مالائیں، بلوائی زلفیں اور پراسرار گولہ دیکھنے کی امید رکھتی ہیں، لیکن تمھارا نیا حلیہ ان کے لیے مایوس کن ہے۔ آل انڈیا ریڈیو کی عمارت میں قدم رکھنے سے پہلے تم نے بھیس بدلا۔ میراجی کی مالائیں ردی کی ٹوکری میں پڑی ہیں، اس کے بالوں کی قطع و برید ہوئی ہے اور اس کا گولہ، جسے وہ فہم کا انڈا بھی کہتا ہے، ایک استری شدہ پتلون کی جیب میں چھپا ہوا ہے اور آج تمھاری ذات، میراجی کا بھیس تیاگ کر، متانت اور شرافت کا بہروپ بھر کر، دھیرے دھیرے آل انڈیا ریڈیو کی دہلیز کو لانگ رہی ہے۔

Scanned with CamScanner

پھر تم جیسے نووارد کو وہ بوریت والا کام سونپا گیا جسے کرتے کرتے عملے کے تجربہ کار افراد اکتا گئے۔ تمھیں ہر روز اتحادیوں کی فوجی سرگرمیوں کی رپورٹوں کا ترجمہ کرنا ہے۔ ان ترجموں کو روزانہ خبرنامے میں شامل کیا جاتا ہے۔ اس طرح تم آل انڈیا ریڈیو میں اپنے اول اول کے دن ایک عجیب اور نادر جنگ کے محاذوں پر گزار لیتے ہو اور وہ محاذ دنیا کے اطراف و جوانب میں پھیلے ہوئے ہیں۔ بحرالکاہل کے دور افتادہ جزیروں میں جاپانی جنگجو امریکی جہازوں کی گھات لگا رہے ہیں۔ روس کے برف پوش جنگلوں میں سرخ فوج سبز فوج کا تعاقب کر رہی ہے۔ لیبیا کے ریگستانوں میں المانیوں کے ٹینک صف باندھے ہوئے ہیں۔ ناگا پربتوں میں برطانوی سلطنت کے گورے سپاہی آنے والی یورشیں روکنے کے لیے لنگر کھڑے کر رہے ہیں۔ تمھارا من گھنٹوں تک ان سرگرمیوں میں مگن رہتا ہے۔ تم دیر کر رہے ہو۔ خبرنامے سے آدھا گھنٹہ پہلے خبر پڑھنے والی لڑکی بے صبر ہو کر تمھارا ترجمہ لینے تمھارے پاس خود آتی ہے۔ تم اس کو دیکھ کر جلدی جلدی اپنا کام سمیٹ لیتے ہو۔ تمھارا قلم مرمریں کاغذ پر جنگی الفاظ کندہ کر رہا ہے اور تمھاری آنکھیں، اس لڑکی پر مرکوز، ایک دزدیدہ جھلک حاصل کرنے میں کوشاں ہیں۔ خبروں والی لڑکی کا نام سحاب ہے اور وہ ایک گھنگھور گھٹا کی طرح دبازت کی ردا اوڑھے ہوئی ہے۔ سحاب ایک سیاہ برقعے میں ہر دم ملبوس ہوتی ہے۔ اس کے جسم کے رنگ برنگے خطوط سیاہی میں پنہاں ہوئے ہیں، لیکن اس کی آواز اور آنکھیں دونوں برقعے سے جھانکتی ہیں، اور دونوں یک بہت حسین عورت کے نشانات ہیں۔

پھر تمھیں ایک نئے پروگرام کا ذمے دار بنایا جاتا ہے۔ "خرابات" اس پروگرام کا نام ہے۔ اس میں تم مختلف شخصیتوں کا انٹرویو لیتے ہو۔ تم نڈر ہو کر ان سے گفتگو کرتے ہو۔ تمھارے سوال بے باک اور با مقصد ہیں اور عام طور پر ظرافت لیے ہوئے۔ تم ایک مشہور گلوکارہ سے پوچھتے ہو کہ وہ عموماً راگوں کے ریاض پر رقصوں کی محفلوں کو کیوں ترجیح دیتی ہے۔ تم ایک ڈرامانویس سے اس کے تاریخی ڈراموں کی افادیت دریافت کرتے ہو جن کے شہزادے، بادشاہ اور ملکائیں اپنی رعایا کے حالاتِ زار سے سراسر غافل ہیں۔ ایک سرخے شاعر سے، جو کہ ان دنوں برطانوی فوج کی وردی پہنتا ہے، تم پوچھتے ہو کہ وہ اپنے استعماری دشمنوں کا لباس پہن کر اپنے اصولوں سے منحرف تو نہیں ہو رہا ہے۔ ہر پروگرام میں تمھارا مہمان تم سے ناراض ہو جاتا ہے۔ لیکن ہر پروگرام کے بعد تمھارے آل

انڈیا ریڈیو کے رفیقِ کار تم پر داودوں کی بوچھاڑ کرتے ہیں کیونکہ تم نے اپنے گستاخانہ سوال پوچھ کر ان سب کے تحقی ارادے پورے کیے ہیں۔

سحاب کے پوشیدہ لب تمھاری تعریف میں ہر روز رواں ہیں۔ وہ ہر پروگرام کے اختتام پر تمھارے پاس تمھارے گن گانے آتی ہے، اور ان لمحوں میں تم اس کی ننگی آنکھوں سے آنکھیں ملاتے جارہے ہو اور تمھاری آنکھیں سامنے کے ان دو عمیق شگافوں میں ایک ناگفتہ عشق کی شرمناک لوتلاشتی جارہی ہیں۔

19

ہر شام، جب تم آل انڈیا ریڈیو کی عمارت سے نکلتے ہو اور تمھارے قدم شہر کی راہ گزاروں کی پیمائش کرنے لگ جاتے ہیں، ایک آواز، شارل بودلیر کی آواز، تمھارے کانوں میں گونجنے لگتی ہے۔ یہ آواز تمھیں بہت بری طرح بہکانے پر تلی ہوئی ہے۔ وہ بار بار تم کو اپنی تنخواہ کی پوری رقم عیاشیوں پر خرچنے کو کہتی ہے اور تمھاری جھجک اور نامستعدی دیکھ کر آواز ایک امامِ مسجد کے گرج دار لہجے میں تمھیں کہتی ہے: ''حقیقت کی تعمیر بدی کی بنیاد پر ہے۔'' آواز کا یہ آخری کارتوس اپنے ہدف کو جا لگتا ہے۔ تم ایک بار اور بدی کی طرف مائل ہو جاتے ہو۔ آخر تم اور کتنی نیکیاں کرو گے؟ تمھارا ایک ایک دن آل انڈیا ریڈیو کے پاس ہندوستانی عوام کی خدمت میں بسر ہوتا ہے۔ ان مسلسل نیکیوں کا کفارہ زوردار اور نمایاں گناہوں سے ادا کرنا ہے۔ شراب کا آبِ مقدس زیادہ سے زیادہ مقدار میں پینا ہے۔ دسیوں، بیسیوں بازاری حوروں کے جسم سے حظ اٹھانا ہے۔ تم پھر جی بی روڈ کا رخ کرتے ہو، اور رستے میں جہاں بھی کوئی ٹھیکہ دکھتا ہے، تم پڑاؤ ڈالتے ہو اور ایک بیئر کی بوتل خالی کرکے آگے بڑھ جاتے ہو۔ جی بی روڈ تک ٹھیکے بے شمار ہیں۔ جی بی روڈ پہنچتے پہنچتے تم بدنام اور گھناؤنے ہو گئے ہو۔ شراب کی ڈکاریں تمھارے منھ تک آتی ہیں۔ پاؤں راہِ راست سے سراسر نادان ہیں۔ زبان ہر حرف پر اٹک جاتی ہے۔ اور، تھوڑی دیر بعد، جب ایک بازاری حور اپنے چکلے میں تمھارے سامنے اپنے کپڑوں کا فالتو بوجھ اتارتی ہے، تم محسوس کرتے ہو کہ بیئر کا نشہ تمھاری ناگن کو سلا چکا ہے۔ وہ تمھارے دستِ شفقت کے لمس سے بیدار ہو گا۔ تم تن آسانی شروع کرتے ہو۔ ہر حورِ بازار اپنے ہاتھ سے

Scanned with CamScanner

تمھاری مدد کرنے کو تیار ہے، لیکن تم اپنی ناگن کے پاس کسی غیر ہاتھ یا جسم کو آنے نہیں دیتے ہو۔ بار ارکی حوریں تمھارے لیے اور طرح کے کام کرتی ہیں۔ وہ تمھارے لیے چند لمحوں تک تمھارے ماضی کی گمشدہ دوشیزائیں بنتی ہیں۔

آج کل ملتان کی لنگی والی لڑکی تمھارے حافظے اور نفس پر قابض ہے۔ سو تم ہر حور کو پیسے دے کر کمر پر ایک گھریلو لنگی باندھنے کو کہتے ہو۔ حور لنگی باندھ کر اپنے چکلے کے قمقموں کی کھردری روشنی میں کھڑی ہوتی ہے۔ اس کی رانوں کا سنگم کپڑے کے آر پار جھانکنے لگتا ہے۔ حور ملتان والی لڑکی کا پورا چربہ ہے۔ تن آسانی کی داغ بیل ہوتی ہے۔ تمھارا دست شفقت صبا رفتار ہے۔ تمھاری سانسیں اکھڑی اکھڑی ہیں۔ اور اچانک تمھارے تخم پھوٹ پڑتے ہیں اور چکلے کے فرش پر گر پڑتے ہیں۔ اس طرح تمھاری کتنی ملکہ وادیں نا آفریدہ اور لامکاں رہی ہیں۔ سب فرشوں کے میل میں ضم ہو گئیں۔

ہر رات تم جی ٹی روڈ سے رخصت ہونے کے بعد ڈگمگاتے قدموں سے لرزتی سڑک پر اپنے ٹھکانے کی کھوج لگاتے ہو، اور ہر رات سڑک پر تمھاری مڈبھیڑ مقصود تانگے والے سے ہوتی ہے۔ وہ تھوڑے پیسے لے کر تم کو تمھارے ٹھکانے پر پہنچا دیتا ہے اور کبھی کبھی، جب تمھارا مدہوش جسم ایک لاش کی طرح بے جان اور بے حرکت ہوتا ہے، وہ تمھیں تانگے سے اتار کر اپنی پیٹھ پر اٹھائے تمھارے بستر تک لے جاتا ہے۔ مقصود اس شہر کا بے پر و بال فرشتہ ہے، اور وہ تم جیسے بدی پرست آدمی کا کتنا خیال رکھتا ہے!

ہر روز سویرے اٹھ کر تم کو اپنے آپ سے ایک عجیب گھن آتی ہے۔ رات تم نے مدہوشی میں اپنے بستر کو الٹی سے میلا کیا، لیکن اس معمولی سی حرکت پر تم کو ندامت نہیں ہوتی ہے۔ پشیمان تم یہ سوچ کر ہوتے ہو کہ پچھلی رات تم سحاب کے پاک تصور کو دغا دے کر ایک غلیظ حور کے فحش دیدار سے لطف اندوز ہوئے ہو۔ سحاب ہمہ تن مستور و محجوب ہے۔ تم نے اب تک صرف اس کی آنکھیں دیکھی ہیں۔ وہ صرف ایک تصور ہے، لیکن یہ تصور تم سے تعظیم اور وفا مانگتا ہے۔ تعظیم اور وفا کا مظاہرہ تم کر بھی لیتے اگر سحاب بیوہ کی آواز ہر شام تمھارے پاس حاضر ہو کر تمھیں اپنے منتی خطبے نہ سناتی۔

ایک رات تمھاری نیکیاں اپنی انتہا کو پہنچیں۔ مقصود تانگے والے نے تمھیں حسب معمول جی ٹی روڈ سے اٹھایا تھا اور سید حاتم سے چار سو روپے مانگے تھے، اپنی چھوٹی بیٹی کے آپریشن

Scanned with CamScanner

کے لیے۔ تم نے اس کو پیسے دیے تھے اور اگلے دن، شام کی بودلیر والی آواز نے تمھیں اس نیکی کے لیے بہت کوسا تھا۔ کفارہ فوری طور پر دینا تھا۔ سو تم نے فیصلہ کیا کہ آج تم کسی ٹھیکے پر نہیں رکو گے اور سیدھا، پورے ہوش و حواس میں، جی بی روڈ جا کر ایک یتیم حور کے ساتھ مباشرت کرو گے۔ اس حور کو، تمھارے متعدی اور مہلک مرض کے ہاتھ، جواں مرگی کا پیام ملے گا۔ تم نے مقصود تانگے والے کی صاحبزادی کی جان بچائی تھی۔ اب نوبت آئی تھی اپنے ہاتھوں ایک گمنام مرد کی بھولی بسری بیٹی کی جان گنوانے کی۔

تم نے جی بی روڈ میں ایک لائق حور کی تلاش کی۔ لڑکی کو یتیم اور کم سن ہونا چاہیے تھا۔ سو، تم نے بیسیوں ایسی لڑکیوں کو ٹھکرایا جو تمھاری ان شرطوں کو پوری نہیں کر سکتی تھیں، اور آخر تمھیں اپنی یتیم ملی۔ وہ سترہ سال کی ایک پنجابی لڑکی تھی۔ سدرہ اس کا نام تھا۔ وہ چند ماہ پہلے تمھاری طرح لاہور سے دہلی تشریف لائی تھی۔

تم سدرہ کے چکلے میں داخل ہوئے ہو۔ وہ کپڑے اتار کر ایک غلیظ گدے پر لیٹ گئی۔ تم نے اپنی پتلون سے اپنی ناگن نکالی۔ سدرہ اس کے ڈنک کے لیے پوری طرح تیار تھی۔ پھر تمھاری ناگن اس کی ننگی رانوں پر منڈلانے لگی۔ لیکن افسوس اتنی سانپوں کی کثرت نے اس کو ڈنک مارنے کے قابل نہیں چھوڑا تھا۔ ناگن سہم زدہ اور حزیں تھی۔ سدرہ منتظر تھی۔ اس کی آنکھوں کے گہرے حلقوں سے بوریت اور بیمائی امڈ رہی تھیں۔ انتظار میں، اس کی اکتاہٹ کی ڈسی آنکھیں دو خزاں زدہ پتیاں معلوم ہو رہی تھیں۔ ایسی ہی خزاں زدگی تم نے سحاب کی آنکھوں میں دیکھی تھی۔ تم نے یکایک اپنی معصیتوں سے توبہ کی۔ یہ لڑکی سحاب کی ہم زاد تھی۔ اس کے جسم میں مرض کا زہر گھولنا پاپ تھا۔ تم نے اس کی رانوں سے اپنی ناگن کو سرکایا اور سحاب نے فوراً سدرہ کی آنکھوں سے اپنی آنکھیں سرکائیں۔ سدرہ سے اب محض تن آسانی کا کام لینا تھا تم نے اس کو ایک ٹب پر ہلول والی یموند کی مخصوص حرکت کرنے کو کہا۔ وہ پہلے انکار کرتی رہی۔ تمھارے لیے تماشا بننا اس کو تمھاری ناگن کا شکار ہونے سے زیادہ ہتک آمیز نظر آ رہا تھا، حالانکہ نرا تماشا بننے میں اس کے جسم کو نہ تکلیف، نہ اذیت پہنچنے والی تھی۔ تم نے اس کی اجرت بڑھانے کا وعدہ کیا اور تمھارا اصرار اس کے انکار پر غالب آ گیا۔ سو ایک زریں دھارا اس کے بطون سے پھوٹ کر ایک ٹب کے میلے پانی میں گرنے لگ پڑی، جسے دیکھ کر سدرہ کا تماشا اور

Scanned with CamScanner

سدرہ کا تصور تمہارے ذہن میں خلط ملط ہو گیا۔ اور اسی شب میں، تھوڑی دیر بعد، تمہاری تن آسانی کے تخم بھی گرنے لگ پڑے۔

تم اس دن، شراب پیے بغیر اور زنا کیے بغیر، اپنے ٹھکانے پر لوٹے۔ سحاب نے آج عجب طرح سے سدرہ کی حفاظت کی تھی۔ سحاب نے تمہیں مزید بدیاں کرنے سے روکا تھا۔ سحاب کا تصور تمہارے من اور نفس پر پوری طرح راج کر رہا تھا، لیکن اصلی سحاب کدھر تھی؟ وہ کئی ہفتوں سے آل انڈیا ریڈیو سے ناغہ کر رہی تھی۔ اس نے اپنے بیمار باپ کی تیمارداری کرنے کے لیے لمبی چھٹی لی تھی، لیکن اپنے گھر کی چار دیواری سے بھی وہ تم پر حکم چلا رہی تھی۔ اس نے جی بی روڈ کے تمام چکلوں میں اپنی آنکھیں تعینات کی تھیں اور تمہاری نگرانی کرتی رہتی تھی اور جب اس ہمہ بین سحاب کو تمہارے ایک ایک فعل، ایک ایک خیال کی خبر تھی، اس سے اپنا عشق چھپانا کس قدر عبث تھا! اظہارِ محبت اب ایک لازمی مرحلہ تھا۔

20

سحاب کے ضعیف اور بیمار والد آخرکار رحلت کر گئے اور سحاب آل انڈیا ریڈیو خبریں پڑھنے واپس آ گئی۔ لیکن اس کا نام لمبی چھٹیوں کے بعد اپنا مفہوم کھو چکا ہے۔ اب سحاب غم اور ماتم سے اکتا گئی، اور اس کا تن سوگوار و بازتوں کی تاب نہیں لا سکتا ہے، لہٰذا اس نے نقاب پہننا چھوڑ دیا۔

سحاب نے نقاب چھوڑ کر ستم کیا۔ وہ تصور کی آرام دہ خلوت سے بھاگ کر زمانے کی ظالم جلوت میں آ گئی، اور اس جلوت میں آ کر وہ اپنا انوکھا پن کھو بیٹھی۔ اس کی آنکھیں ناقابلِ ذکر ہوئی ہیں۔ اس کے چہرے کے خد و خال کشش نا آشنا ثابت ہوئے ہیں۔ اس کا جسم نہ فربہ، نہ لطیف نکلا ہے۔ وہ متوسط طبقے سے تعلق رکھنے والی ایک معمولی لڑکی کا معتدل جسم ہے۔

سحاب تمہارا اظہارِ محبت سننے کا حق نہیں رکھتی ہے۔ یہ بے پردہ سحاب پیار کے وہ علامتوں بھرے الفاظ کیسے سمجھے گی جو کہ تم ایک پردہ دار سحاب پر نچھاور کرنا چاہ رہے تھے؟ سحاب کی یہ غیر متوقع اور بیزار کن کایا کلپ تم سے ایک جوابی کارروائی مانگتی ہے۔ سحاب نے تم سے پوچھے بغیر نقاب چھوڑا۔ تم اسے کہے بغیر اپنا موجودہ بھیس چھوڑ دو گے اور اپنا گزشتہ بھیس، میراجی کا بھیس، دوبارہ دھار دو گے۔

Scanned with CamScanner

اور ایک دن، پرانے زمانے کا میراجی، بصد کرّ و فر، آل انڈیا ریڈیو میں جلوہ افروز ہوا ہے۔ میراجی نے اپنے بالوں کو کھینچ کھینچ کر ایک سادھو کے کیش کی لمبائی عطا کی۔ پہلے کی طرح اس کی مونچھ کی توام شمشیریں اس کے رخساروں پر سایہ افگن ہیں۔ پہلے کی طرح تین مالائیں اس کے گلے میں اپنی بانہیں حمائل کیے ہیں۔ پہلے کی طرح اس کا فہم کا انڈا، ایک لٹو بن کر، اس کی ہتھیلی میں مدام گھومتا ہے۔ اور تم، اس ماضی سے بازیاب ہوئے میراجی کو اور ممتاز مد بنانے کے لیے، آل انڈیا ریڈیو میں شراب پینے لگتے ہو۔ تم نے ایک شیشی کا بندوبست کیا جس کی ٹیڑھی نالی ایک ہنس کی کھڑکل گردن معلوم ہوتی ہے۔ یہ زخم خوردہ شیشی ہر وقت تمھارے ازار بند میں اڑسی ہوتی ہے۔ تم، وقتاً فوقتاً، اس کی نالی سے ایک گھونٹ پی لیتے ہو، اور جب سہ پہر کا سورج افلاک کی بلندیوں سے آل انڈیا ریڈیو کی کھڑکیوں کو اپنی آتشیں کرنوں سے جھلسانے لگتا ہے، تم اس قدر مدہوش ہو چکے ہوتے ہو کہ تمھیں مجبوراً مقصود تانگے والے کو بلانا پڑتا ہے۔ وہ تم کو اپنی پیٹھ پر اٹھا کر باہر لے کر جاتا ہے اور اپنے تانگے کی سیٹ پر لٹا دیتا ہے۔ تانگا چل پڑتا ہے۔ اس کے جھٹکے تم سے برداشت نہیں ہوتے۔ تم لیٹے لیٹے اپنے کپڑوں پر الٹی کر جاتے ہو۔ آل انڈیا ریڈیو کی عمارت کی ایک کھڑکی پر سحاب کھڑی ہے اور وہ اپنی حسرتی اور سوالی آنکھوں سے تمھاری روانگی کا پژمردہ تماشا دیکھ رہی ہے۔

کچھ دن گزرے۔ تم سحاب کی بے پردگی کے عادی ہو گئے ہو۔ وہ تمھارے تماشوں کی عادی ہو گئی ہے۔ یہ روز افزوں تماشے اس کی نظر سے تمھارا مقام نہیں گرا سکے۔ وہ پہلے کی طرح تمھاری عزت اور پروا کرتی ہے۔ وہ روزانہ تمھارے پاس آ کر پرسش حال کرتی ہے۔ وہ اسی طرح تمھارے غموں اور خوشیوں پر نظر رکھتی ہے۔ اور وہ آل انڈیا ریڈیو کے ناراض مہتمموں کے سامنے تمھاری صفائی پیش کرتی ہے۔ وہ ان کو کہتی ہے کہ تم ایک عاشق نامراد ہو، اور جوں ہی تم اس کشور میرا سین کو اپنے دل سے نکالنے میں کامیاب ہو جاؤ گے، تم اپنے آپ سنبھل جاؤ گے۔ تماشا بن کر سحاب کو دھچکا دینے یا چونکانے سے کیا حاصل؟ وہ شروع سے تمھاری حلیف اور دلدار ہے۔ اس کو کھو کر تم خود کا نقصان کرو گے۔ تم اپنے مستقبل کو کٹھن بناؤ گے۔ اب سحاب سے جڑا رہنا ہے۔ وہ تمام عورتوں میں سے وہ واحد عورت ہے جو تمھیں سمجھنے اور جھیلنے کی لیاقت رکھتی ہے۔ اب وہ دوبارہ تمھاری نظر میں اس اظہارِ محبت کی مستحق ٹھہری جو کہ ایک عرصے سے تمھارے یہاں التوا کا شکار ہے۔ اور ایک روز، صبح کے

Scanned with CamScanner

وقت، تم اظہارِ محبت کی غرض سے آل انڈیا ریڈیو کے ایک اسٹوڈیو کے باہر کھڑے ہو جاتے ہو۔ سحاب کو آدھے گھنٹے میں صبح کی خبریں پڑھنی ہیں۔ وہ یہاں سے ضرور گزرنے والی ہے۔ مطلع صاف ہے۔ انارکلی کا پر رونق بازار، جہاں تم نے پہلی دفعہ یک عورت سے اظہارِ محبت کرنا چاہا تھا، محض یک یاد ہے۔ سویرے اسٹوڈیو کے باہر کوئی نہیں گزرتا ہے۔ یہاں نہ کوئی پیچھے والا، نہ کوئی تاڑنے والا، نہ کوئی فقرے کسنے والا موجود ہے۔ یہاں صرف ایک خاں صاحب موجود ہیں جو کہ اسٹوڈیو کے اندر یک الاپ کر رہے ہیں۔ ان کی آواز کے لمبے مرغولے بادلوں کی طرح سکوت پر چھائے جا رہے ہیں۔ پھر سحاب کی مانوس آہٹیں گلیارے میں گونج رہی ہیں۔ خبروں کا وقت قریب ہے۔ اسٹوڈیو میں خاں صاحب اپنے الاپ کو طول دیے جا رہے ہیں۔ ان کی پریشان آواز خلا میں ایک سُر کا آسرا ڈھونڈے جا رہی ہے۔ سحاب اسٹوڈیو کی طرف قدم بڑھا رہی ہے۔ اس کے قدموں میں عجلت اور بے چینی ہے۔ اسٹوڈیو میں الاپ ختم ہوا ہے۔ خاں صاحب اس طویل تمہید کے بعد ایک راگ چھیڑنے لگے ہیں۔ وہ راگ جے جے ونتی ہے... اور فوراً ہی تمھاری آنکھیں آنسوؤں سے بھر جاتی ہیں۔ اس فیصلہ کن لمحے میں وہ بے درد میرا سین تمھیں ستانے آئی ہے۔ اس نے تم تک رسائی پانے کے لیے جے جے ونتی کا سہارا لیا، بہروپ دھارا۔ خاں صاحب کی آواز تمھارے آنسوؤں پر کھلکھلا کے ہنس رہی ہے۔ یہ آنسو تمھاری آنکھوں سے آگے جمع ہو کر ایک اداس سی دھنک بن رہے ہیں، اور اس دھنک کے اوٹ پر، اچانک، سحاب کا چہرہ ایک غیبی رخ کی طرح نمودار ہو رہا ہے۔ سحاب ایک بار اور پرسشِ حال کر رہی ہے۔ وہ ایک نرم اور معصومانہ لہجے میں تم سے پوچھ رہی ہے: ''کیا آج بھی میرا سین کی یاد ان آنسوؤں کا سبب ہے؟''

21

تم تیرہ برس کی بے ثباتیوں سے اسیر ہوئے ہو۔ شرائط تمھیں تمھارے ٹھکانے کی چار دیواری میں نظر بند کر چکی ہیں۔ اب تم شاذ ہی اس چار دیواری سے نکلتے ہو۔ آل انڈیا ریڈیو کی نوکری اور سحاب تمھارے لیے کوئی معنی نہیں رکھتی۔ تم اپنے شب و روز اپنے ٹھکانے پر گزارتے ہو، جہاں دوستوں کی بزم ہر وقت زوروں پر ہے۔ اور ان شب و روز کے دوران تمھارا فہم کا انتہا، ہر وقت،

Scanned with CamScanner

تپائی، کرسی یا بستر کی اونچائی سے تم کو اپنی نابینا آنکھوں سے گھورتا ہے۔ یہ تمھارا دیرینہ ہمدم، نباض اور نگران ہے۔ جاڑے کے دن ہیں۔ دلّی شہر دیر تک کہرے کی ٹھنڈی چادر میں لپٹا رہتا ہے۔ تا کہ تمھارے فہم کو انڈے کو سردی نہ لگے، تم اس کو سگریٹ کے ڈبوں کی چمکیلی پنیوں سے ڈھک لیتے ہو۔ وہ، اس بلوریں لباس سے ڈھک جانے کے بعد، ایک تقدیر بتانے والی گولائی کا کام دینے کے پوری طرح قابل ہوا ہے۔ اس کی جھلملاہٹ میں آئندہ کی وارداتیں، بار بار، ایک ہی ترتیب سے، درشن دے رہی ہیں۔ پہلے ایک ٹرین نظر آتی ہے جس کے ڈبے مقتول شرنارتھیوں کے گلے ہوئے مردوں سے پٹے پڑے ہیں۔ پھر ایک قصبہ نظر آتا ہے جس کی گلیوں میں سکھ اور مسلمان باری باری لوٹ مار مچاتے ہیں۔ پھر کچھ خرابے دکھتے ہیں جن کے اندر سے بے نام دوشیزاؤں کی آبرو باختہ چیخیں بلند ہوتی ہیں۔ آخرکار ایک شاہی ایوان نمود کرتا ہے جس کے وسط میں، ایک گول میز پر، ہندوستان کا ایک وسیع نقشہ بچھا ہوا ہے۔ اس نقشے پر کچھ بے چہرہ حاکموں کے سرخ قلم رات دن پھرتے ہیں اور ان کے تیشہ نما قلموں کے دورے ندیاں، پہاڑ اور زمینوں کے رقبے دو نیم ہو جاتے ہیں۔

تم کبھی کبھی ان وارداتوں کے بیچ خود کو دیکھ لیتے ہو۔ تم کتنے اجنبی لگتے ہو۔ تمھارے گال گہرے گڑھوں میں اور بال سفید تاروں میں تبدیل ہوئے ہیں۔ تمھارے مغز پر پاگل گدھوں کا ایک غول منڈلاتا رہتا ہے اور تمھاری نحافت تمھیں قلم پکڑنے کی اجازت نہیں دیتی ہے۔ تمھارا ملک جلد ہی یا بدیر خشت راور جبر کا شکار ہونے والا ہے، اور تمھارا وجود آتشک کا قتیل۔

یہ درشن بہت خوفناک ہیں، اور شراب تم کو بہت چڑھ گئی ہے۔ تم اپنے فہم کے انڈے کو ہاتھ میں لے کر بنی چاردیواری سے نکلتے ہو۔ فہم کے انڈے کو پرکھ کر جو تازہ اندیشے پیدا ہوئے، تم انھیں بہار کی ہوا میں بکھیرنا چاہتے ہو۔ رات کا سناٹا ایک موثر دوائی ہے۔ رات کی ظلمتیں مونس اور مشفق ہیں۔ وہ تمھیں ان کے دوش کی سواری کرنے کی دعوت دے رہی ہیں، اور ان کے دوش کی سواری کر کے تم خود بخود کسی قبر یا کسی مزار پر وارد ہوتے ہو۔ نہ جانے کس کا فرمان ہے جس کی رو سے تم ہر رات غالب اور امیر خسرو جیسی مشہور ہستیوں، یا مقبول پان والے اور صابر سبزی فروش جیسے بے تذکرہ افراد کی قبروں کی زیارت پر آتے ہو۔ خیر، ان زیارتوں کے دوران تم تنہا نہیں ہو۔ تمھارا فہم کا انڈا رات بھر تمھاری ہتھیلی کے محور پر ایک سیارے کی طرح گھومتا ہے اور تمھاری ہنس کی گردن والی شیشی تمھاری

Scanned with CamScanner

جیب کے سکّوں سے ٹکرا کر ایک مخصوص انداز میں کھنکتی ہے۔ وقفے وقفے کے بعد تم اس شیشے کو منھ سے لگاتے ہو، اور جب وہ خالی ہو چکتی ہے، تمھارے ہاتھ کانپتے ہیں اور پیر پھسلتے ہیں۔ تمھاری چال بے ہنگم ہو جاتی ہے۔ پیے بغیر تم سیدھا نہیں چل سکتے ہو۔

رات کو تم نشے کی حالت میں عجیب و غریب جگہوں پر تن آسانی کرتے ہو۔ پرانی دلّی اسٹیشن کے غسل خانے ہوں، جمنا ندی کے ویران کنارے یا چاندنی چوک کی حویلیوں کے صحن، تن آسانی کے لیے سارے مقام موزوں ہیں۔ ہر مقام ایک الگ ذائقہ رکھتا ہے۔ اکثر جس دم تمھاری تن آسانی اپنا اختتام حزہ دینے کو ہوتی ہے، دو تین بھٹکے ہوئے راہگیر تمھارے پاس سے گزرنے لگ پڑتے ہیں۔ وہ آوازوں یا گالیوں کے ذریعے تمھاری بے شرمی کی مذمت کرتے ہیں۔ لیکن تمھارے ہاتھ تمھاری رسوائی سے غافل ہیں۔ وہ اپنا کام کرتے جارہے ہیں۔ آخر جب سرِعام لوگ رفعِ حاجت کرتے ہیں، جلوت میں اپنے جسم کو تشفی دینے میں کیا برائی ہے؟ تمھارے نطفے رفعِ حاجت کرنے والوں کے بول و براز کی طرح قدرتی تو ہیں۔ وہ کم از کم ان کی طرح غلیظ اور متعفن نہیں ہیں۔ تم خود ہی ان باتوں سے اپنا دل بہلا لیتے ہو۔ لیکن سچ یہ ہے کہ شراب نے تم کو ایک جنسی خبطی بنایا، گرا ہوا، شرم و حیا سے محروم۔ اب تم کو جلوت کے جنسوں کی عادت ہے اور خلوت کی نی شیوں کا شوق، جس کی گواہی تمھارے ٹھکانے پر فحش کتابوں اور برہنہ تصویروں کے وہ ڈھیر ہیں جن کے نیچے شاعروں کے کلیات دب رہے ہیں، اور جس کی تعداد گردونواح میں بکھری دلّی خالی اور پر بوتلوں سے بھی افزوں ہے۔

22

رات کو، اپنی مخمور آوارہ گردیوں کے دوران، تم اکثر جمنا ندی کے مرگھٹ پر جاتے ہو۔ وہاں تمھاری طرح کے کئی آدم زاد نذرِ آتش ہو رہے ہیں۔ ان جلتے ہوئے آدم زادوں کے گرد گرد بہت حرارت ہے۔ ان کی دہکتی آگ تمھارے جسم کی یخ بستہ اکڑ کو دور کر دیتی ہے۔ تم مرگھٹ کی ہر آگ سے تھوڑی تھوڑی حرارت بٹور لیتے ہو، اور بھسم ہونے والے آدم زادوں کا تقابلی جائزہ لیتے ہو۔ موت کے بعد کوئی خوفزدہ لگ رہا ہے، کوئی پُرسکون اور کوئی اکتایا ہوا۔ آوارہ کتوں کے بھوکے گروہ بھنے ہوئے گوشت کی بو سونگھ کر آدم زادوں کے پاس مجمع لگا رہے ہیں۔ تم دو تین پتھر مار کر ان کو بھگا

Scanned with CamScanner

دیتے ہو۔ تم آدم زادوں کے پاس اکیلے رہنا چاہتے ہو۔ چتاؤں سے تم بالکل اکیلے میں کلام کرنا چاہتے ہو۔ یہاں کی سب چیزیں، موکش پانے والی آتمائیں، آگیں اور بوئیں تم سے مخاطب ہیں۔ تم ان سب کے لیے ایک دعا کے نیک الفاظ دہراتے ہو۔ الفاظ سنسکرت یا عربی کے ہونے چاہییں، یہ تم کو نہیں معلوم۔ سو تم، کہ جو نصف ہندو، نصف مسلمان ہو، دونوں زبانوں کے الفاظ ملاتے ہو، اس امید میں کہ اس ملغوبے کا کوئی نہ کوئی حصہ دربارِ الٰہی میں پہنچ جائے گا۔

ایک رات تمھاری نظر ایک ادھ جلے آدم زادے پر پڑی۔ چتاؤں کی آگ اپنا آدھا کام کر کے اچانک بجھ گئی تھی اور آدم زادے کا پورا دھڑ شعلوں کی لالچ سے بچ گیا تھا۔ اس کی دراز زلفیں اور نارنجی پیراہن یہ بتلا رہے تھے کہ وہ ایک سادھو تھا، عدو اور لواحقین سے محروم۔ اور حیران کن بات یہ تھی کہ اس سادھو کے مردہ ہاتھوں میں لوہے کے دو گولے تھے، تمھارے گولے سے ہر لحاظ سے مماثل۔ تمھارے اس گول نما یوسف کو، آخر کار، اپنے برادرانِ گم گشتہ مل گئے تھے۔ ان دونوں پر تمھارا حق تھا، لیکن دونوں تمھارے حصے میں تب تک نہیں آ سکتے تھے جب تک یہ سادھو اپنی مرضی سے ان کو تمھارے حوالے نہ کرتا۔ سو تم نے اس سادھو کے پاس پڑاؤ ڈالا۔ اور اس کی گھات لگاتے لگاتے تم نے اپنی شیشی سے برانڈی پی۔ نشہ آ گیا، اور نشے پر نیند کا جال بچھ گیا۔ تم سو گئے اور صبح، جب دو ٹھوس اشیا کے گرنے کی آواز آئی، تم نیند سے چونک اٹھے۔ اس سورگ واسی سادھو نے ہاتھ کھولے تھے اور زندہ دھرتی کو اپنے گولے عنایت کیے تھے۔ تم نے ان کو اٹھا کر چکیلی پنیوں سے ڈھانپا اور اپنے فہم کے انڈے سے ملوایا۔ تینوں گولے آپس میں گھل مل گئے اور ان میں آئندہ وارداتوں کے جلوے دکھنے لگے۔

گولے تمھیں سحاب کی سگائی اور شادی کی خبر دے رہے ہیں۔ وہ نیوی کے ایک درمیانہ قد اور واجبی شکل و صورت کے نوجوان افسر کے ساتھ شادی کرنے پر مجبور ہو جائے گی، جو نہ اس کی الفت، نہ اس کے حسن کے لائق ہے۔ گولے تمھیں ہوشیار کر رہے ہیں۔ آل انڈیا ریڈیو کی طرف مت جاؤ! وہاں تمھارے نگرانوں نے تمھارا استعفیٰ نامہ تیار کیا ہوا ہے جو صرف تمھارے ہزیمت خوردہ دستخط کا محتاج ہے۔ گولے تم کو ایک لمبا سفر دکھا رہے ہیں۔ میراسین کا بنگال تمھارے انتظار میں ہے۔ شانتی نکیتن یونیورسٹی میں گورودیو کے چرن تمھاری قدم بوسی کے متمنی ہیں۔ ان چرنوں کے بیچ ایک در کھلا

ہے جہاں سے تم لنکا اور تبت جیسی دور افتادہ کشوروں میں داخل ہو جاؤ گے۔

اور ایک دن، گولوں پر ایک الگ منظر نمودار ہو رہا ہے۔ ایک حسین شہر کے ہزار چراغ ان گولوں کے بوسے پر جھلملا رہے ہیں۔ یہ شہر پورے سال ایک عی زت سے آشنا رہتا ہے۔ یہ شہر سمندر کے ہونٹوں اور سرگوشیوں سے مس ہوتا رہتا ہے۔ یہ شہر نسل نسل کے لوگوں کا آشیانہ ہے۔ یہ شہر اپنے پیٹ میں ایک فلمستان پالتا ہے۔ یہ شہر روز نئے گیت، نئے مکالمے اور نئی تصویریں اگلتا ہے۔ اور تم اچانک اس شہر کو سدھارنے کا ارادہ باندھ لیتے ہو۔ اب، نہ جانے کیوں، تمھارے لیے اس بمبئی شہر کے فلمستان میں اپنا مقام بنانا ضروری ہو گیا ہے۔

23

بمبئی شہر کے آوارہ بچے ہر صبح تمھاری طرف پتھر پھینک پھینک کر تمھیں نیند سے اٹھاتے ہیں۔ یہ لاوارث اور بچپن کے بازیچوں سے محروم بچے کتنے بے ڈھب ہیں! اور یہ دل جلے تمھارے اس بے گھر اور بے پیر جسم پر کتنی شدت سے اپنی بھڑاس نکالتے ہیں! تم پتھروں کی بارش میں فٹ پاتھ سے اٹھتے ہو، اور ساتھ ہی وہ برساتی اٹھاتے ہو جو کہ ہر رات تمھیں اس میلی فٹ پاتھ پر ایک بستر کی تمام آسائشیں فراہم کرتی ہے۔ پھر تم برساتی کو ٹٹول کر تسلی کرتے ہو کہ فہم کے تینوں انڈے جیبوں میں محفوظ ہیں۔ تم ان کو کھو کر مزید مصیبتوں میں پھنس جاؤ گے۔ اور چونکہ سب انڈے ادھر محفوظ ہیں، تم انھیں باری باری جیبوں سے نکالتے ہو اور، ایک کلاکار کی مہارت کے ساتھ، ہوا میں اچھال اچھال کر جوہو بیچ کا رخ کرتے ہو۔ جوہو بیچ اس پرشور اور خاردار شہر کی واحد آرام گاہ ہے۔ وہاں کی ریت شروعات سے تمھارے جسد خاکی پر بہت مہربان ہوتی ہے۔

بمبئی شہر نے تمھیں کچھ ہی دنوں میں کلّی طور پر نادار بنایا۔ تم ایک خانہ بدوش ہو جس کے پاس کوئی خیمہ نہیں ہے۔ ایک اہل قلم ہو جس کے ہاتھ میں قلم نہ قرطاس ہے۔ ایک شرابی ہو جس کی جیب میں پوّا بھی نہیں ہے۔ تم کو اب تک یہاں ایک ہی چیز حاصل ہوئی ہے: وہ برساتی جو کہ منٹو نے تمھیں تحفتاً دی ہے۔ منٹو کے بڑے احسان ہیں تم پر۔ اس نے، کشمیری ہونے کے ناتے تمھاری بہت مدد کی ہے۔ تعلقات لڑا کر تمھیں دو فلمی گانوں کی فرمائش عنایت بھی کی ہے۔ ایک عنقریب شوٹ ہونے

والی فلم کے لیے ایک بھجن اور ایک شرابی گانا چاہیے تھے۔ تم ان کو بھگوان کی کرپاؤں اور شراب کی برکتوں کے بغیر کیسے لکھتے؟ تم نے خواہ مخواہ ان کے بول ٹھونک دیے اور فلم کے پروڈیوسروں نے ان گانوں کو ردّی قرار دے کر تمھیں معاوضہ دینے سے انکار کیا۔

کیسے کیسے تاباں درخشاں خواب تمھیں اٹھا کر یہاں لائے ہیں لیکن ان کی تعبیر یہاں ممکن نہیں۔ اس شہر میں پہلے سے ملک کے ڈھیروں طالع آزما قلم کار بیٹھے ہیں۔ فلمستان میں دلّی، لاہور اور حیدرآباد کے بیسیوں مکالمہ نویس کام کرتے ہیں۔ کام تمھیں نہیں ملا۔ اور چونکہ بمبئی نے پہلے ہی شہر کے سستے ٹھکانوں پر قبضہ جما رکھا تھا، تم کو کوئی بسیرا نصیب نہیں ہوا۔ سو تم نے سڑکوں پر اپنی برساتی کی سیج بچھانی شروع کر دی۔

24

بمبئی نے تمھیں واقعی ذلیل کیا۔ لیکن بمبئی نے تمھیں، ساتھ ہی، شرابوں اور تن آسانیوں سے نجات دلائی۔ یہاں، تمھاری تفریح صرف جوہو بیچ کی سیر سے ہوتی ہے، کیونکہ جوہو بیچ پر، مخملی ریت کی سفید قالین اور سمندر کا لہریں مارنے والا درشن تمھیں مل کر وہ لذتیں دیتے ہیں جن کے سامنے نشہ اور مشت زنی حقیر اور رائیگاں ہیں۔ اور ان لذتوں تک رسائی کتنی آسان ہے! بمبئی کی سب سڑکیں سمندر کی سمت گامزن ہیں۔ تم ان سڑکوں پر قدم رکھتے ہو اور سڑکیں خود بخود تمھیں جوہو بیچ تک پہنچا دیتی ہیں۔

کچھ ایسے سمندر ہیں جو کہ اپنے ناظرین کا دھیان کھینچنے کے لیے ایک حسین دوشیزہ یا ایک متنفر مجذوب کا بھیس دھار لیتے ہیں۔ لیکن جوہو بیچ کا سمندر کسی طرح کے دکھاوے کا قائل نہیں۔ وہ ایک بے رنگ سا کینوس ہے، جس کی حدود میں ایک ابدی فنکار نے دور و نزدیک کی چیزوں کو یکجا کیا ہے۔ اس تصویر میں افق کے مسافر بادبان ساحل کی سنکھوں سے الجھ گئے ہیں اور پانی کے حباب آسمان کی رفعتوں پر آویزاں ہو گئے ہیں۔ رات کو جوہو بیچ ایک تیرہ و تاریک مووی ہال معلوم ہوتا ہے۔ یہاں ایک ہی فلم، متلاطم اور یکساں، لگی ہوئی ہے۔ ٹکٹ کی خرید سے تمھاری طرح کے بے گھر افراد مستثنیٰ ہیں۔ شو مفت اور لافانی ہے۔ اور اس لافانی شو کے دوران، آہستہ آہستہ، تمھاری آنکھوں میں، تمھاری

Scanned with CamScanner

اجڑی ہوئی دھنسی ہوئی مجروح آنکھوں میں، امن اور آشتی کے پُرشفا قطرے ٹپکنے لگتے ہیں۔

آج دوپہر کی ملائم دھوپ تمھیں آرام کا لالچ دیتی ہے۔ تم جوہو بیچ کی ریت پر اپنی برساتی کی سیج بچھاتے ہو اور اس سیج پر دراز ہو جاتے ہو۔ پھر، ردگرد ریت کے ذرے آپس میں بولنے لگتے ہیں اور چیونٹیوں کی طرح کلبلانے لگتے ہیں۔ ان کے ہزاروں منھ تمھاری بوٹی بوٹی نگلنے پر تل گئے ہیں۔ تمھاری برساتی تمھیں بڑی مشکل سے ان بھوکی مخلوقات سے محفوظ رکھتی ہے۔ کچھ ذرے برساتی کو چیر کر تمھیں نوچنے لگتے ہیں۔ خارش ہو رہی ہے۔ لیکن دھوپ اپنی لوریاں سنا سنا کر تمھاری روح کو سلا چکی ہے۔ تمھارا تن حامل ہو رہا ہے اور تمھاری روح تمھارے تن سے غافل ہوئی ہے۔ اب وہ ایک حنوط شدہ لاش ہے۔ تمھاری میت لاوارث ہے۔ صرف تمھاری زبان زندہ ہے، جو کہ کچھ بے گھر بچوں کو صدا دے رہی ہے۔ یہ شاید وہی سویرے کے پتھر پھینکنے والے شرارتی بچے ہیں۔ وہ تمھاری طرح جوہو بیچ پر ستانے آئے ہیں۔ تم ان شاطروں سے ایک مہربانی کے طلبگار ہو۔ تم ان سے تمھاری میت دفنانے کی منتیں کرتے ہو۔ نہ جانے کیوں، ان بے رحموں کے دل یہ منتیں سن کر پسیج جاتے ہیں اور جلدی ہی ان کی ایک صف تمھارے سامنے بندھ جاتی ہے۔ سب اپنے چھوٹے چھوٹے ہاتھوں سے تمھاری میت کو ریت سے ڈھکنے لگتے ہیں، اور جب تمھاری میت ریت میں پوری طرح غائب ہو چکی ہے، سب بچے دوڑ کر یکدم جوہو بیچ کی سمندری ہواؤں میں گھل مل جاتے ہیں، اور اتنی جلدی کہ تم ان کا شکریہ ادا کرنے سے معذور رہتے ہو۔ تم چند گھنٹوں کے لیے اپنی قبر کے آسرے میں نیند کرتے ہو اور جب شام ڈھلتی ہے، تم اس آسرے سے اٹھنے پر مجبور ہو جاتے ہو۔ تم اپنی ریتیلی برساتی کو اوڑھ کر شہر کی مسافتیں طے کرنے لگتے ہو۔ تمھارے ہونٹ، جو چند گھنٹوں کے لیے قبر کی ٹھنڈک میں سکڑ رہے، اب جلنے لگے ہیں اور ایک نراش سا استفسار، ہر شام کی طرح، ان ہونٹوں کی دہلیز پر وارد ہوتا ہے۔ "آج کی رات کس فٹ پاتھ پر گزاری جائے گی؟"

ٹھیک اس وقت جب تم جوہو بیچ پر اپنی قبر کی ٹھنڈک کا مزہ اٹھا رہے ہو، ایک آشنا فرد تمھاری ریتیلی میت پر اپنا سایہ بچھا دیتا ہے۔ وہ تمھارا دوست اختر ہے، جو کہ تمھاری خبر لینے پونا سے آیا ہے۔ تم دونوں کی دوستی آل انڈیا ریڈیو کے دنوں سے قائم ہے۔ اس نے مختلف قلم کاروں کی زبانی تمھاری نادریوں کی داستانیں سنی ہیں۔ اس نے یہ بھی سنا ہے کہ تم جوہو بیچ میں ہر سہ پہر خود کو دفن کراتے ہو۔

Scanned with CamScanner

وہ تمھیں اپنے ساتھ پونا لے جانے کے لیے آیا ہے، کیونکہ پرسوں وہاں پر یک آل انڈیا مشاعرہ ہونے والا ہے جس میں دورِ حاضر کے کئی نامی گرامی شعرا شرکت کریں گے۔ تمھیں بھی شرکت کرنی چاہیے۔ تم اس طرح تھوڑی سی شہرت کماؤ گے۔ تمھاری تقدیر کا رخ اس مشاعرے کے ذریعے بدل سکتا ہے۔ تم اگر وہاں اپنے جوہر کا مظاہرہ کرنے میں ناکام ہوئے تو مدت مدید تک تمھیں نہ روزگار، نہ روزگار کی امید نصیب ہوگی۔

25

پونا میں تم کو دو دن ہوئے ہیں۔ مشاعرہ آج شام کو ہونے والا ہے۔ تم نے پروگرام بنایا پونا کی اجنبی سڑکوں پر شام تک گھومنے کا، اور گھومتے گھومتے تمھاری ملاقات پونا کے اندرون شہر کے ایک دروازے پر عبدالحمید عدم سے ہوتی ہے۔ عدم بھی آج کے مشاعرے کا مہمان ہے اور اس نے اپنی طرف سے پروگرام بنایا شراب خانوں کی شام تک سیر کرنے کا۔ تم دونوں ایک دوسرے سے زیادہ آشنائی نہیں رکھتے ہو۔ لاہور میں ادبی دنیا کے دفتر میں تم دونوں کی دو بار ملاقات ہوئی ہے۔ لیکن تم دونوں مے نوشی اور آوارگی میں ماہر ہو۔ اور چونکہ عدم کو ایک ہم سبو کی اشد ضرورت ہے، وہ تمھیں اپنے ساتھ مے خانوں کی سیر کرنے لے جاتا ہے۔ پہلے مے خانے پر وہ بیئر کے دو قدحے منگواتا ہے، اور ایک ہی گھونٹ میں اپنا قدحہ خالی کر جاتا ہے۔ تم استفہامیہ نگاہوں سے اپنے قدحے کو ملاحظہ کرتے ہو۔ تم سوچ رہے ہو: ''کیا میرے لیے اس مشاعرے سے پہلے شراب پینا مناسب ہے، جہاں میرے مقدر کا فیصلہ ہو سکتا ہے، اور وہ بھی جب مجھے پینے کی عادت نہیں رہی؟'' عدم تمھارا تردد بھانپ رہا ہے۔ وہ تمھیں دو شعر سناتا ہے:

سبوئے صہبا اچھال ساقی کہ دعوتِ ساز دے رہے ہیں
شفق کے ٹھہرے ہوئے سفینے، افق کے ہنستے ہوئے کنارے
نہ میں نے دی دعوتِ شبانہ، نہ تیرے انداز مجرمانہ
اتر رہے ہیں شراب خانے میں کس کی ترغیب پر ستارے

یہ دو اشعار کافی ہیں۔ تم اپنا ہاتھ اٹھا کر یک زوردار آواز کے ساتھ بیئر پینے لگتے ہو۔ نشہ فوراً چڑھ جاتا

Scanned with CamScanner

ہے۔ اب ستاروں کو اپنے آسمانی آشیانوں کو چھوڑ کر تمھارے قدحے میں اترنے میں کوئی عار نہیں ہے، اور سب تمھاری شراب میں آکر باری باری بیس پچیس کو کبوں کو جنم دے رہے ہیں۔ تمھارے قدحے میں کہکشاؤں کی فراوانی ہے۔ تمھارے قدحے میں ایک سیال کائنات موجزن ہے۔ اس کائنات کو جلدی جلدی اپنے حلق سے اتارو، ورنہ تم اس میں غرق ہو جاؤ گے۔

مدیر جھوم جھوم کر مشاعرے کے اسٹیج پر چڑھ رہا ہے۔ تم ڈول ڈول کر اس کا پیچھا کر رہے ہو۔ اور تم دونوں اسٹیج کے پچھلے حصے میں بیٹھ جاتے ہو۔ نامی گرامی شاعر آگے ہیں، لیکن ان کے ہجوم کے آر پار سامعین تم دونوں کی حالت زار دیکھ سکتے ہیں۔ تم دونوں کی ہچکیاں لگی ہیں۔ تم دونوں کسی کسی وقت سے قے کر رہے ہو۔ استاد نامی گرامی شاعروں کی صف میں بیٹھا ہوا ہے۔ وہ مڑ مڑ کر تمھاری شکل دیکھ رہا ہے۔ اس کی آنکھیں غصے سے سرخ ہوئی ہیں۔ تمھیں شرمندہ ہونا چاہیے۔ اس اہم مشاعرے سے قبل پیامت سب نہیں تھا۔ لیکن شرمندہ ہونے کو تمھارا جی نہیں چاہتا ہے۔ نشے نے تمھاری دبی ہوئی قوتوں کو بہت بھڑکایا۔ دنیا کے قوے اس وقت تمھارے لیے ہیچ ہیں۔ تم اس دم کچھ بھی کر سکتے ہو۔ تمھارے اس میں نہ روک، نہ تامل ہے۔ تمھیں کوئی بڑی شرارت کرنی ہے، اس دنیا اور اس کے نامی گرامی بے مروت اور گستاخ شاعروں سے بدلہ لینے کے لیے۔ آج تم بدلہ لینے کے بعد ہی نشے کی نیند سوؤ گے۔

تم شعرائے ہجوم پر ایک نظر ڈالتے ہو۔ ان کو دیکھ کر تمھارا جذبۂ انتقام شدید تر ہو رہا ہے۔ یہ شعرا تختوں کے سلطان نہیں ہیں، وہ نظریوں کے غلام ہیں۔ فیض مرکزیت کا خاکروب ہے، جوش جاگیرداریت کا خادم اور جگر رجعت پسندی کا بردہ۔ اور یہ غلاموں کی طرح نادان اور ریاکار ہیں! کوئی فٹ پاتھ پر ایک رات بھی گزارے بغیر گلی کوچوں کے غربت زدوں کے دکھڑے سناتا ہے، کوئی اپنے حسن نو مردوں کا تصور میں اکر جنق لگانے کے بعد جذبۂ عشق کی پاکیزگی کی تعریف کرتا ہے۔ کوئی شراب کے تجربات سے ناشناس ہو کر مے نوشی کے محاسن بیاں کرتا ہے۔ تمھیں ان پر غصہ بہت چڑھا ہوا ہے، اور اس سے زیادہ غصہ تمھیں ان خرد ماغ سامعین پر آیا ہے جو ان غلاموں کی خرافاتوں پر سر ہلانے پر مصر ہیں۔ اور جب، بہت دیر بعد، صدرِ مشاعرہ تمھارا نام لیتا ہے، تم ایک انتقامی شرارت کا دو منصوبہ بنائے اسٹیج کے اگلے حصے میں بیٹھ رہے ہو، سامعین کے بالمقابل۔ پھر تم اپنی پیٹھ گھما کر،

ان نادیدہ سامعین سے روگرداں ہو جاتے ہو اور ایک سپاٹ آواز میں ایک پرانی غزل سنانے لگ پڑتے ہو:

نگری نگری پھرا مسافر، گھر کا رستہ بھول گیا
کیا ہے تیرا، کیا ہے میرا، اپنا پرایا بھول گیا

نامی گرامی شعرا سب تمھارے سامنے ہیں۔ تم ان سے غزل کے بے نیاز انداز میں مخاطب ہو رہے ہو، اور یہ زود رنج افراد تمھاری اس بے نیازی پر بہت کڑھتے ہیں۔ یہ بے نیازی ان کے لیے یک ناگوار سی للکار ہے۔ سب دم کے دم میں تمھارے محتسب بن بیٹھے ہیں۔ خشم ان کی آنکھوں کی درزوں سے جھانک رہا ہے۔ لعنتیں ان کے لبوں کی منڈیروں پر رینگ رہی ہیں۔ تمھیں اس وقت بہت لطف آ رہا ہے۔ شراب کا سادہ سا نشہ مفتوح ہوا ہے۔ معتوبیت اور ملعونیت کی عمیق سرشاریاں میدان جیت گئیں، اور تم ایک فتح مندانہ مسکراہٹ کے ساتھ اپنی غزل کا آخری شعر سناتے ہو:

سوجھ بوجھ کی بات نہیں ہے، من موجی ہے مستانہ
لہر لہر سے جا سر پٹکا، ساگر گہرا بھول گیا

پھر تم اٹھ کر اسٹیج کے پچھلے حصے کی طرف لوٹ رہے ہو۔ عدم، فرش پر دراز ہو کر، شرابیوں کی سیہ و نیند میں خراٹے لے رہا ہے۔ تم اس کے پاس بیٹھ کر سامعین پر نظر دوڑاتے ہو۔ اور تم کیا دیکھتے ہو؟ سامنے سینکڑوں مٹھیاں تمھارے خلاف اٹھ گئی ہیں۔ تمھاری بے حس پیٹھ اور بے پروا آواز نے مل کر پونا کے صاحبانِ ذوق کی توہین کی ہے اور وہ اپنے تہذیب و تمدن سے دستبردار ہوے ہیں۔ قریب ہے کہ وہ تم سے نمٹنے کے لیے ایک انتہا پسند فرقہ وارانہ تنظیم کو تشکیل دے جائیں۔ ان کی بھنچی ہوئی مٹھیوں کی دسترس میں دھمکیوں کے خنجر ہیں، گول گول آنکھیں دھتکاروں کی حنا میں رنگی ہیں، ان کی زبانیں گالیاں بک بک کر خشک ہوئی ہیں۔ اور تم نوٹ کر رہے ہو کہ ان کی ساری گالیوں میں سب سے انوکھی اور سب سے کٹیلی "پاکستانی!" کی گالی ہے جولائی 1947 کا مہینہ ہے۔ ہندوستان حاملہ ہے۔ پاکستان ایک ماہ بعد اس کے پیٹ سے نکلنے والا ہے۔ اس اولاد کے عنقریب تولد کا اعلان کے فوراً بعد ہندوستان کے باشندوں میں پھوٹ پڑ گئی۔ باہمی نفرتیں بڑھ گئیں اور، خونی بلووں اور فسادوں کو ملک کی بساط پر مہروں کی طرح چھوڑ کر، ایک منزل سے دوسری تک پھیل گئیں۔ پنجاب سے

Scanned with CamScanner

لبھاتے دیہات انتشار کی نذر ہو گئے۔ دلی شہر آگ کی لپیٹ میں آ گیا۔ کلکتہ غارت ہو گیا۔ اور قیاس کہتا ہے کہ بمبئی شہر بھی نرغے میں آنے والا ہے۔ بمبئی آخر کار نرغے میں آ گیا۔ یہاں کے ہندوستانی ایک دوسرے کو ''کتوے'' اور ''کافر'' جیسی گالیاں دینے لگے ہیں۔ پھر شہر کے کونے کونے سے جنگ اور لوٹ مار کا دھواں اٹھنے لگا ہے۔ اور شہر کی نالیوں پر آہستہ آہستہ، دوپٹے، پگڑیاں، لنگوٹ اور مقدس کتابوں کے اوراق کشتیاں بن کر بہنے لگے ہیں۔ ایک فہم کے انڈے نے تمھیں، کئی سال پہلے، فساد اور قتل ہائے عام کے جلوے دکھائے تھے۔ سب جلوے حقیقت بن گئے۔ شہر کے پڑھے لکھے مسلمان فسادوں اور دنگوں سے بھاگ کر پاکستان کی تا حال فرضی سرحدوں کی طرف ہجرت کر رہے گئے ہیں۔ لاہور، ملتان یا کراچی ان کی متوقع پناہیں ہیں۔ تم ہجرت کے لیے تیار نہیں ہو۔ تم یہاں سے نہیں جاؤ گے۔ تمھیں پاکستان جانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ لاہور اور ملتان ماضی کی دو رایگاں یادیں ہیں۔ کراچی ایک بے آباد بستی ہے۔ تینوں شہر ایک بے رونق ریاست کے نگینے بننے والے ہیں جہاں نہ مندر رہ جانے ہوں گے۔ یہاں، بمبئی میں، مومن اور بت پرست ایک ہی ٹھیکے میں شراب پیتے ہیں اور مندر اور مسجد دیکھنے میں بالکل مماثل ہیں۔ یہاں کفر اور ایمان کا سامان برابری سے موجود ہے۔ یہاں سمندر سب کا حق ہے اور ساحل سمندر سب کا بسیرا۔ یہاں کی ریت میں تمھاری قبر کے لیے بہت گنجائش ہے۔ یہاں کی سڑکوں میں تمھاری راتوں کے لیے جگہ ہی جگہ ہے۔ اس افراط سے تم کیسے دور ہو سکتے ہو؟ پاکستان کیوں جاؤ گے؟

قسمت کی ستم ظریفی دیکھو کہ وہی ہندوستان، جو کہ اکھنڈ ہوتے ہوئے تم کو نہ نوکری، نہ کام دینے کو تیار تھا، اب تقسیم ہونے کے بعد تم کو پاکستان کی طرف ہجرت کرنے والے قلم کاروں کے ادھورے کام سونپنے پر مصر ہے۔ وہی تقسیم ملک جس کے تم خلاف تھے، تمھیں ایک نئے آغاز کا موقع مہیا کر گئی۔ راتوں رات فلمستان کے پروڈیوسر تم سے گیتوں اور مکالموں کی فرمائش کرنے لگے۔ اور حال ہی میں ایک اسکرپٹ مکمل کرنے کی ذمہ داری تمھارے سپرد ہوئی جس کے چالیس صفحے لاہور کے ایک قلم کار نے اپنی ہجرت سے پہلے لکھے تھے۔ اسکرپٹ ایک بڑے بجٹ کی فلم کا ہے جس کا نام راز ہے۔ راز کی کہانی بے سود ہے اور اس کے مکالمے پھیکے ہیں۔ تین ہفتوں تک تم جوہو بیچ کی ریت پر سیر کرتے ہوئے اسکرپٹ لکھتے ہو، اور ان تین ہفتوں کے اثنا میں تمھاری محنت شاقہ فلم کی کہانی

Scanned with CamScanner

کو ایک روسی ناول کی طرح پرپیچ اور اس کے مکالموں کو جاندار بناتی ہے۔ داز کے پروڈیوسر نے تمھارا اسکرپٹ پڑھنے کے بعد تمھارے کام کو بہت سراہا۔ شوٹنگ کی تیاریاں فی الفور شروع ہوئیں۔ پھر شوٹنگ کے پہلے دن تم کو فلمستان بلایا گیا اور تمھارے سامنے سیٹ پر، ایک شبھ آرمبھ کے لیے، ایک ناریل پھوڑا گیا۔ فلم کا ڈائرکٹر بھی وہاں موجود تھا۔ اور تمھاری شکل وصورت اور بھیس اس کو اس قدر پسند آئے کہ اس نے تم کو اپنی فلم میں کاسٹ کرنے کا فیصلہ کیا۔

تم کو اس فلم میں ایک سادھو کا کردار نبھانا ہے۔ تمھارا کردار دو یا تین مناظر میں جلوہ خیز ہے اور اس کے مکالمے نہایت مختصر ہیں۔ ایک منظر میں تم کسی چٹان پر تپسیا میں دیکھے جا رہے ہو۔ چٹان کاغذ کی بنی ہے اور ہر دم تمھارے وزن سے گرنے کے در پے۔ پیچھے کسی ناتجربہ کار مصور کے ہاتھ کا بنایا ہوا ابر آلود آسمان ہے، اور سامنے ایک بھٹکی ہوئی اداکارہ لاچار نظروں سے سیٹ کی مصنوعی ویرانیوں میں اپنا راستہ ڈھونڈ رہی ہے۔ وہ تم کو دیکھ کر پکار رہی ہے۔ تم اپنے عالم استغراق سے نکل کر گونج دار آواز میں کہتے ہو: ''اے بھٹکی ہوئی کنیا، اس راہ کے انت میں ایک آشرم ہے۔ وہاں ترنت آ سرا لو۔ اس دیس کی بلاؤں اور گھنڈوں کا کوئی بھروسا نہیں۔'' تمھاری آواز کی وسعت اور گمبھیرتا سن کر سیٹ کے تمام لوگ حیرت زدہ تالیاں بجانے لگ پڑتے ہیں۔ تم کو ان کی حیرت دیکھ کر تعجب ہو رہا ہے۔ تم نے یہاں اداکاری کے کون سے جوہر دکھائے؟ یہ کردار نبھانے کے لیے تمھیں تکلیف کرنی پڑی صرف اپنی برساتی اتارنے کی، کیونکہ تم قدرتی طور پر ایک سادھو ہو۔ ایک ایسا مادہ تمھاری سرشت میں ازل سے موجود ہے جس کے لامکانیت اور لازمانیت سے بڑے گہرے تعلقات ہیں۔ نقل مکانیاں، زندگی کے نشیب وفراز اور ناانصافیاں اس مادے کو کریدنے کی سعی کرتے رہے، لیکن وہ ثابت اور سالم رہا، اور فلمستان میں آخرکار تمھاری کامیابی کا سبب بن گیا۔

اور ایک روز، جب تمھاری شوٹنگ ختم ہوئی ہے اور تم اپنے فہم کے انڈوں کے ہمراہ فلمستان سے رخصت ہونے والے ہو، اچانک ایک تیکھے تیوروال نوجوان تم سے ملنے آتا ہے۔ وہ پارسیوں کی تھیٹر کمپنی کا ہدایتکار ہے۔ کمپنی کے انگریزی اور گجراتی بولنے والے اداکار آغا حشر کاشمیری کے رستم اور سہراب کا ریہرسل کر رہے ہیں، اور ان کی تربیت یافتہ اور تہذیب ناآشنا زبانیں اس ڈرامے کے اردو مکالموں کو ادا کرنے سے اب تک قاصر ہیں۔ ان کو ایک ٹیوٹر کی ضرورت ہے۔ تمھارا

Scanned with CamScanner

شائستہ لہجے اور تمہاری زوردار آواز ان کی نادانی کی تاریکیوں میں ایک مشعل راہ بن سکتے ہیں۔ تم کو اپنی مہارت کا مناسب معاوضہ ملے گا۔ تم اس نوجوان سے وعدہ کرتے ہو کہ فلم کی شوٹنگ ختم ہوتے ہی تم اس کی کمپنی کے لیے کام کرو گے۔

26

شوٹنگ کا آخری دن ختم ہو گیا ہے۔ پروڈیوسر اور ڈائریکٹر نے تم کو نوٹوں کی دو چار گڈیوں سے نوازا ہے، اور یہ راحت افزا نتیجہ ہے کہ تم فلمستان کے باہر ایک ٹھیلے پر جاتے ہو اور بیئر کا ایک بڑا کریٹ خریدتے ہو۔ پھر تم بس میں سوار ہو کر، کریٹ کو گود میں اٹھا کر، جوہو بیچ کی طرف روانہ ہو جاتے ہو۔ خدا نے آج کا دن جشن اور خوشی کے لیے بنایا ہے۔ لیکن بس میں آٹھ دس ریش دار ٹوپی دار حضرات رونق افروز ہیں۔ ان کی ہستیاں شیروانیوں کی تنگی میں پھنسی ہوئی ہیں، اور ان کی خشمگیں نظریں تم پر مرکوز ہیں اور تمہاری خوشی اجاڑنے پر مصر ہیں۔ ان حضرات کے پہلو میں تھیلوں اور بوریوں کا ایک ہجوم ہے اور ان کے پیچھے برقع پوش مستورات کا ایک ہیبت زدہ طائفہ۔ مستورات کی گودوں میں چند شیر خوار بچے سو رہے ہیں۔ یہ قبیلہ پاکستان کے لیے روانہ ہوا ہے۔ تم ان قبیلے والوں کی خاموش توقعات پر ترس کھانے لگے ہو۔ کیا وہ ہندو بلوائیوں کی سینکڑوں غربالوں سے گزرنے میں کامیاب ہو جائیں گے؟ کیا وہ زندہ سلامت پاکستان پہنچ پائیں گے؟ کیا وہاں جا کر ان کی مرادیں پوری ہو سکیں گی؟ ان سوالوں کا جواب حاصل کرنے کے لیے تم جیب سے اپنا فہمیدہ ترین اندازہ نکالتے ہو، اور فوراً اس اندازے پر ایک حملہ مودار ہو رہا ہے۔ دو اسٹاپ آگے اس قبیلے پر کٹر ہندوؤں کی ایک ٹولی چڑھائی کرے گی۔ مردوں کی دراز ریشیں کلہاڑیوں سے مونڈ دی جائیں گی۔ عورتوں کے خوف زدہ برقعے بدنوں سے پھاڑ دیے جائیں گے۔ ان میں سے سونے کے دو سکے اور چاندی کے تین چھلے نکلیں گے۔ پھر بس نذر آتش کی جائے گی۔ تم ان پانچ وقت کے نمازیوں کو ان کے انجام سے کیسے آگاہ کرو گے؟ وہ بہادر اور نیک سیرت ہیں اور تمہاری طرح کے رندوں پر اعتبار کرنے کے روادار نہیں ہیں۔ بہتر ہے کہ تم اپنی جان بچاؤ۔ تم ڈرائیور کو آواز دیتے ہو۔ وہ بس روکتا ہے اور تم اپنا کریٹ اٹھا کر، بس سے اتر پڑتے ہو۔

Scanned with CamScanner

تمھیں اگلے روز کے اخباروں میں اس حملے کا مفصل تذکرہ ملے گا۔ تمھیں ان کو پڑھنے سے خبر ہوگی کہ تمھارے فرار کے آدھے گھنٹے بعد اس بس پر چڑھائی ہوئی ہے اور اب، بمبئی کے ایک گمنام روڈ کے کنارے، اس بس کا لاوارث ڈھانچہ اور اس کے مسلم مسافروں کے جلتے ہوئے پنجر، ایک باغِ ناآفریدہ کے درختوں کی طرح کھڑے ہیں۔ تم اپنے فہم کے انڈوں سے ڈرنے لگتے ہو۔ ان کی پیشین گوئیاں اس قدر درست ہیں کہ یقیناً وہ کسی روز تمھیں تمھاری موت کے مقام اور تاریخ کی اطلاع دیں گے۔ یہ اطلاع بیکار اور ناگوار ہے۔ اس سے بچنے کے لیے تمھیں اپنے خوفناک انڈوں سے دستبردار ہونا پڑے گا۔ یہ دستبرداری کب اور کہاں ہوگی؟ تقدیر تمھیں بتائے گی، تمھارے انتظار کے بعد۔

27

داز فلم کبھی ریلیز نہیں ہوئی۔ بمبئی، دلی اور کلکتہ کے سینما ہال کے مالک اس مہنگی فلم کی ریلیں خریدنے کے لیے تیار نہیں تھے۔ اور وہ انھیں کیوں خریدتے؟ ان پرآشوب دنوں میں فلم دیکھنے والے عوام اذیت زدہ اور فاقہ زدہ تھے، اور بے شمار سودی ہال سندھ اور پنجاب کے اداس برہنہ پا مہاجرین کے مسکن بن گئے تھے۔ سو داز کے پروڈیوسر نے اپنی فلم کی رائیگاں ریلیں دفتر کے پاتال میں جمع کرادیں، اور ریلیں اس سیلن زدہ پاتال میں گل سڑ کر غبار ہو گئیں۔ اس طرح، رفتہ رفتہ تمھاری زوردار آواز اور عجیب چال ڈھال کی واحد شہادت صفحۂ ہستی سے مٹ گئی۔

داز کے نہ ریلیز ہونے کی خبر سن کر تم قطعی رنجیدہ نہیں ہو۔ تم بہت دنوں سے اس فلم اور اس کے جھنجھٹوں سے بے نیاز ہو۔ داز سے تم نے اس دن قطع تعلق کیا جب تمھیں اپنی مکالمہ نویسی اور اداکاری کا معاوضہ ملا۔ اس دن تم نے ایک کمرہ کرائے پر لیا اور فٹ پاتھ کی کھردری راتوں سے عرصۂ طویل تک چھٹکارا پایا۔ کمرہ لینے کے اگلے روز تم نے ایک نئی نوکری شروع کی۔ تم رستم اور سہراب کی ریہرسل کے لیے پارسیوں کی تھیٹر کمپنی کے اردو ٹیوٹر بن گئے۔ تنخواہ اچھی ہے لیکن نوکری انتہائی محنت طلب ہے۔ ان گجراتی بولنے والے اداکاروں کا تلفظ درست کرنا جوئے شیر لانے سے کم نہیں۔ اردو کی تیز طرار شمشیر ان کی زبان سے گزر کر خود بخود دربر بن جاتی ہے۔ ان کی زبانیں 'ز' کے

Scanned with CamScanner

زخموں اور 'غ' کی عیبتوں سے ناآشنا ہیں۔ صرف 'ج' اور 'گ' ان سے ادا ہوتی ہیں اور 'غ' کی خراشیں ان کے لبوں پر آنے سے سراسر گریزاں ہیں۔ ان لبوں کی لاثانی گستاخیاں تم کو مایوس کر دیتی ہیں۔ لیکن کمپنی کی ایک پیاری اداکارہ کے لب ایسے ہیں کہ تم ان سے نیز سے میٹھے الفاظ سن کر لطف اندوز ہو جاتے ہو۔ اس کا گجراتی لہجہ تم کو ہوٹل کی ایک البیلی لڑکی کی یاد دلاتا ہے۔ سمونہ کی یاد اس پیاری لڑکی کے منہ اور گلے میں مضمر ہے۔ تم اس ہنس مکھ پیاری سمونہ پر فدا ہو جاتے ہو۔

لیکن ایک اور مرد اس اداکارہ پر فدا ہے۔ وہ مرد وشومتر دال ہے، کمپنی کا ہندی رائٹر۔ وشومتر جیسے اور مزاج کے لحاظ سے تمھاری ضد ہے۔ وہ خوبرو اور دراز قد ہے۔ وہ کئی دنوں سے اس پیاری اداکارہ کو اپنے دام میں لانے کی کوشش کر رہا ہے، اور اس کی کوششیں رنگ لانے لگی ہیں۔ اداکارہ پھنسنے والی ہے۔ وشومتر جلوت میں اس کے ساتھ ہر وقت بیٹھتا ہے، اور خلوت میں اس کے دونوں ہاتھ پکڑتا ہے۔ وہ اس کو ہر ریہرسل کے بعد بس سٹاپ پر رخصت کرتا ہے۔ وہ اس کا پتا اور فون نمبر حاصل کر لیتا ہے۔ چند دنوں میں وشومتر اس کے ساتھ سہاگ رات منائے گا۔ تم ایک دو بار عشق کی بازی ہار چکے ہو۔ لیکن تم اپنی ہار ماننے سے سخت انکاری ہو۔ آخر تمھاری ہی لغت میں 'شکست' 'عشق' کا مترادف کب تک رہے گا؟ تم اس اداکارہ تک رسائی پانے کے لیے اپنے رقیب سے کام لیتے ہو۔ تم وشومتر سے دوستی بڑھانے لگتے ہو۔ تم اس سے جھوٹ موٹ یورپ میں آ کر اس کی ہندی کی نظموں کی سراہنا کرتے ہو۔ وہ سفارش کرنے پر ادبی رسالوں میں اس کی بے معنی سی نظمیں چھپتے ہوئے دیکھنا چاہتا ہے۔ وہ اس پیاری اداکارہ سے تمھاری تعریف کرے گا۔ لیکن اداکارہ تم سے متاثر ہونے والی نہیں۔ وہ اس کے بعد چھوٹے میں صرف وشومتر کو دیکھنے کے قابل ہے۔ تم اپنی تحریروں سے اپنا ایمان کب تک خراب کرو گے؟ تم کو اپنی بے ایمانی پر شرم آ رہی ہے۔ لیکن تمھاری بے عقل اور بے غیرت ضد تمھیں کہاں لے جا سکتی ہے؟ تمھیں یقین ہے کہ دوپرو سے نے یہ رسیلی اداکارہ خاص طور پر تمھارے لیے بھیجی ہے، اور اس کا سودا ہونے سے کہ تم ناشکری کا مظاہرہ کرو گے۔

Scanned with CamScanner

28

تم دوبارہ شراب پینے لگے ہو۔ تمھاری نئی کمائیاں بیئر اور رم کی بوتلوں پر خرچ ہونے لگی ہیں۔ تم ہر رات بیئر اور رم کی بوتلیں خالی کر کے اپنے کمرے کے فرش پر بیہوش گر جاتے ہو اور ہر صبح نیند سے جاگ کر غمگیں آنکھوں سے الٹی کی وہ زرد اور سبز جھیلیں دیکھتے ہو جو کہ رات کو تمھارے ہونٹوں سے پھوٹ پھوٹ کر فرش پر پھیل گئی ہیں۔ پھر ایک دن، سویرے، آنکھیں کھولتے ہی تم اپنے پاجامے کو ٹخنوں سے ڈوری تک پیشاب سے تر پاتے ہو۔ اور تم اسی وقت شراب سے توبہ کر لیتے ہو۔ شراب نے تمھاری تذلیل میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔ اس نے تم کو انسانیت کی بلند ترین سیڑھی سے دھکیل کر سب سے نچلے اور میلے زینے پر گرا دیا۔ تم فوراً شراب کا نعم البدل ڈھونڈ لیتے ہو۔ اور نعم البدل تم کو فوراً مل جاتا ہے، اس سلفے کی شکل میں جو کہ سمندر کنارے کے ایک مزار کے دیوانے قلندر پیتے ہیں۔ تم ان سے ہر روز سلفے کے دو تین سگریٹ بھرواتے ہو اور ان سگریٹوں کو لے کر تم ان کا ماورائی دھواں پھونکنے کے لیے جوہو بیچ کا رخ کرتے ہو۔

جب تم ہوش و حواس میں ہو، سمندر تم کو ایک خاموش اور مدہوش کوزہ نظر آتا ہے۔ لیکن جب سلفے کا دھواں تمھارے لبوں کے راستے تمھارے من تن میں سرایت کر جاتا ہے، سمندر تم کو ایک پرشور اور پررونق خیابان معلوم ہوتا ہے جس پر تمھاری بھولی بسری ماں کے عاجز بلاووں کے جلو میں کرۂ ارض کے تمام بلاوے قافلہ بنا کر رواں دواں ہیں۔ یہ سب بلاوے سمندر پار کے مینارۂ بابل کے مکینوں کی جانب سے آئے ہیں۔ شلوکوں کی سنسکرت، ہائیکو کی جاپانی، ''گوالے کا سپنا'' کی فرانسیسی اور فاؤسٹ کی جرمن ان بلاووں میں گونج رہی ہیں، اور ہر زبان اس وقت تمھارے لیے قابلِ فہم ہوتی ہے۔ ہر لفظ ایک شفاف قطرہ بن گیا جس میں ہر قوم کے جذبات اپنے خالص ترین روپ میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ پھر سلفے کا خمار اچانک کافور ہو جاتا ہے اور ایک پل میں ساری زبانیں تمھارے لیے اجنبی ہو کر فضا میں گڈمڈ ہو جاتی ہیں۔ اور آخر ان سب کے مرکب سے ایک نرالی زبان پیدا ہوتی ہے۔ وہ وہی زبان ہے جو کہ لہروں سے ابھری ہوئی چار جل پریاں ساحل پر لوٹتے ہوئے آپس میں بول رہی ہیں۔ ان جل پریوں کا تعلق کونکن کے دیہات سے ہے۔ وہ اپنی ساڑھیوں تلے بلاؤز پہننا فضول

سمجھتی ہیں۔ بھگوان نے ان کو اتنے شاندار پستانوں سے نوازا ہے۔ وہ ان کو غیروں اور عزیزوں سے کیوں چھپا کر رکھیں؟ تم ان منافقت دشمن عورتوں کو رشک اور تحیر سے دیر تک تاک رہے ہو۔ ان کی بولیاں اور ان کی اٹھکیلیاں کتنی بے ساختہ ہیں' ان کی گول مول سانولی سی چھاتیاں جھاگ میں سے ابھرتے ہوئے کیسی بھلی لگ رہی ہیں! وہ اچھل اچھل کر گنتیں بھر رہی ہیں، اور ان کا یہ قدرتی رقص لہروں کی لے سے کتنا ہم آہنگ ہے' ان چھاتیوں کے حسن پر ڈھلتے سورج کی آخری کرنیں ٹوٹ رہی ہیں اور ٹوٹ کر ان پر اپنی ازلی چمک کی دودور مشعلیں بجھا جاتی ہیں۔ تم ان چھاتیوں کو اپنے ہاتھوں میں محسوس کرنا چاہتے ہو۔ لیکن پارسی اداکارہ کی یاد میں ایک زنجیر کی سخت گیری ہے۔ وہ یاد تم کو ضبط نفس پر مجبور کرتی ہے اور تم جوہو بیچ پر، ان ادھ ننگی جل پریوں کے سامنے، ایک خاموش اور ساکن تماشائی بن کر رہتے ہو، اس دو کوڑی کی اداکارہ کی وجہ سے، جو کہ یقیناً ایک نہ ایک دن وشومتر کے ساتھ ہم بستری کرے گی۔

29

ایک روز، جب تم جوہو بیچ کے کونکن کی جل پریوں کے سنان کا نظارہ کر رہے ہو، تم کو اپنے پیٹ میں ایک دھماکا سا محسوس ہو رہا ہے۔ پیٹ میں غدود کی توپیں کچھ سیال گولے اندھا دھند داغ رہی ہیں۔ اس طرح کا تجربہ تم کو پچھلے دنوں میں سلفہ پی کے کئی دفعہ ہوا ہے۔ تم نے سلفے کو اپنے دست کا محرک سمجھا۔ لیکن آج تم نے سلفہ نہیں پیا اور دست ایک خوفناک حد تک بے سبب لگ رہا ہے۔ آج کا دھماکا کچھ زیادہ زوردار ثابت ہوا ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے تمھارا قالب تمھارے اندرون کو خارج کرنے پر تُلا ہوا ہے، اور تم کو اسی وقت اور اسی مقام پر ہگنے کی شدید طلب ہو رہی ہے۔ لیکن جوہو بیچ، جس کی ریت تمھارا کفن بننے کے لائق ہے، اور جہاں شام ڈھلے کونکن کی پوتر جل پریاں نہاتی ہیں، کوئی مناسب مقام نہیں ہے۔ تمھارے پست پاخانے اس چھوٹے فردوس میں جگہ پانے کے حق دار نہیں ہیں، سو تم اٹھ کر کوئی قریبی بیت الخلا ڈھونڈنے کی ٹھان لیتے ہو۔ لیکن پاس میں بیت الخلا صرف وشومتر کے پورشن میں موجود ہے۔ یہاں صرف وشومتر کا بیت الخلا تمھاری ذلت کو غیر نگاہوں سے چھپا سکتا ہے۔

تم وشومتر کے پورشن کے دروازے پر کھڑے ہو اور بار بار دستک دے رہے ہو۔ وشومتر یقیناً

یقیناً اندر ہے، اس کی بھاری سانسیں اور مضطرب آہٹیں یہاں تک سنائی دے رہی ہیں، لیکن وہ نہ جانے کیوں تمھاری ہنگامی دستکوں سے غافل ہے۔ پھر تم اس کا نام پکار لیتے ہو، اور یکبارگی دروازہ کھل جاتا ہے۔ وشومتر تمھارے سامنے کھڑا ہے۔ اس نے عجلت میں اپنی کمر میں ایک دھوتی باندھی۔ کسی کے جنونی ناخنوں نے اس کے عریاں سینے کو نشانوں سے سجایا ہے۔ کسی کے آرزومند ہونٹوں نے اس کے ہونٹوں پر اپنا گلگونہ بچھایا ہے۔ کسی کے بے چین ہاتھوں نے اس کے سیدھے بالوں کو ایک بے ہنگم بھنور میں جکڑ دیا ہے۔ وہ تم کو سلام کر رہا ہے لیکن اندر آنے کی دعوت نہیں دے رہا ہے۔ وہ عجیب طرح سے جھینپ رہا ہے۔ وہ آنکھیں جھکا رہا ہے اور بائیں ہاتھ کی شرمسار انگلیوں سے اپنی زلفوں کے پیچ سلجھا رہا ہے۔ تم اس کے کاندھے پرے اس کے پورشن میں جھانک رہے ہو۔ اس پورشن میں یقیناً ایک عورت چھپی ہوئی ہے۔ لیکن اس کا چھپنا بیکار ہے۔ بستر کی درہم برہم شکنیں، اسکاچ کی ادھ خالی بوتل اور زنانہ عطر کی ہر سو پھیلی ہوئی مہک، سب ایک ساتھ بلند آواز میں اس کا وشیش راگ الاپ رہے ہیں۔ تم اس عورت کو اچھی طرح جانتے ہو۔ پارسی تھیئٹر کمپنی میں تم نے گھنٹوں اس کو تربیت دی۔ اس سے کچھ کہنا بیکار ہے۔ تم معنی خیز انداز میں سر ہلا رہے ہو اور مڑ کر سڑک کی طرف پلٹ رہے ہو۔ پیچھے وشومتر دروازہ بند کر رہا ہے۔ اب تمھارے سامنے دو امکانات ہیں: یا تم سڑک پر ایک کتے کی طرح ہگو گے، یا تم اپنے پاجامے کی واحد جوڑی کو اپنے دست سے میلا کرو گے۔ تم سیڑھیاں اترتے اترتے ان دونوں امکانات پر غور کر رہے ہو، اور اچانک، پورشن کی ایک کھلی کھڑکی سے ایک گفتگو کے چند الفاظ تمھارے کانوں تک آ رہے ہیں۔ تمھاری لاڈلی پارسی اداکارہ وشومتر سے پوچھ رہی ہے: ''وشوا ڈارلنگ، کون تھا؟'' اور وشوا، وہ گھٹیا اور مکار آدمی جس پر تم تھوکنا بھی اپنے شایانِ شان نہیں گردانتے ہو، جواب دے رہا ہے: ''میراجی تھا۔ وہ پاگل اکثر یہاں مجھے تنگ کرنے آتا ہے۔''

اب وقت آیا ہے اس گھٹیا آدمی سے بدلہ چکانے کا۔ انتقام کے ہتھیار تمھارے وہ تین قسم کے انڈے ہوں گے جن کی پیش گوئیاں ایک ہولناک باقاعدگی سے تھوڑے دنوں یا گھنٹوں میں پوری ہوتی ہیں۔ ان تینوں سے تم جلد ہی دستبردار ہو جاؤ گے۔ ان سے الگ ہو کر تم مستقبل کی مقررہ تباہیوں سے نابلد رہو گے۔ تم وشومتر کی کھڑکی سے تھوڑے فاصلے پر انتظار کرنے لگتے ہو۔ کوئی نہ کوئی فریبی

Scanned with CamScanner

کردار اس کھڑکی کے پیچھے کھڑا ہو جائے گا۔ وہ کھلی کھڑکی تمھاری حلیف ہے۔ اس نے تمھاری رسائی کو تمھارے سابقہ دوست اور سابقہ محبوبہ کی باہمی گفتگو تک ممکن بنایا۔ اب وہ ان دونوں پر تمھارے عتاب کا نزول ممکن کرے گی۔ پیچھے، پاخانوں کا سیلاب تمھارے ٹخنوں کی طرف رواں دواں ہے۔ لیکن تم اس سیلاب سے بالکل بے نیاز ہو، جیسے کہ وہ تمھارے کپڑوں اور بدن کو نہیں، بلکہ لنکا اور تبت کی دور دراز اقلیموں کو آلودہ کر رہا ہو۔ انتظار کے چند لمحوں کے بعد کھڑکی میں ایک ہیولا ابھر رہا ہے۔ وہ وشومتر ہے۔ ادھ ننگا، ہوس کے عرق میں شرابور، بے دم، بے خود اور بے ہودہ۔ تمھارا ہاتھ ہوا میں اٹھ رہا ہے اور باری باری، تین لوہے کے گولے، وشومتر کے حسین اور ترو تازہ چہرے پر پل پڑتے ہیں۔ وشومتر کے لبولہان منھ سے ایک چیخ اس کی چیخ نکلتی ہے اور وہ گرتے گرتے کھڑکی کی چوکھٹ سے غائب ہو جاتا ہے۔ پھر ایک دا ہیولا کھڑکی میں دکھائی پڑتا ہے۔ ہوس کے بستر سے اٹھ کر تمھاری محبوب پاری اداکارہ اپنے یار وشومتر کو بچانے آئی ہے۔ اداکارہ اس بستر کی چادر میں لپٹی ہوئی ہے۔ اس کے بال مجامعت کی آندھی سے الجھ گئے۔ اس کا غازہ بوسوں کی تپش سے پگھل گیا۔ وہ خود بخود تمھاری ضد میں آئی ہے، لیکن تمھارے پاس بد قسمتی سے اس وقت کوئی گولہ بچا ہوا نہیں ہے۔ آہورا مزدا نے اپنی مخلوق کو تمھارے انتقام کی مار سے بچا لیا۔

اور تمھاری پشت میں ایک پلید اور زخار سیلاب، تمھاری جھڑی پر قابو پانے کے بعد، تمھاری نوکیلی ہڈیوں کو چاٹنے لگا ہے۔

30

تمھاری صحت اس حد تک کیوں خراب ہوئی ہے، کنگ ایڈورڈ ہسپتال کے طبیب حضرات یہ سمجھنے سے قاصر ہیں۔ تم نے ان نیم حکیموں سے اپنی آتشک کا ذکر کرنے کی زحمت نہیں اٹھائی۔ اور ذکر کیوں کرتے؟ گر ان حضرات کو واقعی علم طب پر دسترس حاصل ہے تو وہ خود بخود تمھارے مرض کی تشخیص کر سکیں گے۔ ان کی رہبری کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے؟ تمھارا ہسپتال میں داخلہ کئی وارداتوں کا نتیجہ ہے۔ سب سے پہلے آتشک نے، سالہا سال، تمھاری رگوں کی طویل بھول بھلیوں میں ایک مقام سے دوسرے تک سفر کیا، اور جب اس کو باہر کا راستہ ملا تو وہ ایک بھیانک تیز رفتاری

Scanned with CamScanner

سے تمھارے بیرون کے ہر سرے تک پھیل گئی اور تم نحیف ہوتے گئے۔ اس نحافت سے فائدہ اٹھا کر، جراثیم تمھارے تن سے چپک گئے۔ تم کو پیچش ہوگئی، پھر زکام ہوگیا، پھر برون کائیٹس۔ تم نے بستر پکڑ لیا، اور جب تمھارا شاعر دوست اختر تم سے ملنے تمھارے کمرے پر آیا تو تمھارے کرتے پاجامے پر خون آلود پاخانوں کا میل تھا اور کھانسی سے تمھارا گلا چھل رہا تھا۔ کھانسی حلق سے اتر کر تمھارے سینے میں رچ رہی تھی اور تمھارا سینہ خود بخود کراہ رہا تھا۔ اختر نے تمھاری یہ حالت دیکھ کر تم کو زبردستی ہسپتال میں داخل کرایا۔

کنگ ایڈورڈ ہسپتال میں تم کو کامن وارڈ میں جگہ مل گئی۔ تمھارے آس پاس کم از کم اسی مریضوں کے بستر ہیں۔ وارڈ ان مریضوں کی الٹیوں اور بول و براز سے متعفن ہو رہا ہے اور ان کی کھانسیوں اور کراہٹوں سے گونج رہا ہے۔ تیماردار بڑی تعداد میں موجود ہیں جو ہر وقت شور شرابہ کرتے ہیں۔ لیکن تم جیسے تنہا آدمی کے پاس صرف ایک پرسانِ حال آتا ہے۔ وہ اختر ہے۔ اختر کبھی کبھی اپنی جوان بیوی ساتھ لے کر آتا ہے۔ وہ عام طور پر ساڑھیاں پہنتی ہے جن کے کنارے سے اس کی ناف کا سیاہ پیالہ جھانک رہا ہے۔ وہ تمھارے سامنے شرماتی ہے اور پلو ٹھیک کر کے اپنا پیالہ تمھاری ضدی نگاہوں سے چھپاتی ہے۔ عورت کی ناف کرۂ ارض سے اوجھل ہوئی ہے تو وہ کہیں اور نمودار ہو جائے گی۔ کسی ہندو مہترانی یا کسی عیسائی نرس کے سانولے پیٹ پر۔ تمھاری شہوت آلود آنکھیں نافوں کی مسلسل جویا ہیں۔ اس مرحلے پر آ کر آتشک تمھاری شہوت کو دبانے میں ناکام ہوئی ہے۔ اس کے برعکس، شہوت کو مہمیز لگی ہے۔ ان دنوں میں ہر عورت ملبوس ہو کر بھی تمھاری نظر میں برہنہ تن ہے اور یوں معلوم ہوتا ہے کہ ہر نسائی تن تمھارے بیمار تن کو جلانے، ورغلانے اور تڑپانے کی خاطر تمھارے گرد گھومتا ہے۔

اب بہت دن گزر رہے ہیں۔ طبیب حضرات تا حال تمھاری آتشک سے ناشناس ہیں۔ تم ان کے سامنے اپنی گولیاں لے رہے ہو اور اپنی خوراک کھا رہے ہو۔ تم کو یہاں پر نہ سگریٹ، نہ شراب ملتی ہے۔ تو پھر، تمھاری صحت کیوں نہیں بحال ہوئی ہے؟ تمھارا وزن کیوں گھٹتا جا رہا ہے؟ تمھاری کھانسی کیوں نہیں رک رہی ہے؟ تمھاری پیچش کیوں نہیں تھم رہی ہے؟ طبیبوں کے چہرے مجسم سوالیہ نشان ہیں۔ وہ نادانوں کے چہرے ہیں۔ ان کو تمھاری باقاعدہ بدپرہیزیوں کی خبر نہیں ہے۔ تم دراصل صحت

Scanned with CamScanner

پانی کے خواہاں نہیں ہو۔ تم اپنی گولیاں منھ میں رکھتے ہو، لیکن ان کو حلق میں اتارنے کے بجائے بیت الخلا میں تھوکتے ہو۔ تم اپنی ادھ کھائی میلوں کو باہر جا کر کوّوں کو چگاتے ہو۔ اور وہ پیسے جو کہ اختر تم کو دوائیاں خریدنے کے لیے دیتا ہے، تم ہسپتال کے ایک چالاک خاکروب کی پھٹی ہوئی جیب میں ڈالتے ہو۔ خاکروب ان کے عوض میں تمھارے لیے بازار سے میلے کچیلے ٹکے اور جراثیم سے پٹی پڑی پاؤ بھاجی لاتا ہے، اور تھوڑی مقدار میں سلفہ بھی۔ تم کتنے خوش قسمت ہو! اس ہسپتال میں تمھیں اپنے ساتھ تجربات کرنے کے لیے بے شمار سہولیات میسر آئی ہیں، اور یہ سبھی تجربات نئی نئی خودکشیوں کا ذائقہ، آہنگ اور تنوع رکھتے ہیں۔

31

تم روزانہ اپنے وارڈ کے بیت الخلا میں سلفہ پیتے ہو۔ تم بڑی دقت سے کھڑے ہوتے ہو اور کش لگاتے لگاتے اپنے پیروں کے درمیان غلاظت کا گول سوراخ تکتے ہو۔ سلفہ اپنے زور آور ہتھوڑے سے تمھارے شعور کی حسّی کیل کو بے دردی سے ٹھونکتا جاتا ہے، اور تم کو وہم ہو رہا ہے کہ تم اگر ہوشیار نہیں رہو گے تو تمھارا سارا شعور اس سوراخ میں گر جائے گا۔ اس سوراخ میں نہ پیشاب ہے نہ پاخانے، نہ نالیوں کی بھول بھلیاں ہیں نہ پانی کا تلاطم۔ یہ سوراخ خلا کا بے صوت اور پوپلا منھ ہے، اور خلا بھوکا ہے۔ تمھارے تن کے محسوسات اور من کی یادیں، تمھارے دل کی الجھنیں اور جگر کی چیا کیاں، سب اس کا ناشتہ بننے کے قابل ہیں۔ لیکن تم ان کو کیسے جانے دو گے؟ جب تم اس خطرناک سوراخ کے پاس ایک گھنٹے سے زیادہ گزار لیتے ہو، تمھارا خاکروب دوست تمھاری چنتا کرنے لگتا ہے، اور وہ تم کو وہاں سے اٹھا کر، اپنے کاندھوں پر ڈھوتے ہوئے، تمھارے بستر تک لے جاتا ہے۔

تم، اپنے بستر پر ڈھے کر، گھنٹوں تک، اپنی تمام زبانوں میں، دھرتی کے سارے دیدہ اور نادیدہ تماشوں کا تذکرہ کرتے ہو۔ تم بیک وقت اردو، ہندی اور انگریزی بولتے ہو، اور ایک حیرت انگیز روانی سے وہ پنجابی بھی بولتے ہو جس کے متعلق تم کو پہلے گمان تھا کہ وہ تمھارے دل و دماغ سے حذف ہو چکی ہے۔ آخر پنجابی تمھاری نہیں بلکہ تمھاری ماں کی بولی ہے: بولی اس لاچار ماں کی جو کہ اپنے فرزندِ ناخلف کی دگرگوں حالت اور ناگفتہ بہ مقام سے بالکل لاعلم ہے۔ اس کے فرشتوں کو خبر نہیں کہ تم آج

Scanned with CamScanner

کل بمبئی کے کنگ ایڈورڈ ہسپتال کے ایک بستر پر لیٹ کر، اونچی آواز میں، باقاعدگی سے چند آشنا بھوتوں سے ہم کلام ہوتے ہو۔

تم اکثر ایک پادری کے بھوت سے باتیں کرتے ہو۔ اس کے الفاظ شکستہ اور بریدہ ہیں۔ اس کا چہرہ سرخ اور مدوّر ہے۔ اس کی سانسوں میں گرجا گھروں کی شب گزیدہ بو رچی ہے۔ اس کے موٹے ہاتھوں میں ایک مقدس کتاب کا گراں بوجھ ہے۔ گلے میں کوئی ہار نہیں ہے۔ وہ بار بار پوچھتا ہے: "کیا میں آپ کے لیے انجیل مقدس کے چند صفحے پڑھ سکتا ہوں؟" اور تم یہ بتا کر معذرت کرتے ہو کہ تم دراصل ایک ملحد ہو، جس نے زندگی کے ابتدائی سال ایک مسلمان اور آخری سال ایک ہندو کے بھیس میں گزارے۔ تمھارے عقیدے واقعی ملحدانہ ہیں۔ قرآن شریف اور شریمد بھگوت گیتا تمھاری دبیز عینک کے دونوں شیشے ہیں، اور ان شیشوں کے باوجود تم کو کچھ نظر نہیں آ رہا ہے۔ پادری کا بھوت بار بار پوچھتا ہے: "آپ یہاں کب سے ہیں؟" اور تم بار بار "ازل سے" کہہ کر اس کے سوال کو ابد کی خاموش اور بے رنگ دھنک پر لٹکاتے ہو، اور پادری تمھارے سرہانے سے رخصت ہوتا ہے۔

ایک حزیں بھوت تم سے باتیں کرنے آتا ہے۔ وہ ایک ادھیڑ عمر کا بھوت ہے۔ شکل صورت سے ولایتی۔ اپنی جوانی میں یہ بھوت یقیناً خوبرو اور جوشیلا رہا ہوگا، لیکن ان دنوں میں وہ ضعیف اور بیزار دکھتا ہے۔ اس کی پیشانی کو کرب و اندوہ کے فشار نے وسیع تر کیا۔ اس کی آنکھیں ملکِ عدم کے قطبین ہیں۔ اس کے جابر اور نامہربان ہونٹوں سے نہ کوئی تعریف، نہ کوئی دعا سرزد ہونے پاتی ہے۔ وہ تم سے مخاطب ہو رہا ہے۔ تم اس کا لب و لہجہ پہچانتے ہو۔ وہ تم کو جونی میں کلکتے کے ایک چکلے میں ملا تھا۔ یہ شارل بودلیر ہے، اپنے آخری ایام کے بوسیدہ روپ میں۔ وہ تم کو کتنا کوس رہا ہے! تم نے پوری عمر اس کی ہمسری نہیں بلکہ اس کی نقالی کی۔ حلیہ، نشہ، الفاظ، انداز اور آتشک، تم نے اس کی سرشت کی خیر اور عادتوں کا شر اختیار کیا، اور کچھ سنبھال نہیں سکے۔ اور تم اپنی سزا بھگت رہے ہو۔ اب، عمر کے اس موڑ پر آ کر، تم اپنے بیمار اور زرخیز ذہن کی ترجمانی کرنا چاہتے ہو۔ لیکن تم میں قلم پکڑنے کی سکت نہیں ہے۔ شارل بودلیر اپنے فقروں کی انی سے تمھاری انا کا گوشت کریدتا جا رہا ہے۔ وہ ملامتیں چھوڑ کر لعنتوں پر اتر آتا ہے۔ اس کی لعنتیں حرف بہ حرف شیاطین کی پسندیدہ فرہنگ سے مستعار لی گئیں۔ وہ بولتے بولتے، اپنے کلوک کا دامن اپنے سر پر پھیلاتا ہے، اور تم کو پیر سے ٹھوکر مار کر، اپنے

Scanned with CamScanner

کلوک سمیت ہوا میں گم ہو جاتا ہے۔

ایک دن ایک بیوہ کا بھوت تمہارے پاس آتا ہے۔ چھوٹے بال، سفید کپڑے، ماتھے پر سوگ اور غصے کی لکیریں۔ تم اس بیوہ سے پوچھ رہے ہو کہ اس کا پتی کون تھا۔ وہ فوراً کہتی ہے: "کیسے بتاؤں؟ بچے پتی کے سامنے اپنے پتی کا نام لینا پاپ ہے۔" تم نے اس عورت کو برسوں پہلے چھوڑا ہے، لاہور کے ایک ویران گھر میں، جس کے کونے کونے میں چوہوں کے بل تھے، جس کی چھت سے جالے لٹک رہے تھے، جس کی دیواروں پر دراڑیں اور شگاف لرز رہے تھے، جس کی گرد آلود کھڑکیاں اندھوں کی آنکھوں کی طرح کثیف تھیں۔ اور تم خراماں خراماں دلی چلے گئے، اور وہاں سے بمبئی آ گئے، اور یہاں تم جو سوچ پر آ کر ادھ ننگی، نہاتی جل پریوں کے تماشے سے اپنی آنکھوں کی تفریح کرتے رہے۔ پھر تم آتشک سے مر گئے۔ تم نے اپنے عرصۂ حیات میں اپنی بیوہ کے لیے کچھ نہیں چھوڑا۔ شہدے! تمہاری دولت، تمہاری وراثت کیا ہے؟ صرف وہ چند کرم خوردہ کتابیں اور زرد بیاضیں جو کہ تمہارے انتقال کے بعد تمہارا دوست اختر تمہارے کمرے پر لینے آئے گا۔ تم اپنی بیوہ کو غور سے دیکھ رہے ہو۔ اس کا چہرہ میرا سین کے چہرے جیسا ہے۔ گویا میرا سین کے چہرے میں چالیس سال کی آزمائشوں اور کاوشوں کا اضافہ ہوا ہو۔ وہ اچانک اپنا بازو اٹھا رہی ہے، تم کو ایک زوردار طمانچہ مارنے کے لیے۔ اس کی ساڑھی کا پلو سرک جاتا ہے۔ اس کا ڈھلا ہوا جوبن نظر آ رہا ہے، اور قبل اس کے کہ وہ تم کو مارے، تم اس کے بازو میں اپنے دانت گڑو دیتے ہو۔ تمہارے دانتوں تلے بازو کا گداز سخت اور گوشت لہولہان ہو رہا ہے۔ لہو کے قطرے تمہارے گلے سے اتر رہے ہیں۔ تم آخر میرا سین کا خون پی رہے ہو... اور اچانک ایک چیخ سنائی پڑتی ہے، اور ایک نرس تمہارے وہم کا پردہ چیر کر تمہارے سامنے اپنا خون آلود بازو ہلا رہی ہے۔ اور وہ چلا رہی ہے: "پاگل ہو گئے تم؟ میں آج سے تمہاری کیئر نہیں کروں گی!"

32

کنگ ایڈورڈ ہسپتال کے تمام نفسیاتی طبیب تمہارے پاس اکٹھے ہوئے ہیں۔ وہ آپس میں انگریزی میں بات کر رہے ہیں تاکہ ان کے باہمی مشورے تمہیں سمجھ نہ آئیں۔ ان کو یہ نہیں معلوم کہ تم

Scanned with CamScanner

نے انگریزی میں دنیا کے تمام ادبی شاہکار پڑھے۔ تمھاری حالت بیان کرنے کے لیے سارے طبیب 'مینٹل ڈی ریلمنٹ' کی اصطلاح پر متفق ہوئے ہیں۔ سب کی رائے یہ ہے کہ بجلی کے جھٹکے ہی تمھارے کرم خوردہ ذہن کو شفا بخشیں گے۔ تمھارا ذہن پوری طرح پھوٹ کر تمھارے فرش پر بکھر گیا۔ اس کے ٹکڑے صرف ان لوگوں کی برقی جفاؤں سے مجتمع ہو جائیں گے۔

ایک جوان سانفسیاتی طبیب اپنے سارے ساتھیوں کی طرف سے تم سے مخاطب ہونے لگا ہے۔ وہ کچھ مخصوص سوالوں کی مدد سے تمھارے ذہن کا بخار ناپے گا۔ وہ سب سے پہلے تم سے تمھارا نام پوچھتا ہے۔ اس کا لہجہ اس کے حلیے کی طرح خوفناک ہے۔ اس کے حلیے کو کیسے بیان کیا جائے؟ جلد چھپکلیوں کی سی ہے، کان خرگوشوں والے ہیں، زبان سانپوں والی ہے، نتھنے بھینسوں کے سے ہیں اور ناک پر ایک پاگل سائنسدان کی ٹیڑھی ترچھی عینک کا اتنحک سایہ منڈلا رہا ہے۔ اتنی بدصورتی، حلیے اور لہجے میں، تمھاری برداشت سے باہر ہے۔ لیکن تم طبیعت پر جبر کر کے سوال کا جواب دے رہے ہو، اور بتا رہے ہو کہ تمھارا کوئی نام ہی نہیں ہے۔ 'ثناء اللہ ڈار' اور 'میراجی'، دونوں تخلص ہیں۔ شاعر کا اصلی نام اور ہے۔ تم تاحال اس کا انکشاف نہیں کر سکے۔ کم عمر طبیب کے حوصلے پست نہیں ہوئے وہ تم کو اچانک ایک آئینہ دکھانے لگتا ہے، اور پوچھتا ہے: ''اس میں آپ کو کون نظر آ رہا ہے؟'' آئینے میں تم کو ایک ہم شکل نظر آ رہا ہے، جس کے سارے بال سفید ہوئے ہیں۔ یہ آئینہ بالکل مصنوعی ہے، اور یہ پاگل طبیب چاہتا ہے کہ تم اس عجیب و غریب ہمزاد کو اپنا آپ مانو! یہ کیا بکواس ہے! تمھارے سارے بال ابھی بھی کالے ہیں۔ تم پینتیس سال کے ہو۔ تم کوئی بزرگ نہیں ہو۔ تم طبیب کو بتا رہے ہو کہ آئینے میں ایک بڑی عمر کا ہم شکل نظر آ رہا ہے۔ تم نے اس کو پہلی مرتبہ دیکھا۔ طبیب کے سوال ختم ہو گئے۔ کیا تم اس کے امتحان میں پاس ہوئے ہو؟ تم کو بعد میں مطلع کیا جائے گا۔ فی الحال تم اس نوجوان طبیب کی آستین پکڑ کر اس کو جلدی جلدی بتا رہے ہو کہ تمھیں سب پتا ہے، باقی طبیب تم کو ایک 'مینٹل ڈی ریلمنٹ' کا شکار کہتے ہیں۔ وہ شاید صحیح ہیں۔ لیکن بات یہ ہے کہ تمھارے ذہن کے بکھرنے کے باوجود تمھارا ضمیر صحیح و سالم ہے۔ جس کو بجلی کے جھٹکے ہمیشہ کے لیے اڑا دیں گے۔ طبیب حضرات کوئی اور طریقہ نکالیں ان جھٹکوں سے تمھارے بچے کچھے اوسان پگھل جائیں گے اور تم کہیں کے نہیں رہو گے۔

زمانہ آخر تم کو بجلی کے جھٹکے دینے پر کیوں تل گیا ہے؟ کیا زمانے کو تمھاری نفسیاتی الجھنیں اس

Scanned with CamScanner

حد تک ستاتی ہیں کہ وہ ان کا ستیاناس کرنے کی سازش رچانے پر مجبور ہو گیا؟ تم ان الجھنوں کے احسان مند ہو۔ یہ انھیں تمھاری ذہنی فصیلوں کے کنگرے ہیں۔ وہ تم کو جنوں کے پُررونق شہر سے نکلنے سے ورمنطق کے دشت میں بھٹکنے سے روکتی ہیں۔ یہ دشت کتنا پر آشوب ہے۔ تمھارے شہرِ جنوں کا آقا ایک ہٹ دھرم آدمی ہے، جو کہ اب دھرم کو مذہب سے اونچا مانتا ہے۔ وہ اپنی اصل ورثقافت سے روگرداں ہوا ہے۔ وہ ننگا بیٹھتا ہے اپنی مقتدر کرسی پر، اور دشمنوں کی یلغاریں اس کا ایک بال بانکا نہیں کرسکتی۔ وہ اپنی حفاظت کے لیے تمھاری نفسیاتی الجھنوں کے کنگروں سے کام لے رہا ہے۔ شہر جنوں کا یہ برہنہ تن آقا تم سے اشعار کی شکل میں اپنے احکام لکھواتا ہے۔ سب تمھارے کنگرے بجلی کی تپش سے موم ہو جائیں گے، تو یہ آقا بھی بے ذھب ہو کر زمانے کی معمول خاک میں پیوست ہو جائے گا۔ کیا بستی کے طبیب تمھارے اندر سے شاعری فنا کرنا چاہتے ہیں؟

جلد ہی تم کو اس وارڈ سے ہٹایا جائے گا اور ایک علیحدہ کمرے میں ایک انجان بستر پر رسیوں سے باندھا جائے گا۔ تمھارے منھ میں ایک میلا کپڑا ٹھونسا جائے گا۔ تمھارے سر پر برقی تاروں کا ایک تاج رکھا جائے گا، دیکھنے میں ہر لحاظ سے عیسائیوں کے مسیحا کے کانٹوں والے تاج سے مماثل۔ اور جب بجلی ان تاروں سے گزر کر تمھارے کاسہ سر کی رگوں میں دوڑنے لگے گی تو تمھاری نحیف روح تمھارے جسموں سے نکلے گی، اور دبے پاؤں، لنگڑاتے لنگڑاتے، کمرے کے بند دروازے کی طرف بڑھے گی۔ دروازہ خود ہی کھلے گا اور نگاہوں کے آگے، ایک تیرہ و تاریک راہداری پھیلے گی۔ تمھاری روح اس راہداری سے گزرے گی اور قدم قدم پر آوازوں سے محسوس کرے گی کہ تاریکیوں اور تاریکیوں سے پرے، زندگی کی طرف، طرح طرح کے معجزے رونما ہو رہے ہیں۔ وہاں، آسمان میں، ازل سے بے زبان بادل گرج رہے ہیں۔ وہاں، ندیاں اپنا سکوت توڑ کر دل برداشتہ ملاحوں کو پکار رہی ہیں۔ وہاں، حرص اور یاس کے پربت زمین پر ایک تڑاخے کے ساتھ ڈھے رہے ہیں۔ وہاں، شہروں کی مورتیاں اور مینار ایک ہی جلوے کے آگے سجدہ کر رہے ہیں۔ اور یہ سنائی نہیں پڑ رہا ہے، لیکن محسوس ہو رہا ہے، کہ وہاں، تمام گھروں میں، اصطبلوں کے نوکر یا خانوں کی شہزادیوں سے ہم آغوش ہو رہے ہیں۔ اور اس وقت، ان کے جسموں میں سانسوں کا تولد اور آہوں کی وفات ہم آہنگ ہو رہے ہیں۔ راہداری کے چاروں طرف کچھ مرجھائی ہوئی گھڑیاں دکھائی پڑیں گی، جن کی

Scanned with CamScanner

ڈھیلی، بے صوت اور بے حرکت سوئیاں بھٹکے ہوئے مسافروں کے لیے وقت کے جمود کا یقین دلاتی ہوں گی۔ اور جوں ہی تمھاری روح راہداری سے باہر آئے گی، ایک روشن سڑک نظر آئے گی۔ اس سڑک کے کنارے، تمھاری روح کے آرام کے لیے ایک خالی بنچ مقرر ہوگی۔ روح اس پر بیٹھے گی اور یہ سادہ سا مقام، چشم زدن میں، کائنات کی وسیع ترین انتظارگاہ بن جائے گا۔ اور کیا ہوگا؟

اور سویرا اجلے ہوئے نور کو اپنے پہلو میں لے کر نظر آئے گا
سوچ جاگے گی اور سیج کے پھول کانٹے بنیں گے بھی
رنگ کے گیت میں سارے مہمل اشارے ہی رہ جائیں گے
ایک تنکے کی مانند بہہ جائیں گے بول سب پریت کے
دھیان آئے گا دل میں کہ اب تو یونہی سوچتے سوچتے
کھوئے کھوئے ہمیں اک اچھوتی کنواری دلہن کی طرح
بیٹھے رہنا ہے رستے کو تکتے ہوئے
جب تک آئے نہ بن کر کوئی سورما بانکا ترچھا جواں
اپنے گھوڑے کی باگوں کو تھامے ہوئے

دیر تک، یہاں، تم کسی سورما بانکے ترچھے جواں گھڑسوار کے منتظر رہوگے۔ لیکن کسی گھوڑے کی ٹاپیں سننے میں نہیں آئیں گی۔ فقط ایک سائرن کی پکاریں سنائی دیں گی۔ ایک ایمبولینس ورود کرے گی، ور یہ وہی ایمبولینس ہوگی جس میں ثناء اللہ ڈار عرف میراجی کی میت کنگ ایڈورڈ ہسپتال سے میرین لائن کے قبرستان تک سپردِ خاک ہونے کے لیے منتقل ہو جائے گی۔ جناب ثناء اللہ ڈار، چند لمحے پہلے، اپنے علاج کے دوران، اچانک، ایک اندرونی صدمے کی تاب نہ لا کر، عدم آباد کے خاموش گزاروں کی طرف کوچ کر گئے۔

❁ ❁

دوسری زبانوں کے ناول

خیمہ

میرال الطحاوی

انگریزی سے ترجمہ: اجمل کمال

Rs.75

امید اور دوسرے خطرناک مشاغل

لیلیٰ العلمی

انگریزی سے ترجمہ: محمد عمر میمن

Rs.100

سرزمینِ مصر میں جنگ

یوسف القعید

انگریزی سے ترجمہ: اجمل کمال

Rs.125

پہلی بارش

خولیو لیامازاریس

انگریزی سے ترجمہ: اجمل کمال

Rs.95

درخت نشیں

اتالو کلوینو

انگریزی سے ترجمہ: راشد مفتی

Rs.175

اِنکی کے دیس میں

ولاس سارنگ

مراٹھی سے ترجمہ: گوری پٹوردھن، اجمل کمال

Rs.150

Scanned with CamScanner

نئی کتابیں

آج
(پہلی جلد)

ترتیب: اجمل کمال

Rs.795

ثقافتی گھٹن اور پاکستانی معاشرہ

ارشد محمود

(نیا اضافہ شدہ ایڈیشن زیر طبع)

منتخب تحریریں

گابریئل گارسیا مارکیز

ترتیب: اجمل کمال

Rs.750

شہزادہ احتجاب

(ناول)

ہوشنگ گلشیری

فارسی سے ترجمہ: اجمل کمال

Rs.70

ریت پہ بہتا پانی

(شاعری)

قاسم یعقوب

Rs.160

اردو کا ابتدائی زمانہ

(تنقید و تحقیق)

(تیسرا ایڈیشن)

شمس الرحمٰن فاروقی

Rs.250

تبادلہ

(ناول)

وبھوتی نرائن رائے

ہندی سے ترجمہ: زیبا علوی

Rs.200

اِنگلی کے دیس میں

(ناول)

ولاس سارنگ

مراٹھی سے ترجمہ: گوری پٹوردھن، اجمل کمال

Rs.150

Scanned with CamScanner

دوسری زبانوں کے ناول

قلب ظلمات

جوزف کونریڈ

انگریزی سے ترجمہ: محمد سلیم الرحمن

Rs.80

تمس

بھیشم ساہنی

ہندی سے ترجمہ: شہلا نقوی

Rs.100

نوکر کی قمیض

ونود کمار شکل

ہندی سے ترجمہ: عامر انصاری، اجمل کمال

Rs.75

بوف کور

صادق ہدایت

فارسی سے ترجمہ: اجمل کمال

(نیا ایڈیشن زیرِ طبع)

شہزادہ احتجاب

ہوشنگ گلشیری

فارسی سے ترجمہ: اجمل کمال

Rs.70

Scanned with CamScanner

صدیق عالم

بے تُکی کہانیاں

(پانچ سلسلہ وار کہانیاں)

Scanned with CamScanner

اگلے صفحات میں صدیق عالم کی پانچ سلسلے وار کہانیاں پیش کی جا رہی ہیں۔ صدیق عالم 1952 میں ریاست مغربی بنگال کے قصبے پورولیا میں پیدا ہوئے۔ 1983 سے وہ کلکتے کے باسی ہیں اور یہ شہر ان کی بیشتر کہانیوں کا محل وقوع بھی ہے۔ کلکتہ شہر کے بارے میں صدیق عالم نے ایک ناول چارنک کی کشتی تحریر کیا جو نثری نظم کی ہیئت میں تھا اور 2003 میں شائع ہوا۔ صدیق عالم نے انگریزی میں ایم اے کرنے کے علاوہ قانون کی تعلیم بھی حاصل کی اور تجارتی ٹیکس کے سرکاری محکمے سے منسلک ہیں۔ انھوں نے لکھنا 1972 میں شروع کیا۔ ان کی کہانیوں کا پہلا مجموعہ آخری چھاؤں 1982 میں اور دوسرا مجموعہ لیمپ جلانے والے 2008 میں شائع ہوا۔

Scanned with CamScanner

ہم ایک بنی بنائی دنیا میں داخل نہیں ہوتے۔ جس طرح ایک weaver bird اپنا گھونسلا بناتی ہے اسی طرح کوکھ سے باہر آتے ہی ہم بنی آواز سے اپنی دنیا کو بنانا شروع کر دیتے ہیں۔ ہم اس آواز کے ذریعے ایک ایسی کائنات سے کنیکٹ ہونے کی کوشش کرتے ہیں جس کا سرے سے کوئی وجود ہے ہی نہیں۔ اب ہوتا یہ ہے کہ اپنے لفظوں کے ذریعے بنتی ہوئی اس دنیا کو سمجھنے اور جینے کے لیے ہمارے پاس واحد وسیلہ یہی ہمارے الفاظ ہیں۔ تو اس طرح لفظوں کا ایک گورکھ دھندا شروع ہو جاتا ہے اور ہم اپنا راستہ کھو بیٹھتے ہیں، مگر اس گورکھ دھندے سے باہر نکلنے کے لیے الفاظ کے علاوہ ہمارے پاس کوئی دوسرا وسیلہ بھی نہیں ہوتا۔ اس طرح ہم ایک بتدریج پھیلتے ہوئے گورکھ دھندے کے بیچوں بیچ کھڑے حیران و پریشان اس شخص کو پکارنے پر مجبور ہوتے ہیں جس کے بارے میں ہمیں یقین ہوتا ہے کہ وہ ہمیں اس گورکھ دھندے سے باہر نکلنے کا راستہ بتا سکے گا۔ اس طرح مکالمے اہم ہو اٹھتے ہیں... مکالمہ جو ایک اندھے آدمی کی ٹٹولنے کی لکڑی بھی ہے اور اس تاریک کائنات میں اس کی آواز بھی۔ وہ ردعمل کے طور پر کچھ آوازیں سن تو رہا ہے مگر انھیں سمجھنے کے لیے اسے خود اپنے لفظوں کا سہارا لینا پڑتا ہے، دوسرے معنوں میں وہ ان آوازوں میں وہی کچھ پاتا ہے جو اس کے پاس پہلے سے موجود ہے۔ مگر اسے اس کا بھی احساس ہے کہ اپنی اس کوشش میں وہ الفاظ کے اس گورکھ دھندے کو اور بھی پھیلاتا جا رہا ہے جس کے سبب وہ اس سے کبھی باہر آ نہیں پائے گا۔ مگر ایک دلدل میں پھنسے ہوئے انسان کی طرح اس کے پاس اس کے علاوہ اور کوئی چارہ بھی نہیں کہ وہ اس دلدل سے نکلنے کی جدوجہد میں دھیرے دھیرے اس کی تہہ میں چلا جائے، کیونکہ ایسا کوئی آنے والا نہیں جو اسے اس دلدل سے نکال سکے۔ اس طرح وہ اس گورکھ دھندے کے اندر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے گم ہو جانے پر مجبور ہے۔ ہم الفاظ کے اسی گورکھ دھندے میں جینے والے لوگ ہیں۔

وہ جو چپ ہو گئے، اس کا یہ مطلب نہیں کہ انھوں نے ہار مان لی۔ وہ جو بول رہے ہیں، اس کا یہ مطلب نہیں کہ انھوں نے سب کچھ جان لیا ہے۔ انھیں اس کا علم ہے کہ آخر ایک دن یا تو وہ شعوری طور پر یا پھر لاشعوری طور پر چپ ہو جائیں گے یا... یا پھر ان کا جسم کسی مکالمے کے لائق نہیں رہے گا۔ اکثر ہمارا بہت سارا عمل قطعی طور پر میکانکی ہوتا ہے جیسے پلکیں جھپکنا، جیسے دورانِ خون کا چلنا، جیسے جینا۔ جس کسی نے ایک

Scanned with CamScanner

موجودہ دنیا کی بات کہی ہے وہ ایک اندھا آدمی ہے جو لکڑی کے سہارے اپنے اردگرد کی دنیا کو ٹٹول رہا ہے۔ اسے ایسی کسی چیز کی تلاش ہے جو اس کی لکڑی کو روک کر اسے اس کے اکیلے پن سے نجات دے سکے۔ مگر بہت جلد اسے اس بات کا پتا چل جاتا ہے کہ وہ خود جس زمین پر کھڑا ہے اس کا وجود ہے ہی نہیں؛ ظاہر ہے اس کی لکڑی کو روکنے کے لیے اس پر کسی اسٹرکچر کی موجودگی ناممکن ہے۔ تو جب ایسی کوئی چیز نہیں جو آپ کو روک سکے، تو آپ اگلا قدم کیسے اٹھا سکتے ہیں۔ اس طرح دوسرے آدمی کی احمقانہ تلاش جاری رہتی ہے۔ دوسرا آدمی، جو ایک مٹھ کے سوا کچھ بھی نہیں۔ یا زیادہ سے زیادہ اس کا ڈپلیکیٹ ہے۔ اور تیسرا آدمی، وہ اس ڈپلیکیٹ کی کاربن کاپی ہے۔ چوتھا آدمی اس کاربن کاپی کی زیراکس ہے۔ پانچواں آدمی، اس زیراکس کی عکسی تصویر ہے، چھٹا آدمی اس عکسی تصویر کی، سینچ کاپی ہے۔ اس طرح وہ سینکڑوں، ہزاروں، لاکھوں، کروڑوں، اربوں لوگ جو ہمیں نظر آتے ہیں، یا وہ سینکڑوں، ہزاروں، لاکھوں، کروڑوں، اربوں لوگ جو ہم سے پہلے گزر گئے، یا وہ سینکڑوں، ہزاروں، لاکھوں، کروڑوں، اربوں لوگ جو ہمارے بعد دنیا میں آئیں گے، وہ دراصل ہم ہی ہیں، یا ہمارا ڈپلیکیٹ یا کاربن کاپی یا زیراکس کاپی، یا عکسی تصویر یا پینٹنگ یا اسکیچ، وغیرہ وغیرہ۔ وہ کوئی دوسرا نہیں ہے، بالکل بھی نہیں ہے، کیونکہ ۔ ۔ ۔ دوسرا آدمی تو ایک مٹھ ہے۔

یہ پانچ افسانے اسی تنہا انسان کے تنگ دو اور پاگل پن کی داستان ہیں۔ وہ کسی قوس قزح کی تلاش میں نہیں ہے، نہ کوئی بعد الطبیعیاتی قصے سلجھانا چاہتا ہے۔ وہ حقیقت کو کوئی ٹھوس شکل بھی دینا نہیں چاہتا۔ وہ تو صرف اس اتنی بڑی، بے کراں کائنات میں آواز لگا کر یہ جاننا چاہتا ہے کہ وہاں کوئی ہے؟

ص۔ع۔

ماں، میں اور چند بے تکے واقعات

1 رشتے کا کھوٹا سکہ

جمعرات کی صبح میرے دروازے پر ایک دستک ہوئی۔

یہ میری ماں تھی۔

''سنو۔۔۔'' اس نے کہا۔ ''یا تو تم یہ فیصلہ کرلو کہ یہ زندگی پورے طور پر تمھاری اپنی ہے یا پھر ہمیں بھی اس میں تھوڑی سی جگہ دو۔''

میری ماں ہر ماں کی طرح بچوں سے اپنی مانگیں رکھتی ہے۔ مگر شاید میرا معاملہ تھوڑا سا الگ ہے۔ مجھے اپنے گھر سے زیادہ ان دونوں بوسیدہ دریچوں سے پیار ہے جن سے میں باری باری دور تک پھیلے ہوئے اپنے شہر کی طرف دیکھتا رہتا ہوں۔ ان کھڑکیوں سے سامنے کی ایک گلی، اس کے نکڑ پر کھلتا ہوا ایک ٹوٹا پھوٹا راستہ اور شہر کے قدیم علاقے کے کچے پکے مکانات کے علاوہ اور بھی بہت ساری چیزیں نظر آتی ہیں، مثلاً آسمان، پتنگ، پرندے اور انسان۔ اور اگر آپ چاہیں تو اس میں اور بھی بہت ساری چیزیں حسبِ ضرورت شامل کر سکتے ہیں، اور میں ان سب کا اتنا عادی ہو چکا ہوں کہ اکثر مجھے نہ کالج کی کتابوں کا ہوش رہتا ہے نہ گھر کے لوگوں کے لیے وقت ملتا ہے۔

''آخر تم چاہتے کیا ہو؟'' میری ماں نے میری خاموشی سے اکتا کر کہا۔ وہ اپنی بھاری بھرکم کمر پر ہاتھ رکھے کھڑی تھی جیسے آج وہ جواب لیے بغیر ٹلنے والی نہیں۔ میں اس کی اکلوتی اولاد نہیں ہوں، جس نے کسی حد تک میرا مسئلہ کم کر دیا ہے ورنہ میں اس کی توجہ کے بوجھ تلے دب کر دم توڑ دیتا۔ میری ماں ایک روایتی ماں کی طرح ہر کسی کے لیے کچھ نہ کچھ ہے، مثال کے طور پر وہ میرے مستقبل کی امین ہے: وہ چاہتی ہے کہ میں صحیح راستے پر چل کر اپنی منزل پا لوں جب کہ میں شروع سے ہی اس سے منکر

Scanned with CamScanner

تھا کہ انسان کی کوئی منزل بھی ہوتی ہے۔ کیا ساری زندگی ہم سرابوں کے پیچھے نہیں بھاگے؟

''تم اس طرح میری طرف کیا دیکھ رہے ہو؟ میں تمھاری ماں ہوں۔ یا تم یہ بھی بھول چکے ہو؟''

''کیا یہ جتانا ضروری ہے؟'' میں کھڑکی کی طرف پشت کیے کھڑا تھا جیسے اپنی دنیا کو ان کی عقابی نظروں سے بچانا چاہتا ہوں۔ ''کیا آدمی اپنے طور پر ان چیزوں کو سوچنے سمجھنے کا حق بھی نہیں رکھتا؟''

''ارے تم کیا کہہ رہے ہو!'' میری ماں اچنبھے کے ساتھ میری طرف تاک رہی تھی۔ پھر اسے ہمیشہ کی طرح یاد آیا کہ شاید ان سب باتوں کے لیے یہ وقت صحیح نہ تھا۔ تو اس نے اپنا ہاتھ، جس پر چاندی کا ایک بھاری کڑا پڑا ہوا تھا، کمر سے ہٹا لیا اور واپس چلی گئی، اس بلی کی طرح جو نعمت خانے میں دبے پاؤں داخل ہو تو گئی ہو مگر دودھ پینے سے محروم رہ گئی ہو۔

''تم نہ صرف یہ کہ ایک برے انسان ہو...'' میں نے خود سے کہا۔ ''بلکہ اس لائق نہ تھے کہ اس گھر میں تو کیا، کسی کے گھر میں پیدا ہوتے۔ ارے تم سے تو یہ تک نہیں ہوتا کہ صرف دل رکھنے کے لیے محبت کے دو بول کہہ ڈالو۔''

میں نے اپنے آپ کو یقین دلایا کہ میں ساری عمر (چاہے اس کی میعاد کچھ بھی رہی ہو) یہی کوشش کرتا آیا ہوں اور اکثر روایت کے دو بول بول کر چھٹکارا پانے میں کامیاب بھی رہا ہوں، مگر اس کا کیا کیا جائے کہ اسی دوران یہ دونوں رشتے میرے لیے زیادہ بڑے، زیادہ اہم ہوتے گئے اور الفاظ میرے لیے سکڑتے چلے گئے جیسے وہ سوکھی برف کے ٹکڑے ہوں جو روز بروز پگھل کر ہوا میں تحلیل ہوتے جا رہے ہوں۔ یہ جو میں لفظوں کے معاملے میں دن بدن مفلس ہوتا جا رہا ہوں، کیا اس صورت حال کے لیے ذمہ دار بھی میں ہی ہوں؟

اور یہ چند دنوں پہلے کی بات ہے...

2 جانور کی گردن کشی کا مسئلہ

میں نے اپنے شہر میں ایک میونسپل پارک کے عقبی راستے پر ایک ایسے بجلی کے کھمبے کی دریافت کی ہے جہاں ہندو بوچڑ بکریاں کاٹنے آتے ہیں۔ یہ پارک کافی سرسبز و شاداب تھا، چار بجے صرف دو گھنٹے

Scanned with CamScanner

کے لیے شہریوں کے لیے کھلا تھا اور اپنے گل بوٹوں کے علاوہ لوہے کے کھمبے پر نصب ایک چوبی پیلیکن کے لیے زیادہ مشہور تھا۔ بوچڑ بکری کا سر بجلی کے کھمبے سے کس کر باندھ دیتے (یہ بکریاں تمام کی تمام لاغر اور نیم جان ہوتیں)، ایک آدمی جو، گرمی ہو یا سردی، اپنے سر پر بلا ناغہ خون سے داغدار ایک انگوچھا باندھے رہتا، بکری کو دونوں پچھلی ٹانگوں سے کھینچ کر کھڑا ہو جاتا، اور جب کہ آدمی اور کھمبے کے بیچ معلق بکری اپنی رقیق آنکھوں سے کسی بھی چیز کی طرف نہ تاکتے ہوئے خلا میں اپنی سامنے کی دونوں دبلی پتلی ٹانگوں کو ہلانے کی کوشش کر رہی ہوتی، دوسرا شخص ایک بھاری بھرکم کٹاری نما چھرے کے دستے کو، جو کپڑے لپیٹ کر کافی دبیز کر لیا گیا تھا، اپنی دونوں مٹھیوں سے تھام کر اس کی گردن پر ایک بھرپور وار کرتا۔ زیادہ تر ایک ہی جھٹکے میں بکری کا سر دھڑ سے الگ ہو کر کھمبے سے لٹک جاتا جس کا نچلا حصہ خون کے متواتر انجماد سے سیاہ ہو رہا تھا۔ سر سے جدا ہو کر بکری کا دھڑ زمین پر جا گرتا جس کی پچھلی دونوں ٹانگوں کو دوسرا آدمی اپنے دونوں ہاتھوں سے کسی احمق کی طرح تھامے کھڑا رہتا۔ مگر ایک بار میں نے دیکھا کہ وار کرنے والے کو کم از کم پانچ یا چھ بار کوشش کرنی پڑی تب جا کر جانور کا سر دھڑ سے الگ ہو پایا۔ شاید یہ جانور کچھ زیادہ چالاک تھا اور اس نے اپنی گردن اینٹھ لی تھی جو اس بات کا بین ثبوت ہے کہ زیادہ تر ہماری چالاکیاں کسی بڑی بیوقوفی کا پیش خیمہ ثابت ہوتی ہیں۔

بعد میں میں نے اس پارک سے تھوڑا الگ ہٹ کر ایک چھتنار پیڑ کے سائے میں کھڑے ہو کر، جس کے نیچے عورتوں کی ماہواری کی گیلی اور سوکھی پٹیاں بکھری ہوئی تھیں، اس گتھی کو سلجھانے کی کوشش کی کہ جانوروں کے معاملے میں کون زیادہ رحم دل ہے: ہندو، جو ڈاکٹر گلوٹن کی طرح یہ کام کرنا چاہتے ہیں، یا مسلم جو چھرے سے جانور کا نرخرہ چاک کرتے ہیں۔ مجھے بھرپور یقین تھا کہ اس معاملے میں اگر سوال کیا جائے تو ذبح کرنے کے طریقے کو سائنسی نقطہ نظر سے جائز ٹھہرانے میں ڈاکٹر ذاکر نائک ثبوتوں کا ایک پہاڑ کھڑا کر دیں گے اور یہ ثابت کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے کہ جانوروں کے معاملے میں مسلمانوں کا طریقہ زیادہ سائنسی، رحم دلانہ اور حفظانِ صحت کے اصولوں کے عین مطابق ہے۔

بعد میں میں نے دو کتوں کو اس کھمبے کے نیچے خون چاٹتے دیکھا۔ مجھے دیوار کی چوٹی پر نصب ریلنگ پر کچھ کوے بھی بیٹھے نظر آئے جن میں سے ایک آدھ زمین پر اتر کر کتوں سے فاصلہ قائم رکھتے ہوئے، دھول پر جمی ہوئی خون کی پپڑیوں کو چونچ سے اٹھا رہے تھے۔ اور تب میری نظر اس بات پر

Scanned with CamScanner

پڑی کر کھمبے کے نیچے کی زمین آس پاس کے مقابلے کچھ زیادہ سیاہ تھی۔

اور جانے کیوں اس واقعے کے بعد میں اس شہر کا نئے سرے سے جائزہ لینے پر مجبور ہو گیا اور مجھ پر اس بات کا انکشاف ہوا کہ اس میں ایسے سینکڑوں گلی کوچے، ہزاروں دیواریں اور چھتیں، بے شمار ایسی جگہیں تھیں جہاں اس طرح کی مخدوش سیاہی بالکل صاف دیکھی جا سکتی تھی، جو یہ ثابت کرتا ہے کہ یہ سارا شہر دہشت گردوں سے بھرا پڑا ہے۔

اور اس رات روٹی کے ساتھ سالن کے طور پر بھر پیٹ بیف کھا کر میں نے آنگن میں اس نوعیت کا پہلا قے کیا، گرچہ اس واقعے کے ساتھ میرے سبزی خور ہونے کی کوئی شروعات نہیں ہوئی تھی۔

اور یہ ابھی چند ہفتے پہلے کی بات ہے۔۔

3 یک پستان لڑکی

میں اپنے شہر کے پریڈ گراؤنڈ میں اپنے ایک دوست کے ساتھ کھڑا تھا۔ میدان کے ایک سرے پر قومی جھنڈا لہرانے کا چبوترا تھا جس پر سارا سال آس پاس کے محلوں کے غریب بچے آ کر دست کیا کرتے۔ یہ چبوترا یوں تو سال بھر اسی بہت ہی ضروری کام کے لیے مخصوص تھا، مگر ہر 26 جنوری اور 15 اگست کے موقعے پر اس کی مرمت اور صفائی کر دی جاتی کیونکہ اس پر کھڑے ہو کر عزت مآب ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ ملٹری بینڈ کی دھن پر مارچ کرتے پولیس اور پیرا ملٹری فورس کے سیلوٹ لیا کرتے۔ ہم دونوں اس مہکتے چبوترے کی طرف تاک رہے تھے جب ہم نے پہلی بار ایک بے انتہا خوبصورت لڑکی کو دیکھا جس کا بایاں پستان غائب تھا۔

اور میں نے اپنے دوست سے، جو کسی وجہ سے میرے ساتھ ہو لیا تھا، کہا:

”کیا یہ ممکن ہے؟“

”کیوں نہ خود اس سے پوچھ لیں۔“

اور ہم دونوں اس کے پیچھے ہو لیے۔ مگر اس کے قریب پہنچ کر پتا چلا کہ اس کا پستان پوری طرح غائب بھی نہ تھا۔ وہ اپنی سہیلیوں کے ساتھ ٹیوشن سے لوٹ رہی تھی اور راستہ بچانے کے لیے انھوں نے

Scanned with CamScanner

پریڈ گراؤنڈ کا انتخاب کیا تھا۔

''کیا سچ مچ تمہارا ایسا کوئی ارادہ ہے؟'' میرے دوست نے انکھیوں سے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ لڑکیوں کے قریب پہنچ کر اس کی ہمت پست ہو گئی تھی کیونکہ اب اس کے پیر ڈھیلے پڑ رہے تھے۔

''کیا؟'' ہم لوگ پریڈ گراؤنڈ سے باہر آ گئے تھے اور تارکول کی سڑک پر چل رہے تھے۔

''یہ پوچھنے کا کہ ایسا کیوں ہے۔''

''کیا کیوں ہے؟''

''یار، تم کمال کے آدمی ہو۔ بات خود سے شروع کرتے ہو اور خود اس سے الگ ہو جاتے ہو۔''

''کیا اس کے پیچھے آنے کی رائے میری تھی؟''

''میری تھی۔ مگر تم نے ہامی تو بھری تھی۔''

''کیا میں نے لکھ کر دیا تھا؟''

''تم نے زبانی بھی کچھ نہیں کہا تھا۔ پھر ہم ساتھ ساتھ اس کے پیچھے کیوں چل پڑے؟''

''یہ تم خود سے پوچھو۔''

اور جب کہ ہم دونوں اس بحث میں مصروف تھے وہ لڑکی اپنی سہیلیوں سے کٹ کر سڑک کے کنارے، جہاں پیڑوں کے سائے ترچھے گر رہے تھے اور پانی کا ایک بڑا سا سیاہ پائپ کسی لحیم شحیم سانپ کی طرح بل کھاتا ہوا چلا گیا تھا، ایک جگہ کھڑی ہو گئی اور ہماری طرف تاکنے لگی۔ صاف ظاہر تھا، وہ ہماری منتظر تھی۔

''نہیں۔'' میرے دوست نے میرا کندھا تھام کر مجھے روک لیا۔ ''تم اس کے نزدیک بالکل نہیں جاؤ گے۔ یہ یک پستان لڑکی تمھیں پولیس کے حوالے کر دے گی۔''

اپنا کندھا جھٹک کر آزاد کرتے ہوئے میں لڑکی کی طرف بڑھ گیا اور اس کے قریب پہنچتے ہی ہم دونوں ساتھ ساتھ چلنے لگے۔ مجھے پتا نہیں، میرے دوست کا کیا بنا۔ میں اتنا بتا سکتا ہوں کہ پھر میں نے مڑ کر نہیں دیکھا تھا۔

''تم دونوں ہم لڑکیوں کا پیچھا کیوں کر رہے تھے؟'' لڑکی نے چلتے چلتے بنگالی میں دریافت کیا۔

Scanned with CamScanner

''ہم دونوں؟'' میں نے اپنی چاروں طرف نظریں دوڑاتے ہوئے کہا۔

''وہ جو تمھارا کندھا تھام کر تمھیں روک رہا تھا اور جانے کہاں چلا گیا۔''

''کہاں جائے گا! اسی سیارے پر کہیں بھٹک رہا ہوگا۔''

''تم نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔''

''تم بے انتہا خوبصورت ہو۔'' شاید میرے پاس بات کو ٹالنے کا اس سے بہتر بہانہ اور کوئی دوسرا نہ تھا۔

''یہ میری بات کا جواب نہیں ہوا۔ اور یہ میں اتنی بار سن چکی ہوں کہ اب اس کا میرے اوپر کوئی اثر نہیں ہوتا۔''

''تم اتنی خوبصورت کیوں ہو؟'' میں نہ چاہتے ہوئے بھی دزدیدہ نظروں سے اس کے پستان کی طرف تاک رہا تھا۔ کیا وہ ان کے بیڈھنگے پن سے واقف تھی؟

''یہ سوال ٹھیک ہے۔ اور مجھے اس کا جواب دینا اچھا لگتا اگر اس کا کوئی جواب ہوتا۔'' شاید وہ میری نظروں کا اثر تھا کہ وہ لاشعوری طور پر کتاب اور کاپی کے پیچھے اپنے غائب پستان کو ڈھانپنے پر مجبور ہوگئی۔ ''تم نے میری بات کا جواب اب بھی نہیں دیا ہے۔''

''کیا تمھاری کبھی کوئی سرجری ہوئی تھی؟''

''تم نے ٹھیک اندازہ لگایا،'' لڑکی بولی۔ ''اب تم لوگوں کا تعاقب میری سمجھ میں آ گیا۔''

''برا لگا؟''

''نہیں۔ اور مجھے کیوں برا لگے گا؟'' وہ مسکرائی۔ ''برا تو انھیں لگتا ہوگا جو اسے پہلی بار دیکھتے ہوں گے۔ اس دنیا میں ہر کوئی اپنی اپنی حس کے ساتھ زندہ ہے۔ میرے لیے تو یہ روز کا معمول ہے۔ ایک طرح سے میں اس کے ساتھ جینا سیکھ گئی ہوں۔'' اور میں نے دیکھا، اس نے اپنی کتاب اور کاپی زیر بحث حصے سے ہٹالی تھی۔

''تم واقعی ایک بہادر لڑکی ہو۔'' میں اپنی جگہ ٹھہر کر اس کی طرف تاک رہا تھا۔ میرے رکنے کے سبب اسے بھی رک جانا پڑا تھا۔ ''تم ٹیگور کو پڑھتی ہو؟'' میں نے اس کی کتاب کی طرف اشارہ کیا جس پر رویندر ناتھ کی جوانی کی تصویر بنی تھی۔

Scanned with CamScanner

''بالکل۔ میں کوی ٹھاکر کے گیتوں کی اچھی سنگر ہوں۔ محلوں کے ہر طرح کے فنکشن میں میرا بلاوا آتا ہے۔ میرا بھائی ریڈیو پر طبلہ بجاتا ہے۔''

''اور میں سمجھ رہا تھا کہ ٹیگور اب صرف ایک میوزیم کی یا ڈرائنگ روم میں سجانے کی چیز بن کر رہ گئے ہیں۔''

''یہ بھی صحیح ہے۔'' وہ بولی۔ ''کیا ہم آگے بھی ایک دوسرے سے مل سکتے ہیں؟''

''نہیں۔'' میں نے تحکمانہ انداز میں کہا۔ ''شاید میرا سفر یہیں پر ختم ہوتا ہے۔''

اور میں مڑ کر مخالف سمت چل پڑا۔ میں سنسان سڑک پر درختوں کے جھلملاتے سائے میں کچھ ہی دور چل پایا تھا کہ کسی نے میری پیٹھ پر دھول جمائی۔ یہ میرا دوست تھا جو ایک دوسرے راستے سے ہوتا ہوا میرے ساتھ آملا تھا۔

''تم نے پتا چلا لیا؟''

''کیا؟''

''کہ اس کا ایک پستان غائب کیوں ہے؟''

''وہ پوری طرح غائب بھی نہیں ہے۔ اور کبھی تم غسل خانے میں کپڑے اتار کر دیکھنا، تمھیں اپنا ایک فوطہ دوسرے کے مقابلے میں چھوٹا نظر آئے گا کیونکہ قدرت نے اسے ایسا ہی بنایا ہے۔'' میں نے جواب دیا۔ ''تب تم یہ سوال خود سے کر سکتے ہو کہ یہ چھوٹا کیوں ہے؟''

اور جانے کیوں، اس دن سے میری آنکھوں نے ہر چیز کو تولنا شروع کر دیا اور میں نے دیکھا، کچھ لوگوں کی ایک ٹانگ دوسری سے چھوٹی، کسی کی ایک آنکھ دوسری سے بڑی، کسی کے دونوں کان دو جسامت کے تھے۔ یہی نہیں، کسی کا ایک کندھا دوسرے سے زیادہ اونچا ہے، ایک بھوں دوسرے پر سوالیہ نشان بناتا ہے، دو گھٹنوں پر الگ قسم کی ہڈیاں لگی ہیں، دونوں نتھنے مقابلتاً چھوٹے بڑے ہیں، دونوں کولھے لباس پر الگ قسم کے خطوط ڈالتے ہیں۔ غرض، میں جدھر بھی دیکھ رہا تھا، جو بھی دیکھ رہا تھا، سب ایک دوسرے کی یکسانیت کا جھوٹا سوانگ بھرتے نظر آ رہے تھے۔ یہ کائنات، اس کا ہر فرد، ہر مذہب، ہر فرقہ، ہر سسٹم اپنے اندر کے ان تضادات سے بھرا پڑا تھا۔

اور یہ ابھی چند مہینے پہلے کی بات ہے...

Scanned with CamScanner

4 کوے شہر کے اصلی باشندے ہیں

ایک دن ایک کوے نے اپنی توجہ میری طرف کھینچ لی۔ یوں سارے کوے ایک جیسے نظر آتے ہیں اور یہ ممکن نہیں کہ ایک کوے کو ایک بار دیکھ کر دوسری بار آپ اسے پہچان لیں، مگر اس کوے کی ایک خاص پہچان تھی۔ اس کی نچلی چونچ آدھی ٹوٹی ہوئی تھی۔ وہ میری کھڑکی کے باہر ایک کیبل ٹی وی کے تار پر بیٹھا ڈول رہا تھا اور اپنی ٹوٹی چونچ کے سبب بڑا ہی مضحکہ خیز نظر آ رہا تھا۔ وہ زیادہ دیر اس جگہ رکا بھی نہیں۔ میرے دل نے کہا، اس کے اس عیب کے سبب دوسری بار شاید میں اسے پہچان جاؤں گا۔

اور یہ ایک ایسا واقعہ تھا جس نے ایک طرح سے میری دوری کوؤں کے ساتھ کم کر دی۔

اور میں نے دیکھا، ان کوؤں کے نیچے بسا ہوا اپنا یہ شہر، جس میں ان دنوں اونچی اونچی عمارتیں بن گئی تھیں، جس کے ایک کنارے ایک سپاٹ دریا بہتا تھا جس کے پانی پر ایک تھرمل پراجیکٹ کی راکھ دن بھر چمکتی تھی، جس کی سڑکیں زیادہ تر تنگ تھیں اور گلی کوچوں میں نالوں کے ناسور تھے، جہاں دھوپ تیز تھی اور ٹھنڈ سے دانت کانپتے تھے۔ دراصل اس شہر پر کوؤں کی حکمرانی تھی۔ اور میں ایک ایسا وجود تھا جو اپنی قوم کی غیر موجودگی پر اترایا ہوا، محض اپنے ہونے کی بنیاد پر، اپنے لمبے چوڑے نسب نامے پیش کر رہا تھا جبکہ میں اس قابل بھی نہ تھا کہ خود اپنے سائے سے نجات حاصل کر سکوں۔

میں اس واقعے کو کسی کے ساتھ شیئر کرنا چاہتا تھا، اور کوئی نہیں تو اپنی ماں کے ساتھ، جسے ناول پڑھنے کا جنون تھا اور ان دنوں وہ داستان امیر حمزہ کی ضخیم کتاب کی ورق گردانی میں مصروف تھی۔ اس کے ایک کردار عمرو عیار کا نہ صرف میں دیوانہ تھا بلکہ اس کتاب کی بھونڈی تصویروں کے سبب یہ مجھے کافی پسند تھی۔

میری ماں کے کمرے میں پلنگ کے سرہانے کمرے کی واحد کھڑکی تھی جس پر ایک دبیز پردہ جانے کب سے پڑا ہوا دھول کھا رہا تھا۔ اس کمرے میں جو بھی روشنی آتی وہ دروازے سے آتی جو سیدھے آنگن میں کھلتا تھا جہاں ایک ہینڈ پمپ کے نیچے دھونے کے لیے برتن ہمیشہ جمع رہتے جنھیں صاف کرنے سے پہلے پاس پڑوس کی بلیاں جھنڈ بنا کر نمودار ہوتیں۔ اس وقت کمرے کے دروازے پر

Scanned with CamScanner

کوئی پردہ نہ تھا۔ اس کا چوبی ہیلمٹ اپنی کیلوں کے ساتھ ایک دن اچانک فرش پر آ گرا تھا جس کے بعد اس کا پردہ اتار کر ہیلمٹ کو نے میں کھڑا کر دیا گیا تھا جس پر جمی دھول کی تہہ میں کسی نے انگلی سے لکیر کھینچ کر ایک راکشس کا سر بنانے کی کوشش کی تھی۔ ماں نے اپنی کتاب سے سر اٹھا کر میری طرف دیکھا۔

''تمھیں بھوک لگی ہے؟''

مجھے یاد آیا، آج صبح سے میں نے کچھ کھایا نہیں تھا۔ لیکن اس وقت میری بھوک سے زیادہ اہم معاملہ میرے سامنے درپیش تھا۔

''ہم اس شہر میں کیسے آئے؟'' میں نے اچانک دریافت کیا۔

''اگر تمھارا مطلب تمھارے دادا جان سے ہے تو وہ ٹرین میں نوکری کے دوران مختلف شہروں کا چکر لگاتے ہوئے یہاں آئے اور یہیں کے ہو رہے۔ انھوں نے یہاں اپنا مکان بنایا۔'' پھر ماں نے اپنی بات روک کر پوچھا، ''لیکن اچانک یہ سوال تمھارے ذہن میں کیوں آیا؟''

''کووں کے سبب،'' میں نے جواب دیا۔ ''مجھے لگتا ہے، یہ ہم سے پہلے سے اس جگہ موجود ہیں، اور ہم انسانوں کے بعد بھی موجود رہیں گے۔ یہ اس شہر کے اصلی باشندے ہیں۔ ہم محض trespassers ہیں۔ اچھا ماں، تم اتنی کتابیں کیوں پڑھتی ہو؟''

''یہ مجھے اچھی لگتی ہیں۔ یہ میرے بچپن کی عادت ہے۔''

''تم عینک کے ساتھ بالکل بھی اچھی نہیں لگتیں۔''

''اوکے۔'' اس نے عینک کو ناک سے نیچے اتار لیا اور خوش دلی کے ساتھ بڑی بڑی ننگی آنکھوں سے میری طرف تاکنے لگی۔ اسے عینک اتارے ابھی چند سیکنڈ بھی نہ ہوئے ہوں گے مگر اس کی آنکھوں میں ایک رقیق مادہ بننے لگا تھا۔ عینک نے اس کی ناک کے پل کے دونوں طرف بدنما دھبے بنا ڈالے تھے۔ ''اب میں کیسی لگ رہی ہوں؟''

''اور بھی بری،'' میں نے کندھے اچکا کر کہا۔ مجھے پتا تھا، ہمیشہ کی طرح ہمارے درمیان ایک بہت ہی تناؤ بھری خاموشی حائل ہو جانے والی ہے۔ ''ابا ہفتوں غائب رہتے ہیں اور تم ایک جانور کی زندگی جی رہی ہو۔''

''شٹ اپ! اپنے باپ کے بارے میں ایسی باتیں نہیں کرتے۔''

میں خاموشی سے اس کی طرف دیکھا کیا۔

اور ماں ایک ٹک میری طرف تاکتے تاکتے ہنس پڑی۔ اس نے کتاب تکیے پر رکھ کر اپنی ٹانگیں پلنگ سے نیچے کیں، پیر سلیپر کے اندر ڈالے اور کہا: "چلو تمھارا کھانا گرم کر دیتی ہوں۔"

میں نے محسوس کیا، میری بھوک غائب ہو چکی تھی۔

"اب مجھے بھوک نہیں ہے۔" میں پلٹ کر آنگن میں چلا آیا جہاں ہینڈ پمپ پر ایک کوا بیٹھا اپنے پنجوں کے بیچ ایک ناقابل شناخت چیز تھامے اس پر اپنی چونچ آزما رہا تھا۔

اس کوے کی چونچ سالم تھی۔

اور یہ کچھ برس پہلے کی بات ہے کہ...

5 خوشی کا فلسفہ

"اور یہ صدیوں پہلے کی بات ہے کہ ایک بادشاہ ہوا کرتا تھا۔" اماں نے بستر پر پڑے پڑے میری چھوٹی بہن کو کہانی سنانا شروع کی۔

"ان کہانیوں میں بادشاہ ہمیشہ صدیوں پہلے یا بہت دنوں پہلے کیوں ہوا کرتے ہیں، جبکہ یہ جانور آن بھی پائے جاتے ہیں؟ خود یہ کہانیاں بہت دنوں پہلے کیوں پیش آتی ہیں؟" میں نے دخل اندازی کی۔ میں اس کمرے میں ان دنوں چھوٹی بہن کے ساتھ سوتا تھا۔ مجھے یہ دبلی پتلی، دق زدہ لڑکی پسند تھی جسے گدگدی بالکل نہیں ہوتی تھی۔ گرچہ اسے مرنے میں ابھی کئی سال باقی تھے مگر جانے کیوں ہمیں اس کا احساس ہونے لگا تھا کہ وہ زیادہ دنوں تک زندہ رہنے والی نہیں۔

"انسان کے آج میں کوئی خوشیاں نہیں ہوتیں۔" ماں بولی۔ "اس لیے اسے ڈھونڈنے کے لیے ہمیں ہمیشہ بہت پیچھے جانا پڑتا ہے، ایک ایسے ماضی کی طرف لوٹنا پڑتا ہے جس کا کوئی وجود نہیں ہوتا۔ ماضی ہمارے ذہن کی دریافت ہے جسے ہم سجا سنوار کر رکھتے ہیں تاکہ ہم اس کی کوئی کہانی یا گیت بنا سکیں۔ ہم لوگ ایک جھوٹی دنیا میں جینے کے عادی ہیں۔"

"کیوں؟"

Scanned with CamScanner

''اس سے ہمیں آسانی ہوتی ہے۔وہاں ہمیں کسی بھی چیز کو پانے کے لیے زیادہ انتظار یا محنت نہیں کرنی پڑتی۔''

''ماں، آگے ... '' دق زدہ لڑکی نے کہا اور جب کہ ماں اسے کہانی سنا رہی تھی، میں سوچ رہا تھا، واقعی تصور ہماری کتنی بڑی پناہ گاہ ہے، اگر یہ نہ ہوتا تو ہم سب پاگل ہو جاتے۔

ورد دوسرے دن اس کھمبے کے سامنے کھڑے ہو کر جہاں بکریوں کی بلی دی جاتی تھی، میں نے دور سرسبز کھیتوں میں اگے ہوئے نئے نویلے گھروں کی طرف دیکھا جو افق تک پھیلے ہوئے تھے اور میں نے فتویٰ صادر کیا کہ ان ہی میں سے کہیں پر اس چھوٹے پستان والی لڑکی کا گھر ہونا چاہیے۔ اور ایک ایسے آسمان کے نیچے جہاں اڑتے ہوئے تمام کووں کی چونچ سالم تھی۔ میں نے اپنے غیر موجود دوست سے کہا:

''تم مجھے سن رہے ہو؟''

''ہاں۔''

''یہ ہمارا شہر کتنا خوبصورت ہے۔''

''کیونکہ تم اسے پہلے بار دوسروں کی بجائے اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہو۔ تم چاہو تو اسے اور بھی خوبصورت بنا سکتے ہو۔''

''تمھیں اس کوے کا علم ہے جس کی نچلی چونچ ٹوٹی ہوئی ہے؟''

''کون سا کوا؟ تمھاری خوبصورت دنیا میں ایسے کسی بدصورت کوے کا وجود نہیں ہو سکتا۔''

''تمھیں پتا ہے، وہ چھوٹے پستان والی لڑکی کہاں رہتی ہے؟''

''تم جہاں بھی چاہو، اسے پا سکتے ہو۔ بلکہ تم دیکھو گے، تمھاری خاطر اس کے دونوں پستان ایک جسامت کے ہو گئے ہیں۔''

''تمھارا مطلب ہے، اس کے سلسلے میں میں اپنی مرضی کا مالک ہوں؟''

''بالکل!''

''اور وہ دریا جو ہمارے شہر کے کنارے بہتا ہے؟''

''تمھیں شاید اس کا علم نہ ہو، وہ ایک ہی دریا ہے جو دنیا کے ہر ملک میں، ہر شہر میں بہتا ہے۔

اور چونکہ اب تم اپنی آنکھوں سے اس دنیا کو دیکھنے لگے ہو تو تم دیکھ سکتے ہو، اس کا پانی کثیف نہیں رہا، صاف ہو چکا ہے۔ اس میں کشتیاں چل رہی ہیں اور اس کے دونوں کناروں پر ناشپاتی اور سفیدے کے پیڑ اگے ہوئے ہیں۔"

"تم واقعی میرے سچے دوست ہو۔"

"شکریہ! آخرکار تم نے مجھے پہچان لیا۔ مگر میرے خدا، کتنا وقت لیا تم نے!"

"تو وقت آگیا ہے کہ آزادی کے چبوترے پر بیٹھ کر ہم بگل کے بجنے کا انتظار کریں؟"

"یہ بگل تو کب کا بج چکا۔ اب تو آزادی کا رنگ بھی اترنے لگا ہے۔"

اور میں نے اپنی دھندلی آنکھوں سے دیکھا، واقعی ہمارا آج دھند میں ڈوبا ہوا سیاہ اور داغدار ہے جس میں میری دق زدہ بہن اپنی قبر کے آس پاس جی رہی ہے اور میری ماں اسے خوبصورت بنانے کے لیے ماضی کی بازیافت میں مصروف ہے جس کی طرف وہ ہمیں گھسیٹ کر لے جانا چاہتی ہے اور وہ واقعی ایک ایسی دنیا ہے جہاں کوئی خونی کھمب نہیں، کوئی چھوٹے پستان والی لڑکی نہیں، کوئی نوکیلی چونچ والا الو نہیں۔ دنیا کے ہر شہر کی طرح اس شہر کے کنارے بہنے والا دریا بالکل صاف ہے، اس میں کوئی کثافت نہیں اور اس کے دونوں کنارے ناشپاتی اور سفیدے کے پیڑ اگے ہوئے ہیں۔

صرف اس شہر میں میری عمر کا ایک لڑکا ہے جسے اپنی عمر اور ماحول کے مطابق جینے سے انکار ہے۔

❁

شہر، میں اور چند بے تکے واقعات

1 فاختہ کا گھونسلا

مجھے اپنے شہر کے راستوں پر بلاوجہ چلنے کی بیماری ہے۔ یہ دھول بھرے راستے، جہاں جگہ جگہ نالوں کی سڑاند ہے، جو اتنی اچھی حالت میں بھی نہیں کہ ان پر چلنے کا لطف اٹھایا جائے، مگر جب آپ ایک

Scanned with CamScanner

ہی عادت کو بار بار دہراتے ہیں تو اس میں ایک قسم کا لطف پیدا ہو جاتا ہے: معمولی سے معمولی چیزیں بھی ایک نیا رنگ اختیار کر لیتی ہیں اور آپ کو ان میں وہ ساری باتیں نظر آنے لگتی ہیں جو دوسروں کو دکھائی نہیں دیتیں۔ اور حقیقت یہ ہے کہ اب میرے شہر کے راستے میرے لیے دوسری اہمیت کے حامل ہو چکے ہیں، ایک ایسی اہمیت جسے لفظوں کی شکل دینا تقریباً ناممکن ہے۔

ایسے ہی ایک دن چلتے ہوئے میں نے نبی حسن کو دیکھا۔ وہ ایک پرانی عمارت کی بیرونی دیوار پر سیڑھی لگائے، اس کے ڈرین پائپ کی مرمت کر رہا تھا جس پر موسم در موسم کائی سوکھ کر اس کی پپڑیاں جم گئی تھیں۔ مجھے یہ عجیب لگا کیونکہ وہ کبھی کوئی مستری یا پلمبر نہیں رہا تھا۔ اس نے لنن کی پتلون پر ایک تنگ ٹی شرٹ چڑھا رکھی تھی جس کے سبب اس کا بھاری بھر کم سینہ عورتوں کے پستان کی طرح ابھر آیا تھا۔ وہ اپنی دبیز دو ماسکی عینک کے سبب تقریباً چار آنکھوں والا نظر آ رہا تھا۔ اس نے کام روک کر میری طرف دیکھا، اپنا کام بند کر دیا اور سیڑھی سے نیچے اتر آیا۔ اب اس کا ایک ہاتھ میرے کندھے پر تھا اور دوسرا کمر پر، اور وہ کسی بھاری بھر کم سالخوردہ عورت کی طرح کھڑا میری طرف تاکتے ہوئے مسکرا رہا تھا۔

''شہر کی کیا خبر ہے؟'' اس نے پوچھا: ''اور صبح سے کتنی دھوں پھانک چکے؟ کیا میں تمھاری کوئی مدد کر سکتا ہوں؟''

''مجھے پتا نہیں تھا کہ تم یہ کام بھی کر لیتے ہو۔''

میں نے اس کے ہاتھ کو ہٹانے کے لیے اپنے کندھے میں کسمساہٹ پیدا کی، مگر اس کی گرفت پہلے سے کچھ زیادہ مضبوط ہو گئی جیسے اسے مجھے چھوڑنا پسند نہ ہو۔

''اچھا تو اپنا کام کرو اور مجھے جانے دو، دھول پھانکنے کے لیے جیسا کہ تم نے ابھی کہا ہے۔''

''ارے نہیں، رکو تو۔ ۔ ۔ اور تم مجھے غلط سمجھ رہے ہو، میں کوئی پائپ مستری نہیں۔ دراصل وہاں ایک فاختہ کا گھونسلا ہے جہاں پائپ کے ٹیڑھا ہو جانے کے سبب فاختہ کے انڈے کبھی بھی زمین پر گر سکتے ہیں۔ میں نے گھونسلے کو سیدھا کر دیا ہے اور انڈے بھی ترتیب سے سجا دیے ہیں، اپنے غائب دماغ دوست حمدانی کے لیے، جس کا یہ گھر ہوتے ہوئے بھی جس کا زیادہ وقت شراب خانے میں گزرتا ہے۔ اور تم تو جانتے ہو، میں یاروں کا یار ہوں۔''

''اور تم سمجھتے ہو، فاختہ اب اس گھونسلے پر اترے گی؟ اس کا استعمال کرے گی؟'' میں ڈرین پائپ کے بین وسطی حصے سے نکلے ہوئے تنکوں کی طرف دیکھ رہا تھا جہاں سے ایک چھوٹا سا بیضوی گھونسلا جھانک رہا تھا۔ ''اب ان انڈوں سے کبھی بچے برآمد نہیں ہوں گے۔ تمھیں انھیں ہاتھ نہیں لگانا چاہیے تھا۔''

''تمھیں یقین ہے؟'' بی حسن کی دوہری آنکھوں میں تردد نظر آرہا تھا۔ ''میں نے تو یہ سوچا ہی نہیں تھا۔ تمھیں چڑیوں کی نفسیات کا علم ہے۔ پھر تو بہت برا ہوا۔ کیا میرے کرنے کے لیے کچھ ہے؟''

''اس گھونسلے سے دور ہی رہو تو بہتر ہے،'' میں نے کہا۔ ''ہو سکتا ہے، فاختہ کو انڈوں پر تمھاری انگلیوں کا نشان نظر نہ آئے اور انڈوں کی قسمت جاگ اٹھے۔''

''کون جانے!'' اس نے اپنا ہاتھ میرے کندھے سے ہٹا لیا۔ ''تم نے مجھے عجیب وسوسے میں ڈال دیا۔''

''جانے بھی دو،'' میں نے پیچھا چھڑانے کے لیے کہا۔ مجھے محسوس ہوا میں نے خواہ مخواہ اس کے معاملے میں ناک بہت اندر تک ڈال دی ہے۔ ''میں نے تو سرسری طور پر یہ بات کہہ دی تھی۔ یہ صرف میرا اندازہ ہے۔ بھلا فاختہ کی عادتوں کے بارے میں مجھے کیا پتا؟''

''نہیں نہیں، تم شاید ٹھیک کہہ رہے ہو۔ تمھاری بات میں دم ہے،'' اس نے دیوار کی طرف جاتے ہوئے کہا۔ وہ سیڑھی اٹھا کر عمارت کے پھاٹک سے اندر جا رہا تھا تو اس کے کندھے جھکے ہوئے تھے اور اس کے قدم ایک مفتوح انسان کی طرح زمین پر دھیرے دھیرے گر رہے تھے۔

2 کدم کے پھول اور دن بدن موٹی ہوتی لڑکی

لوٹتے مون سون کے سبب شہر میں اچانک بارش ہو گئی ہے۔ یہ جاڑے کی شروعات ہے۔ بارش نے زیادہ تر پیڑوں سے پتے گرا دیے ہیں اور چوراہے پر کھڑے پتھر کی مورتیوں کو اچھی طرح سے دھو ڈالا ہے، گرچہ ان میں سے چند مورتیوں پر چڑیوں کی بیٹ کی ضدی لکیریں اب بھی قائم ہیں۔

میں اس بارش کے لیے تیار نہ تھا۔ میں ایک جگہ کھڑا سڑک سے گزرتے لوگوں کا جائزہ لے رہا

تھا جو سردی کے اچانک بڑھ جانے کے سبب اپنے آپ میں سکڑے ہوئے چل رہے تھے، جیسے تھوڑی سی ڈھیل دینے پر وہ تنکوں کی طرح بکھر جائیں گے، جب میری نظر ہمارے محلے کی ایک اینگلو انڈین لڑکی میری لوئی کی طرف گئی؛ میری لوئی جس نے اچانک موٹی ہونا شروع کر دیا تھا جس کے سبب نہ صرف یہ کہ اس کی ایک الگ شناخت بن گئی تھی بلکہ وہ کافی مشہور بھی ہو گئی تھی۔ وہ ایک سرخ میکنٹوش پہنے، کسی تل چٹے کی طرح نظر آ رہی تھی، اور زمین پر گرے ہوئے کدم کے گیند نما پھولوں کو پلاسٹک کی ایک سبز تھیلی کے اندر جمع کر رہی تھی۔

''میری لوئی،'' میں نے اس کے سامنے رک کر کہا، ''تم ان پھولوں کا کیا کرو گی؟ نہ یہ صحیح خوشبو دیتے ہیں نہ یہ کھائے جاتے ہیں۔''

''تمھیں تو پتا ہے، ہمارا کنبہ چینیوں کی طرح بڑا ہے جنھیں گننے کے لیے تمھاری دونوں ہاتھوں کی انگلیاں کم پڑ جائیں۔ تو میرے گھر میں ڈھیر سارے چھوٹے بچے ہیں،'' میری لوئی نے کہا۔ ''وہ ان کے ساتھ کھیلنا پسند کریں گے۔''

''اور اگر انھوں نے انھیں کھانا شروع کر دیا تو؟'' میں نے کہا۔ ''ان پھولوں کے بارے میں کچھ کہا نہیں جا سکتا۔ بلکہ یہ تو پھول سے زیادہ پھل نظر آتے ہیں، جو ہو سکتا ہے کچھ خاص قسم کے کُکرمتوں کی طرح زہریلے ہوں۔''

''تمھیں یقین ہے؟''

''مجھے پورا یقین تو نہیں۔ . .'' میں نے ہچکچاہٹ کا اظہار کیا۔ ''مگر میں یہ بھی یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ یہ بے ضرر ہیں۔ میں نے دیکھا ہے، بکریاں تک انھیں سونگھ کر چھوڑ دیتی ہیں۔''

ایک پل کے لیے وہ چپ چاپ کھڑی رہی جیسے کسی نے اسے جادو کی چھڑی سے چھو کر موم کی مورتی میں بدل دیا ہو۔ پھر اس نے اپنا ایک ہاتھ تھیلی کے اندر ڈالا اور ایک پھول برآمد کیا جس کی برش نما گلابی سطح کافی خوبصورت نظر آ رہی تھی۔ یہ پھول واقعی قدرت کا ایک انوکھا شاہکار تھا۔

''کیا اتنی خوبصورت چیز زہریلی ہو سکتی ہے؟'' اس نے شک بھری نظروں سے میری آنکھوں کے اندر تاکتے ہوئے کہا۔ ''تم نے مجھے عجیب مخمصے میں ڈال دیا ہے، اور تمھیں کسی بات کا یقین بھی نہیں ہے۔''

Scanned with CamScanner

اچانک مجھے احساس ہوا کہ میں نے ایک ایسے معاملے میں ٹانگ اڑائی ہے جس سے میرا کوئی واسطہ نہیں۔

"ویسے بچوں کو اسے دینے میں کوئی مضائقہ نہیں" میں نے کندھے ہلا کر کہا۔ "صرف ان پر نظر رکھنا ضروری ہے کہ وہ اسے کھیلنے کی چیز سمجھیں نہ کہ کھانے کی۔"

"عجیب آدمی ہو تم!" میری لولی کی آنکھوں میں عورتوں والا غصہ جھلک رہا تھا۔ "انھیں زہریلا بھی کہہ رہے ہو اور بچوں کو دینے کی ہدایت بھی کر رہے ہو، جبکہ تم جانتے ہو اتنے سارے بچوں پر بیک وقت نظر رکھنا تقریباً ناممکن ہے۔"

اس کی متحمل ہوتی آنکھوں کی طرف تاکتے ہوئے مجھے اس کے بھاری بھرکم بدن کا احساس ہوا جس سے ایک عجیب طرح کا اسرار جھلک رہا تھا، اور میں خوفزدہ ہو گیا۔

"میرا مطلب ہے۔۔۔" میں نے کہا۔ "میں تو صرف اپنا اندیشہ ظاہر کر رہا تھا۔ یہ پھل واقعی زہریلا ہے یا نہیں، اس کا علم مجھے بھی نہیں ہے۔"

"اور ابھی تھوڑی دیر پہلے تم اسے پھول کہہ رہے تھے۔"

"میرا خیال ہے اسے پھل بھی کہا جا سکتا ہے اور پھول بھی۔"

"تم مجھے بیوقوف بنا رہے ہو نا؟" اس نے پلاسٹک کی تھیلی کو الٹ کر خالی کرتے ہوئے کہا۔ "جب سے مجھے تھرومبوسز کی بیماری ہوئی ہے، لوگ مجھے بیوقوف سمجھنے لگے ہیں۔ کیا میں بیوقوف نظر آتی ہوں؟ کیا میں اپنے گھر کے بچوں کو نہیں جانتی؟"

میری لولی کے جانے کے بعد میں دیر تک زمین پر گرے ہوئے کدم کے ان پھولوں کی طرف تاکتا رہا جو اس نے تھیلی سے انڈیلے تھے۔ میں نے سر اٹھا کر سڑک پار دیکھا جہاں کثیر منزلہ مکانوں کے اوپر سنہری بادلوں کی دھاریاں چمک رہی تھیں، جیسے کسی نے آسمان پر رنگین چاک سے لکیریں کھینچ دی ہوں۔ بارش تو تھم چکی تھی مگر کچھ نیم سیاہ بادل اب بھی آسمان کے ایک کونے پر بے حس و حرکت موجود تھے، جیسے وہاں ٹھہر کر اس گیلے اور ویران شہر کا جائزہ لے رہے ہوں۔

کدم کے پھولوں کو اپنے جوتے کی نوک سے ادھر ادھر کرتے ہوئے مجھے ان بچوں کے لیے افسوس ہونے لگا جو ان پھولوں سے کھیل سکتے تھے اور میری وجہ سے ان سے محروم کر دیے گئے تھے۔

Scanned with CamScanner

3 ہجڑا ابراہیم پوار کی زندگی کا ایک دن

لوہے کے پرانے کھمبوں کے مقابلے کنکریٹ کے یہ بدنما کھمبے سارے شہر کو بدنما بناتے ہیں۔ ان پر لگے کارپوریشن کے ٹیوب لائٹ زیادہ تر جلنے سے انکار کر دیتے ہیں، جو ایک طرح سے اچھا ہے کیونکہ اس سے آس پاس کی بدرنگ دنیا پر پردہ پڑا رہتا ہے۔ میری یہ منطق ابراہیم پوار کو نہیں بھاتی جو اچھا خاصا مرد تھا مگر ہجڑے کا سوانگ بھر کر ٹرینوں اور بسوں میں داخل ہو کر یا زیبرا کراسنگ پر ڈراوھمکا کر لوگوں سے بھیک کے پیسے وصولتا تھا۔

"دن کے وقت تو سب کچھ دکھتا ہے،" ابراہیم پوار نے سانپ نما چوٹی اپنے نقلی پستانوں کے بیچ گراتے ہوئے کہا۔ "پھر ان کھمبوں کو کوسنے سے فائدہ؟ یہ کتنا چھپاتے ہوں گے؟"

"یہ دن تو خود ہی بدصورت ہوتے ہیں،" میں نے ضد کی۔ ہم دونوں ایک بس اسٹاپ کے ریلنگ پر اپنی اپنی طرف کے پائپوں کو تھامے بیٹھے ہوئے تھے۔ "دن کے وقت ہر چیز پر اتنی زیادہ روشنی پڑتی ہے کہ وہ چیز غائب ہو جاتی ہے، صرف روشنی رہ جاتی ہے۔ ہم صرف دن کی روشنی دیکھتے ہیں۔"

"اگلی بار تم کہو گے، ہم لوگ دن کے وقت ہوتے ہی نہیں۔"

"ہم کسی بھی وقت کیا کچھ ہوتے ہیں؟ اچھا بتاؤ، کیا ہو تم؟"

"میں ایک پورا مرد ہوں۔ میری دو ٹانگیں ہیں، دو ہاتھ ہیں، ایک سر ہے۔"

"یہ تو دو ٹانگیں ہیں، ہاتھ ہیں، سر ہیں۔ تم ان میں کہاں ہو؟"

"عجیب آدمی ہو تم! یہ ہیں تب نا میں ہوں۔"

"تمھارے پاس تو نقلی پستان بھی ہیں۔ تو کیا ان کے سبب تم عورت بن گئے ہو؟ تمھاری ماہواری شروع ہو گئی ہے؟"

سامنے سڑک پر ایک کھٹارا بس آ کر رکی۔ اس کے کنڈکٹر نے، جو دروازے پر لٹکا ہوا تھا، سڑک کے کنارے اتر کر اپنی پوری طاقت لگا کر ناک صاف کی جو کسی بگل کی طرح بج اٹھی۔ کئی مسافر اترے، کئی چڑھے۔ کچھ لوگوں نے دلچسپی سے ابراہیم کو دیکھا۔

Scanned with CamScanner

''دیکھتا کیا ہے بے؟'' ابراہیم پوار نے ہاتھ بجا کر انھیں خبردار کیا۔ ''اپنے گھر میں ماں بہن نہیں ہے کیا؟''

''جب عورت بنی ہو تو عورت کی آواز نکالا کرو،'' میں نے کہا۔

''سالے لگتے تو سارے مہذب ہیں، مگر ذرا دو تو پتلون تک اتار دیتے ہیں۔'' ابراہیم پوار بولا۔ ''اور آگے یوں ہے کہ ایک دن میں نے ایک مرزیل بڈھے کو دیکھا جو اپنی کار کے اندر بیٹھا للچائی ہوئی نظروں سے میری طرف تاک رہا تھا۔''

''شاید اسے تمھاری ضرورت تھی۔''

''مجھے پتا ہے۔ طرح طرح کی دواؤں نے بڈھوں تک کو خراب کر دیا ہے۔''

ابراہیم پوار بنچ سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے اپنی انگیا کی کناری پکڑ کر نقلی پستان کا رخ سامنے کی طرف کیا۔

''اے ابراہیم،'' میں نے کہا۔

''ہاں، تو میں سن رہی ہوں نا؟''

''تم اپنی زندگی سے خوش ہو؟''

''کس مادر چود نے زندگی سے خوش ہونا ہے۔'' ابراہیم پوار ہنسا۔ ''مگر اتنے بڑے بدن کو قبر تک تو لے جانا پڑتا ہے۔ اتنی بیماریں، اسے کھلا پلا کر تندرست تو رکھنا ہے نا۔ اور یہ پیٹ، یہ سالی گندی پیٹ، بھائی جان اس پیٹ کا کیا کریں؟''

''میرا مطلب تم نے جو پیشہ اختیار کر رکھا ہے اس سے ہے،'' میں نے کہا۔ ''تم اتنے ہٹے کٹے ہو۔ تم بہت سارے کام کر سکتے تھے۔ اور تو اور تم شادی کر سکتے تھے، بچوں کے باپ بن سکتے تھے۔ وہ تمھارے کام آتے۔ تمھیں جینے کا ایک مقصد مل جاتا، جیسا کہ لاکھوں لوگوں کو مل جاتا ہے، ورنہ جانے وہ کیا کرتے۔''

''عورتوں سے مجھے گھن آتی ہے۔ انھیں دیکھتے ہی مجھے ان کی ماہواری کا خیال آجاتا ہے۔''

''جو ثابت کرتا ہے کہ تمھیں ایک عورت کی سخت ضرورت ہے۔'' میں ہنسا۔ اور جب وہ سڑک پر اتر کر کمر ہلاتے ہوئے، سانپ کی طرح بل کھاتے ہوئے ٹیکسیوں کی طرف بڑھ رہا تھا جو اس سے

Scanned with CamScanner

خوفزدہ جلدی جلدی پے شیشے اٹھا رہی تھیں، میں نے چلا کر کہا، "ابراہیم پوار، مجھے خدا حافظ تو کہو۔"

"اللہ حافظ کہو!" ابراہیم پوار نے مڑے بغیر مجھ سے کھلے عام پیچھا چھڑاتے ہوئے کہا۔

یہ ابراہیم پوار کے ساتھ میری آخری ملاقات نہیں تھی۔ جیسا کہ میں نے کہا ہے، مجھے اپنے شہر میں بلا وجہ چلنے کی بیماری ہے۔ ظاہر ہے اگر کوئی ابراہیم پوار نہ بھی ہوتا تو بھی میں اس کی تخلیق کر دیتا۔

4 چار رنگی ہوئی رنڈیاں اور ایک دیوداس

ہمارے شہر میں رنڈیوں کے کئی محلے آباد ہیں جہاں پولیس کے عملے کافی پیشہ ورانہ مہارت کے ساتھ امن و امان قائم رکھتے ہیں اور اس کے عوض اپنے حصے کا ہفتہ دیانت داری کے ساتھ وصولتے ہیں۔ یہ ایسے ہی ایک محلے کی داستان ہے جس میں ایک دن میں چار رنگی ہوئی رنڈیوں کے نرغے میں آ گیا۔

"کیوں یہاں بلا وجہ گھومتا پھرتا ہے بے؟" لانبے قد کی رنڈی نے، جس کے ابرو کٹاری کی طرح اوپر کو اٹھے ہوئے تھے اور جو ایک سگریٹ اس طرح پھونک رہی تھی جیسے وہ کوئی اسٹیم انجن ہو، تیوری پر بل چڑھاتے ہوئے کہا۔ وہ ان چاروں میں ہوتے ہوئے بھی ان سے الگ تھلگ لگ رہی تھی، جیسے وہ پورے معاملے سے بیزار ہو۔ "مفت کا مزہ لیتا ہے سیانا!"

"ریا، گھسیٹ لے سالے کو۔"

"لے، بھو چا گھسیٹ لے،" میں نے اپنے آپ کو پیش کرتے ہوئے کہا۔ مگر مجھے جلد پتا چل گیا کہ میں نے خوامخواہ اپنے آپ کو مصیبت میں ڈالا ہے کیونکہ اب دو سخت زنانہ ہاتھوں کی گرفت میرے کالر پر ہونے کے سبب مجھے اپنے پیروں پر کھڑے رہنے میں دقت آ رہی تھی۔ "میری اماں، اپنی جیب میں یک پھوٹی کوڑی بھی نہیں۔ کاہے اپنا وقت کھوٹا کرتی ہے۔"

"تو پھر تیری خالہ کا گھر ہے کہ ہر ہفتے آیا کرتا ہے؟" چوتھی رنڈی نے زمین پر تھوکتے ہوئے کہا جس کے دانتوں کے برس چمک اٹھے تھے۔ "چل اس سے بست ختمن کرواتے ہیں۔"

"کیوں، چھپے گا؟" ڈنبی رنڈی نے دوستانہ انداز اپناتے ہوئے کہا۔

"ادھر اُدھر بھینکوں گا تو اماں ڈانٹے گی نہیں؟" میں نے کالر ٹھیک کرتے ہوئے کہا، کیونکہ

Scanned with CamScanner

میں چھوڑ دیا گیا تھا۔ یہیں اس وقت ایک ادھیڑ عمر کا، کھچڑی داڑھی والا شخص دکھائی دیا جس نے ایک نفیس مفلر اپنی گردن سے لپیٹ رکھا تھا اور کافی رعونت کے ساتھ مٹھی میں سگریٹ تھامے، اس کے جلتے ہوئے سرے کو آسمان کے رخ کھڑا کر کے پھونک رہا تھا۔ وہ نشے میں دھت دکھائی دے رہا تھا۔

''اے دیوداس!'' تیسری رنڈی نے اسے پکارا۔ پوڈر سے لپا ہوا اس رنڈی کا چہرہ خنزیر کی طرح نوکیلا تھا اور ٹائٹ جینز کے سبب اس کے کولھے کافی بڑے اور بھدے نظر آ رہے تھے۔ ''تیری پھول جان تو گئی گاؤں۔''

''سالا، یہاں آنے کا سولھوا!'' دیوداس غرایا۔ ''اوپر سے جب دیکھو، گاؤں۔ کوئی مجھے بتائے گا، کیا رکھا ہے گاؤں میں؟'' یکا یک اس کی آنکھیں میری آنکھوں سے مل گئیں۔ ''کیا رکھا ہے گاؤں میں؟'' اس نے مجھ سے دریافت کیا۔

''کیا رکھا ہے گاؤں میں؟'' میں نے مڑ کر اس کا سوال چڑھی ہوئی بھنوؤں والی رنڈی کے سامنے انڈیل دیا جو ایک نیا سگریٹ نکال کر پچھلے سگریٹ سے سلگا رہی تھی ''اسی سے پوچھو نا۔ سیانا کو سب معلوم ہے!'' اس نے دیوار پر تھوکتے ہوئے کہا جس کے اوپر مستطیل کھڑکی سے اندر دیسی شراب خانے کا شور سنائی دے رہا تھا۔

''پوچھنے کی ضرورت نہیں۔'' دیوداس نے سگریٹ کا ایک لمبا کش لے کر دھوئیں کا چھلا بنایا جس میں لگ رہا تھا وہ کافی ماہر تھا کیونکہ چھلا نہ صرف دبیز تھا بلکہ دیر تک قائم رہا۔ ''میں بتاتا ہوں۔ ایک دن ایک گاؤں میں ایک بوڑھا مر گیا۔ تو لوگوں نے سوچا جلاون کی لکڑیاں کہاں سے لائیں۔''

''اچھا، اس کے گاؤں میں پہلے تو جینے کا کوئی سادھن ہی نہ تھا، اور اب چتا کی لکڑیوں کا کال بھی پڑ گیا۔''

''ٹوکو مت، کہانی خراب ہو جاتی ہے۔ یہ پھول جان کی عادت تم نے کہاں سے لگا لی؟ تو تین مسٹنڈے جنگل بھیجے گئے، جہاں تین چڑیلوں کی حکمرانی تھی، بھوکی پیاسی چڑیلیں جو زندگی بھر مردوں کو ترستی رہی تھیں۔ حاتی ہو، تینوں چڑیلوں نے مسٹنڈوں کا کیا کیا؟ ان کنواریوں نے انھیں سوکھے ٹھنٹھ میں بدل دیا۔ تب سے گاؤں میں لکڑی کا کال جاتا رہا۔ اب لوگ جتنا جی چاہیں مریں۔ اب یہ نہ پوچھو کہ چڑیلوں نے کیسے انھیں سوکھی لکڑیوں میں بدل دیا۔''

Scanned with CamScanner

"یہ تو کوئی بھی سمجھ سکتا ہے۔" میں نے مداخلت کی کیونکہ ان کے درمیان میری عدم موجودگی کا مجھے احساس ہونے لگا تھا۔ "ان تینوں ڈائنوں نے جوان عورتوں کا روپ دھار کر مسٹنڈوں کو نچوڑ دیا ہوگا۔ سفید یا سرخ، ایک بھی قطرہ بدن میں نہیں چھوڑا ہوگا۔"

"بالکل ٹھیک!" دیوداس نے پہلی بار میری طرف غور سے دیکھا۔ "اور یہ پھول جان کا دُوں نہیں جاتی۔ اس جنگل کی چڑیل ہے سالی، جو میرا خون چوستی رہتی ہے۔ دیکھو، دیکھو، میں دھیرے دھیرے لکڑی میں بدلتا جا رہا ہوں۔"

اور اس نے جھک کر اپنی پتلون کا پائنچہ اوپر گھٹنوں تک اٹھا دیا۔ واقعی اس کی ایک ٹانگ لکڑی کی تھی۔ اور جبکہ رنڈیاں جھک جھک کر اس کی لکڑی کی ٹانگ کو چھو رہی تھیں، کھلکھلا کر ہنس رہی تھیں۔ میں نے سوچا، کمال ہے، یہاں جانے کے لیے اتنا کچھ ہے اور میں تھا کہ بیکار شہر میں مارا مارا پھر رہا تھا۔

تو میں اس جگہ کھڑا اس لکڑی ٹانگ والے دیوداس کا انتظار کرتا رہا جسے ایک رنڈی کھینچ کر ایک کوٹھی کے اندر لے گئی تھی۔ دیوداس نے باہر نکلنے میں زیادہ دیر نہیں لگائی۔

"تم نے میری کہانی سنی؟" اس نے میری طرف تاکتے ہوئے کہا۔ شاید اندر اس نے تھوڑی سی اور چڑھا لی تھی۔

"ہاں، اور تمھاری لکڑی کی ٹانگ بھی دیکھی،" میں نے جواب دیا۔ "مگر تم بہت جلد باہر آ گئے۔"

"سالی کسی میں پھول جان والی بات نہیں۔"

"کچھ دیوداس پارو جیسا معاملہ ہے۔" اب ہم دونوں ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔

"بالکل بھی نہیں،" اس نے جواب دیا۔ "میں گھر کی کھونٹی سے بندھا ہوا کولہو کا بیل نہیں کہ ساری زندگی ایک ہی عورت کے ساتھ لپٹا رہوں۔ میں ایک آزاد دنیا کا انسان ہوں اور ایک آزاد آدمی کی طرح ہر چھ ماہ پر اپنی رنڈی بدل لیا کرتا ہوں۔ صرف اس بار تھوڑی سی غلطی ہو گئی۔ ہمیں چاہیے کہ ہم جب یہاں آئیں تو اپنے جذبات گھر پر رکھ کر آیا کریں۔"

"تم کب سے یہاں آ رہے ہو؟"

"جب میں نے پہلی بار یہاں چھاپہ مارا۔"

"تو تم پولیس میں ہو؟"

Scanned with CamScanner

''تھا۔ تمھیں اس چھاپے کے بارے میں تجسس نہیں؟''

''لگتا ہے، کہانی سنانا تمھیں پسند ہے۔''

''یہ کہانی نہیں۔'' وہ ہنسا۔ ''میں ٹریننگ لے کر نیا نیا سب انسپکٹر کے عہدے پر تھانے آیا تھا جب میں نے اپنے سپیریر کے کہنے پر، جو اچانک کسی وجہ سے مجھے بہت پسند کرنے لگا تھا، اس جگہ چھاپہ مارا۔ ان دنوں بنگلہ دیش کی کمسن لڑکیاں بڑی بھاری تعداد میں اسمگل کر کے یہاں لائی جا رہی تھیں۔ اب بھی لائی جاتی ہیں، اس سے بھی بڑی تعداد میں لائی جاتی ہیں، مگر اب دھندا کافی منظم ہو چکا ہے، اس میں تینوں پی (P)، یعنی پولیس، پمپ اور پولیٹیشین کی بھاگیداری بالکل صاف کر دی گئی ہے۔ تو اس چھاپے میں بہت سارے لوگ پکڑے گئے۔ جن میں خود ہمارے تھانے کا ایک حوالدار بھی تھا جو چڈی پہنے ایک چارپائی کے نیچے چھپا ہوا تھا۔''

''چڈی کیوں؟''

''وہ جلد بازی میں اتنا ہی پہن پایا تھا۔ آگے کا سنو۔ جب ہم پکڑے گئے لوگوں کے ساتھ تھانے لوٹے تو بڑے بابو انگریزی پی کر اوپر کی کوٹھری میں خراٹے لے رہے تھے۔ شور وغل سن کر وہ اپنی توند پر شرٹ کے بٹن لگاتے ہوئے لکڑی کی سیڑھی سے نیچے اترے تو ان کی باچھیں کھلی ہوئی تھیں۔ انھوں نے اپنے دونوں ہاتھ پھیلا کر مجھے اپنی آغوش میں لے لیا۔ 'مجھے پتا تھا، مجھے پتا تھا، میرے بیٹے۔۔۔' انھوں نے میرا چہرہ چومتے ہوئے کہا۔ 'تم جیسے لڑکے اس دیس کے مستقبل ہو۔'

''وہ تو ٹھیک ہے سر۔۔۔' میں نے حوالدار کو ان کے سامنے پیش کرتے ہوئے کہا، 'مگر پہلے اپنے دیس کا برتمان تو دیکھیے۔'

اور بڑے بابو سر پکڑ کر بیٹھ گئے۔''

''پھر حوالدار کا تم لوگوں نے کیا کیا؟''

''کرنا کیا تھا۔ سارے حوالدار اور کانسٹبل میرے ہاتھ جوڑنے لگے، بلکہ ان کی یونین کے لوگ بھی آگئے۔ یہ یونین والے بڑے چوتیا قسم کے لوگ ہوتے ہیں، کام چوروں کے دلال ہونے کے ساتھ ساتھ خود بھی کام چور ہوتے ہیں سالے۔ زبان سے زیادہ تو ان کی آنکھیں بولتی ہیں۔ ان کے دباؤ میں آکر خود افسروں نے مجھ سے رحم کی اپیل کی۔ مجبوراً فہرست سے اس کا نام کاٹنا پڑا۔ پھر

Scanned with CamScanner

میں نے پولیس کی وہ نوکری چھوڑ دی۔''

''کیوں؟''

''مجھے اس سے اچھی نوکری مل گئی تھی، جس میں اوپر کا پیسہ زیادہ تھا، بدنامی کم تھی اور رات کو چین سے آدمی اپنی جورو کے ساتھ سو سکتا تھا۔''

''مگر تمھاری تو جورو ہے نہیں۔''

''میں اس تجربے سے گزر چکا ہوں۔''

''اور یہ لکڑی کی ٹانگ؟''

''اس کی بھی ایک کہانی ہے۔'' وہ ہنسا۔ ''لیکن کیا تمھیں ایک ہی دن میں سب کچھ چاہیے؟''

اور وہ ٹرام کی پٹریوں کو پھلانگتا ہوا دوسری طرف چلا گیا۔

''تم مجھے گڈبائی نہیں کہو گے؟'' میں نے پیچھے سے چلا کر کہا۔

''گڈبائی، گڈبائی!'' اس نے ہاتھ ہلاتے ہوئے کہا اور ایک آٹو رکشا کو روک کر اس کے اندر بیٹھ گیا۔

میں ایک خوش نصیب آدمی ہوں۔ میرا شہر دن بدن پھیلتا جا رہا ہے، بلکہ اب تو کسی اونچی عمارت کی چھت پر کھڑے ہو کر اسے دریا سے گزر کر افق کو چھوتے دیکھا جا سکتا ہے۔ اور ایسے ہی ایک دن میں نے ایک فقیر کو دیکھا جو چنے سے ایک نقلی داڑھی بینے میں مصروف تھا۔ اور میں نے ایک باز کو دیکھا جو ایک اونچی عمارت کے کارنس سے نیچے تر رہا تھا۔ ہم تینوں کی آنکھیں ملیں اور مجھے لگا، ہم تینوں کے پاس اس شہر کے خفیہ دروازے کی کنجی ہے۔ اور میں نے فقیر سے کہا:

''تم نقلی داڑھی کے بغیر بھی مسکین لگتے ہو۔''

''ایک فقیر چمٹا، کشکول اور داڑھی کے بغیر کیا ہے؟''

''کیا ہے؟''

اس نے سر اوپر اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھا۔

''ایک شہر جس کی کوئی کہانی نہیں!''

❁

دریا، میں اور چند بے تکے واقعات

1 عرفان و آگہی کا سرمہ

دریا میں پانی اب اس وقت بہتا ہے جب بند سے چھوڑا جاتا ہے۔ باقی اوقات میں ریت سے ابھری ہوئی چٹانوں کے درمیان ان میں پانی اتنا ہی بچتا ہے کہ ریت اور مویشی اپنی پیاس بجھا سکیں۔ اس دریا کے کنارے ایک اونچی چٹان پر ایک پرانا مزار استادہ تھا جس کے کھلے زینے پر، جس کا کاروبار اب پھر سے شروع ہو چکا ہے، دو بوڑھے ایک دوسرے سے چونچ لگائے دنیا کے خلاف سازش کرتے نظر آتے ہیں۔ میرے ساتھ ہمیشہ یہ ہوا ہے، جب بھی میں اپنی سائیکل پر سوار اس مزار پر وارد ہوا ہوں۔

اس مزار میں میرا آنا کسی عقیدے کے تحت نہیں بلکہ اس کے مجاور شیخ حمزہ سے ملنے کے لیے ہے، جو دس سال قبل تک مستری کے کھیتوں میں بھینسیں چرایا کرتا تھا۔ پھر ایک دن اسے ایک کالے کمبل والے فقیر نے اپنے ساتھ لیا اور دنیا کو تسخیر کرنے نکل کھڑا ہوا۔ حمزہ پانچ سال تک شہر سے غائب رہا۔ نمودار ہوا تو کئی کرشموں کا مالک تھا اور ایک خاص سرمے کا موجد، جس کے لگانے والے کی آنکھیں عرفان و آگہی کی دنیا پر کھل جاتی تھیں۔ واپسی پر سب سے بڑا کارنامہ اس نے یہ انجام دیا کہ اس جڑی بوٹی مزاری، جسے لوگ بھول چکے تھے، از سر نو دریافت کی۔

”تم کس سے زیادہ دھوکا اور دنیا کو نہیں دے سکتے،“ میں نے اس کے بڑھائے ہوئے چلم کا ایک مبارک کش لیتے ہوئے کہا۔ ”پھر بھی تم اور بہت سارے لوگوں سے اچھے ہو۔“

”کن معنوں میں؟“ حمزہ نے اپنی گھنی، کم لانبی، لگی مہندی سے سرخ داڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا جس کے اندر اس کی کیلوں مہاسوں سے ڈھکی ہوئی جلد صاف دیکھی جا سکتی تھی۔

”مثلاً اس طور پر تمہارے کرشمے بے ضرر ہیں۔“

”میں اسے کرشمے نہیں کہتا،“ اس نے کہا۔ ”اور وہ بے ضرر قطعی نہیں۔“

Scanned with CamScanner

''اور تمھارا سرمہ واقعی انسان کو عرفان و آگہی کی دنیا میں لے جاتا ہے۔''

''تمھیں یقین ہے؟ تم نے تو کبھی ان سرموں کو وقعت نہ دی۔''

''میں نے ان لوگوں کا جائزہ لیا ہے جو یہ سرمہ لگاتے ہیں،'' میں نے کہا۔ ''اور میں نے ایک بڑی بی کو دیکھا ہے جو اس سرمے کے سبب اپنے مسی سے سیاہ دانتوں سے، جواب دو ہی بچے تھے، بڑے ہی پراسرار ڈھنگ سے مسکرا رہی تھی۔''

''واقعی!'' حمزہ نے اپنی چندیا سے پسینے کے قطرے صاف کیے۔ اس کے حلقوم نے اوپر سے نیچے اور پھر نیچے سے اوپر اٹھ کر اس کے زندہ رہنے کا ثبوت پیش کیا۔ اور میں نے سوچا، جہاں تک میرا تعلق ہے، حمزہ کا میں نے آج بھر حاصل تجزیہ کر دیا ہے۔ میں نے اس سے اجازت لی، ڈھلان پر سائیکل کو بغیر پیڈل مارے چلا کر دریا کے کنارے تک لایا اور ایک چٹان پر اپنا پیر ٹکا کر ان بیل گاڑیوں اور سائیکلوں کی طرف تاکنے لگا جو چٹانوں کے بیچ ریت اور پتھروں پر راستہ بناتے ہوئے، چوری کے کونوں کے ساتھ، ایک ٹیڑھی میڑھی قطار میں دریا پار کر رہے تھے۔

دور کی کسی مسجد میں عصر کی اذان ہو رہی تھی جب میں مزار واپس لوٹا۔ اس کی مسجد میں نماز کی تیاری ہو رہی تھی۔ لوگ مصلوں پر کھڑے ہونے لگے تھے۔ شیخ حمزہ خود اس مسجد میں امامت کرتا تھا۔ مجھے یاد آیا، میں ایک ایسا مسلمان تھا جو کبھی کبھار نماز بھی پڑھ لیا کرتا تھا۔ تو میں نے حوض پر وضو کیا جس میں مچھلیاں اپنے چھوڑے ہوئے فضلوں کے بیچ تیر رہی تھیں، اور نماز کے لیے پلاسٹک کی چٹائی پر کھڑا ہو گیا۔

''آپ اسے سر پر باندھ لو،'' میری بغل میں کھڑے شخص نے، جو خود مسجد کی پلاسٹک کی کٹورے نما ٹوپی سر پر رکھے کھڑا تھا، پٹی جیب سے رومال نکال کر میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا جس سے سستے عطر کی تیز بو آ رہی تھی۔ گرچہ ایک رومال میری جیب کے اندر تھا مگر میں نے سر پر وہ رومال باندھ کر عطر کی بو کی چھتری کے نیچے نماز ادا کی۔ میں سائیکل پر واپس لوٹ رہا تھا جب مجھے رومال کا خیال آیا جسے میں اپنی جیب میں ڈال کر بھول گیا تھا۔ میں مزار سے کافی دور نکل آیا تھا اور ایک پٹرول پمپ کے سامنے، جہاں سڑک پر لاریوں کے کھڑے رہنے کے سبب جگہ جگہ گڈھے پڑ گئے تھے اور موبل کے دھبے گڈھوں میں جمے پانیوں میں قوسِ قزح کی طرح چمک رہے تھے،

Scanned with CamScanner

تذبذب کے عالم میں رکا ہوا تھا جب ایک ٹریلر اپنے کنٹینر کے ساتھ سڑک کو ہلاتے ہوئے گزری۔ اس کے بے شمار پہیے کافی دھول چھوڑ رہے تھے۔ مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے زمین اپنی پوری گولائی کے ساتھ میرے پیروں کے نیچے بل رہی ہو۔ دھول سے بچنے کے لیے سانس روک کر میں نے دیکھا، میرے سامنے ایک بطخوں سے ڈھکا تالاب تھا جس کے دوسری طرف ڈھلان میں سبز کھیتوں کے بیچ اینٹ کی ایک چمنی قرمزی آسمان میں دھواں انڈیل رہی تھی۔

میں تھوڑی دیر تک رومال کو انگلیوں کے بیچ رکھ کر مسلتا رہا۔

واپس لوٹا تو وہ شخص دکھائی نہ دیا۔ یا ہو سکتا ہے ہم دونوں ایک دوسرے کا چہرہ بھول گئے ہوں۔

''ایسا ہی ہوتا ہے۔'' حمزہ نے تیزی سے تاریک پڑتے ہوئے آسمان کی طرف اشارہ کیا جو اب پرانے تانبے کی طرح دھندلا ہو گیا تھا۔ ''وقت کسی کا انتظار نہیں کرتا۔ وہ ہر پل چیزوں کو گڈمڈ کرتا رہتا ہے۔''

''نیکی اور بدی کو بھی؟''

''ہر چیز کو، ہر چیز کو۔''

''پھر روزِ حشر ایمان والے کیسے پہچانے جائیں گے؟''

''یہ اس خدا پر منحصر ہے۔'' حمزہ نے تیزی سے غائب ہوتے ہوئے آسمان میں تاروں کی تلاش شروع کر دی تھی۔ ''وہ چاہے جس کا انتخاب کرے، جس کا نہ کرے۔ بہت مشکل ہے سمجھنا کہ نیکی کیا ہے، بدی کیا ہے۔ بہت مشکل ہے سمجھنا کہ تم کیا ہو۔ بہت آسان ہے سمجھنا کہ تم نے وفاداری کی۔ بہت مشکل ہے سمجھنا کہ کیا واقعی تم وفادار تھے؟''

جس تاریک آسمان کے نیچے پیدائشی چرواہا اور نو دریافت شدہ شیخ حمزہ کو میں چھوڑ آیا ہوں، مجھے یقین ہے وہ تاروں سے منور ہو چکا ہوگا اور گرچہ میرے سر پر پیچھے کی طرف پھسلتا ہوا آسمان وہی تھا مگر میرے غیر حاضر دوستو، یقین کیجیے، میرے خیالات بالکل تاریک تھے۔

بالکل تاریک جیسے ان پر کبھی کوئی تارا روشن نہ ہوا ہو۔

Scanned with CamScanner

2 اوندھی کشتیاں اور ایک لڑکی کا غیر اخلاقی تعاقب

ڈیم کی روشنیوں سے دور، دریا کے کنارے بہت ساری کشتیاں ٹیڑھی یا اوندھی پڑی ہیں۔ دن کے وقت ڈیم یہاں سے دکھائی نہیں دیتا۔ اس وقت کشتیوں پر لڑکے لڑکیاں کھیلنے میں مصروف ہوتے ہیں۔ ان کشتیوں پر کبھی کبھی کچھ حیرت انگیز طور پر رنگین چڑیاں بھی بیٹھی دکھائی دیتی ہیں۔ جانے یہ کہاں سے آتی ہیں۔ یہ کسی بھی موسم میں نظر آتی ہیں۔ میں یہ چڑیاں اسی جگہ دیکھتا ہوں۔ میرے شہر میں تو صرف کوّے ہیں یا چیل یا ایک آدھ باز یا کبوتر اور زیادہ تر گوریا کے غول۔ مگر مجھے شبہ ہے کہ ایک بار میں نے کسی کشتی کی نوک پر ایک English Robin کو بیٹھے دیکھا تھا جس کے سینے پر گہرا سرخ نشان تھا، اور مجھے یاد آیا کہ کہیں پر میں شاید پڑھ چکا ہوں کہ یہ چڑیاں کافی دلیر ہوتی ہیں۔ مگر مجھے اس کا اعتراف کرنے میں کوئی ہچکچاہٹ نہیں کہ مجھے ان کی دلیری آزمانے کا کبھی کوئی موقع نہیں ملا۔

اور ان ہی کشتیوں میں سے ایک پر ایک دن میں نے ایک لڑکی کو بیٹھے پایا۔ وہ شاید کالج سے واپس لوٹی تھی۔ اس نے اپنی سائیکل کنارے برگد کے ایک پیڑ سے ٹکا کر اس طرح کھڑی کی تھی کہ وہ اس پر نظر رکھ سکے۔

وہ بالکل معمولی شکل و شباہت کی مالک تھی، مگر جانے کیوں اسے دیکھتے ہی میرے اندر کے سوئے ہوئے چشمے بیدار ہو گئے۔ میں اس کی توجہ پانے کے لیے بے چین ہو اٹھا۔ میں نے اپنی سائیکل اس کی سائیکل سے ٹکا کر کھڑی کر دی اور اس سے الگ ہٹ کر تماشا دیکھنے لگا۔

"اے..." وہ لڑکی اپنا ہاتھ ہلا ہلا کر مجھ سے سائیکل کو وہاں سے ہٹانے کے لیے کہہ رہی تھی، اور جب اس نے دیکھ لیا کہ اس کی باتوں کا مجھ پر کوئی اثر نہیں ہوتا تو کتاب اور کاپیاں اٹھا کر کشتیوں کی نوکوں پر چلتے ہوئے کنارے آئی، میری طرف غصّے سے دیکھا اور میری سائیکل کو اپنی سائیکل سے الگ کرنے لگی۔ اسے بیک وقت دونوں سائیکلوں کو سنبھالنے میں کافی دقت پیش آ رہی تھی۔ میں دور کھڑا یہ تماشا دیکھ رہا تھا۔ بہت مشکل سے اس نے اپنی سائیکل باہر نکالی اور میری سائیکل کو تقریباً گراتے ہوئے پیڑ کی جڑ سے ٹکا کر کھڑا کر دیا۔ اس نے کیریر پر کلپ کے سہارے اپنی کتاب اور کاپیاں دبائیں اور دریا کے کنارے سڑک پر ڈگمگاتے ہوئے چل پڑی۔ اس کا دوپٹہ ہوا

Scanned with CamScanner

میں لہرا رہا تھا۔

میں اپنی سائیکل کی طرف دلچسپی سے تاک رہا تھا۔ درخت کا تنا اسے سنبھال نہ سکا اور وہ پھسل کر زمین پر جا گری۔ نیچے دریا سنسان پڑا تھا۔ کشتیوں پر نہ چڑیاں تھیں نہ لڑکے۔ بہت دیر بعد میں نے اپنے آپ کو سنبھالا اور سائیکل پر بیٹھ کر لڑکی کے تعاقب میں نکل کھڑا ہوا۔

میں بہت دور تک گیا، مگر وہ مجھے کہیں دکھائی نہ پڑی۔ شاید مجھے بہت دیر ہو گئی تھی۔ دھوپ کافی تیز تھی۔ میں نے ایک ڈھابے میں چائے پی اور تب مجھے کچھ فاصلے پر کولیری کے کچھ کوارٹر دکھائی دیے جن کے باہر کئی موٹر سائیکلیں کھڑی تھیں۔ چند ادھیڑ عمر کے لوگ فولڈنگ چیئر پر بیٹھے ایک پھل کی پیٹی پر تاش کے پتے کھیل رہے تھے۔

میرے دل نے کہا، وہ لڑکی ان ہی میں کسی کوارٹر کے اندر گئی ہوگی، گرچہ اس کی سائیکل باہر کھلے میں یا کہیں کسی پھاٹک یا باہری برامدے پر دکھائی نہیں پڑ رہی تھی۔

''کچھ چاہیے؟'' ایک شخص نے سر اٹھا کر میری طرف دیکھا۔

''ابھی ابھی ایک لڑکی سائیکل پر اس طرف آئی ہے۔''

وہ لوگ کھیل روک کر میرے پاس آ گئے۔

''وہ تمھیں جانتی ہے؟''

''ابھی تھوڑی دیر پہلے ہم ایک ساتھ تھے۔''

''کیا نام ہے اس کا؟''

''میں اس کا نام نہیں جانتا۔ ہم آج ہی ملے ہیں۔'' میں نے جھوٹ کہا۔

ان لوگوں نے آپس میں نظروں کا تبادلہ کیا۔

''کیا نام ہے تمھارا؟''

میں نے نام بتانا ضروری نہیں سمجھا۔

''جاؤ، جاؤ، یہاں کوئی لڑکی وڑکی سائیکل نہیں چلاتی۔'' ایک شخص نے کندھے اچکا کر کہا۔ میں سائیکل کو واپس موڑ رہا تھا جب کسی نے کہا، ''لفنگا!''

''کس نے لفنگا کہا؟'' میں نے پلٹ کر دریافت کیا۔

Scanned with CamScanner

"میں نے!" ایک پستہ قد آدمی سینہ تان کر میری طرف بڑھ رہا تھا جب اس کے ساتھی نے اسے روک دیا۔

"میں لفنگا ہوں؟"

"تم لڑکی کا پیچھا کیوں کر رہے ہو؟"

"وہ مجھے اچھی لگی تھی۔ کیا یہ کوئی بری بات ہے؟ اگر میں لفنگا ہوتا تو اسے اکیلے میں چھیڑتا یا اسے اکیلے پانے کا انتظار کرتا۔ اب بھی کہیے گا، میں لفنگا ہوں؟ میرا دل صاف ہے اسی لیے میں آپ لوگوں کے پاس چلا آیا۔"

"تم چاہتے کیا ہو؟"

"میں صرف اس لڑکی سے ملنا چاہتا ہوں۔"

"یقین کرو، یہاں ایسی کوئی لڑکی نہیں ہے۔" سمجھدار آدمی نے کہا۔

"تو شاید وہ پیچھے رہ گئی ہوگی یا آگے نکل گئی ہوگی۔ ایک ہی راستہ ہے جو دریا کے کنارے دونوں طرف جاتا ہے۔ معاف کرنا، میں نے آپ لوگوں کا کھیل خراب کیا۔ میرا دل صاف ہے۔"

وہ چاروں اسی طرح بے حس و حرکت اپنی جگہ کھڑے میری طرف تاک رہے تھے جب میں سائیکل پر سوار ہو کر سڑک کی طرف بڑھ گیا۔ مجھے یقین ہو گیا تھا، وہ ان ہی کوارٹروں میں سے کسی ایک میں رہتی ہوگی۔ ایسے حالات میں ایسا ہی ہوا کرتا ہے۔ شاید اس میں ان لوگوں کا کوئی قصور نہیں۔ وہ یقیناً شریف لوگ تھے۔ وہ میری دھلائی بھی کر سکتے تھے۔ لڑکی کا معاملہ ہمارے ملک میں ایک بہت نازک معاملہ ہوتا ہے۔ آپ اسے چھوتے بھی نہیں اور اس کے سینکڑوں خود ساختہ پہریدار چمگادڑوں کی طرح آ کر آپ سے چپک جاتے ہیں، جس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ موقع ملنے پر یہی لوگ اس لڑکی کی عزت تار تار کرنے سے باز رہیں گے۔

اس جگہ مجھے دریا کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔ اس طرف دریا کہیں کہیں واقعی بہہ رہا ہے۔ میرے سامنے تارکول کی تنگ سڑک سنسان پڑی ہے۔ گرم ہوا جھاڑیوں کے اندر سرسرا رہی ہے۔ میرے داہنی طرف ڈھلان میں چٹان کا ایک سفید ٹکڑا دھوپ میں تپ کر ہیرے کی طرح دمک اٹھا ہے۔

"لعنت ہے تم پر!" میں اپنے آپ سے کہتا ہوں۔ "آخر تم اس لڑکی سے چاہتے کیا تھے؟"

اس کا جواب میرے پاس نہیں تھا۔ ہمارے بہت سارے سوالوں کا جواب ہمارے پاس نہیں ہوتا، مگر کیا اس سے یہ مطلب نکلتا ہے کہ ان کے جواب نہیں ہوتے؟

ایک سرائے پر دو بسیں کھڑی دریا پار سے آتے مسافروں کا انتظار کر رہی تھیں۔ ان میں سے ایک کی کھڑکی والی سیٹ پر ایک بہت ہی پرکشش لڑکی بیٹھی میری طرف تاک رہی تھی۔ اس نے اپنی خوبصورتی سے بس کے ہر گوشے کو روشن کر رکھا تھا۔ میں نے اس سے آنکھیں ملائیں مگر اپنے اندر کوئی تبدیلی محسوس نہیں کی۔ شاید اس کے اندر کوئی ایسی بات نہ تھی کہ وہ میرے اندر کسی تبدیلی کا سبب بنتی۔

میں تیز تیز پیڈل مارتے ہوئے آگے بڑھ گیا، اُدھر جہاں ڈیم موجود ہوتے ہوئے بھی دن کی تیز روشنی میں نظر نہیں آتا تھا۔

3 ایک اجڑے ہوئے باغ کا صحیح مصرف

یہ غلامی کے آخری دنوں کی بات ہے کہ ایک جرمن انجینئر ہوا کرتا تھا۔ وہ اسٹیل کے کارخانے کا، جو اب بند پڑا ہے اور جس کی دونوں چمنیوں پر چیلوں نے اپنے گھونسلے بنا رکھے ہیں، آخری غیر ملکی منیجر تھا۔ اس نے دریا سے ایک نہر کاٹ کر اس سے سینکڑوں شاخیں نکالیں، ان کے اردگرد باغ کی روشیں قائم کیں، جگہ جگہ پیڑ پودے لگوائے اور اس طرح ایک خوبصورت باغ کی تشکیل کی۔ لیکن، جیسا کہ میں نے کہا ہے، یہ غلامی کے آخری دنوں کی بات ہے۔ اب ملک آزاد ہو چکا ہے۔ یہ باغ اجڑ چکا ہے۔ اس پر جگہ جگہ بنے سیمنٹ کے کمانی پل ڈھے چکے ہیں۔ فلک بوس درختوں پر جنگلی لتاؤں نے قبضہ جما لیا ہے، اور یوں تو کنکریٹ کی بی عورتیں جو روشوں کے کنارے متناسب دوری پر کنکریٹ کے مٹکے اپنی کمر پر تھامے آج بھی کھڑی ہیں مگر ان مٹکوں سے پتے کا پانی باہر نہیں آتا۔ ان میں سے بہت سوں کے ہاتھ، سر یا پستان ٹوٹ چکے ہیں، بلکہ ایک تو صرف ایک ٹانگ کے سہارے مٹکا کمر پر تھامے کھڑی ہے۔

''حکومت کو چاہیے کہ یہ باغ کسی پرائیوٹ کمپنی کی تحویل میں دے دے،'' بنچ پر میری بغل میں بیٹھے ہوئے بوڑھے نے مجھ سے کہا جس کے چہرے پر برص کے کافی نمایاں دھبے تھے۔ وہ کوئی

Scanned with CamScanner

پنشن یافتہ سرکاری افسر ہے یا شاید وہ اس بند کارخانے میں کام کر چکا ہو۔

''اس سے کیا ہوگا؟'' میں نے کہا۔

''یہ اجڑا ہوا باغ پھر سے سدھر جائے گا۔''

''اس سے کیا ہوگا؟''

''لوگ باگ یہاں آئیں گے۔ یہ کتنا ویران پڑا رہتا ہے۔''

''کیا یہ ویرانی آپ کو پسند نہیں؟''

''میں تمھاری عمر کا تھا جب اس باغ کی تشکیل کی گئی،'' بوڑھے نے میری بات کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ ''تم سوچ بھی نہیں سکتے، ان دنوں یہ کتنا خوبصورت تھا۔''

''میرے لیے تو یہ آج بھی خوبصورت ہے،'' میں نے جواب دیا۔ ''ویران اور پوری طرح فطرت کے قبضے میں۔ ہم انسانوں کو اور کیا چاہیے! ملک آزاد ہو جانے کا یہ مطلب تو نہیں کہ ہم غیر ملکی آقاؤں کی زبردستی لادی گئی صفائی اور تنظیم کے قصیدے پڑھیں۔ ہم اپنی نوآبادیاتی غلامانہ ذہنیت سے کب باز آئیں گے؟''

''جانے تم کیا کہنا چاہتے ہو!'' بوڑھے نے کہا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ ''میں تو ایک سیدھی سادی بات کر رہا تھا۔''

یہ سچ ہے کہ وہ سیدھی سادی بات کر رہا تھا، مگر کیا یہ ممکن ہے کہ زندگی بھی اتنی ہی سیدھی سادی ہو جتنی ہم اسے سمجھتے ہیں؟ میں بنچ پر اکیلا بیٹھا تھا، مگر بہت جلد مجھ پر اس بات کا انکشاف ہوا کہ یہ جگہ میرے لیے صحیح نہیں ہے؛ یہاں سے دریا نظر نہیں آتا۔ تو میں دریا کی تلاش میں باغ کے مغربی گوشے کی طرف چل پڑا جہاں زمین ترچھی ہونے لگی تھی اور باغ کی چہاردیواری کی جھلک مجھے نظر آرہی تھی۔ میں دیکھتا ہوں جرمن انجینئر کی کھودی ہوئی نہریں کہیں کہیں کنویں سے بھی زیادہ گہری ہیں تو کہیں کہیں یہ بالکل پایاب ہو کر زمین سے لگی بہہ رہی ہیں جن کے پیندوں کی کائی سے ڈھکی چٹانیں صاف نظر آرہی ہیں۔ کوئی کوئی پیڑ کسی گڈھے میں اتنا نیچے اگا ہوا ہے کہ اس کی بالائی شاخوں کو ہم اوپر سے دیکھ سکتے ہیں اور کسی کسی پیڑ کے نیچے چلتے ہوئے ایسا لگتا ہے جیسے ہم زمانہ قدیم کے اساطیری بونے ہوں۔ میرے پیروں کے نیچے سوکھے پتے چرمرا رہے ہیں، میرے سامنے سے گلہریاں اور گرگٹ زمین پر

Scanned with CamScanner

گرے ہوئے پتوں میں بانپیں مچاتے ہوئے اپنی جان بچانے کے لیے بھاگ رہی ہیں، ان ہی کے اندر غائب ہو رہی ہیں۔ ایک گلہری ایک قدرے صاف جگہ اپنی پچھلی ٹانگوں پر کھڑی ہو کر سر موڑ کر میری طرف دیکھتی ہے۔ مجھے اس کا چہرہ جانا پہچانا لگتا ہے۔ مجھے اس سے دلچسپی نہیں ہوتی۔

دریا کے کنارے دیوار سے لگے پیڑ کافی گھنے ہو گئے ہیں۔ جھاڑیوں کے بیچ کہیں کہیں راستہ اچانک غائب ہو گیا ہے جو اس بات کا غماز ہے کہ ادھر لوگ کم آتے ہیں۔ میں واپس لوٹنے کے بارے میں سوچ ہی رہا ہوں کہ مجھے جھاڑیوں کے اندر ایک آہٹ سنائی دیتی ہے۔ میں رک کر کان کھڑے کر لیتا ہوں اور پھر جھاڑیوں سے کپڑوں کو بچاتے ہوئے آگے بڑھنے لگتا ہوں۔ آواز بتدریج تیز ہوتی جا رہی ہے۔ میں آخری جھاڑی کی خاردار شاخ کو ہٹا کر دیکھتا ہوں، ایک مرد ایک لڑکی کے ساتھ کھلے آسمان کے نیچے مباشرت میں مصروف ہے۔ یہ مرد کے کراہنے اور غرانے کی آواز تھی جو میرے کانوں میں آ گئی تھی۔ میں لڑکی کو دیکھ نہیں پاتا، صرف اس کی دونوں ٹانگیں دیکھ پاتا ہوں جو آسمان کی طرف اٹھی ہوئی ہیں۔ مرد کے گندمی کولھے ان کے بیچ ہل رہے ہیں۔ اس کی ڈھیلی جرابیں اس کے ٹخنوں پر جمع ہیں، اس نے جوتے نہیں اتارے ہیں۔ میں حیران ہو کر دیکھتا ہوں، لڑکی کی ننگی ایڑیاں بالکل سفید ہیں۔ میں سانسیں روکے کھڑا ہوں۔ مجھے شدید ندامت کا احساس ہوتا ہے۔ یہ میں نے اچھا نہیں کیا ہے۔ آواز پیدا کیے بغیر میں خاردار شاخ کو چھوڑنے کی کوشش کرتا ہوں، مگر اس کے کانٹے میری انگلیوں میں اترے جاتے ہیں۔ مجھے لگتا ہے میں چیخ دبانے میں کامیاب ہوں، مگر...

"کون ہے؟" میں پہلی بار لڑکی کے سر کو دیکھتا ہوں، جسے اوپر اٹھا کر وہ ادھر ادھر تاک رہی ہے۔

"پولیس؟" مرد اس کی ٹانگوں کے بیچ سے کود کر باہر آتا ہے اور پتلون کو کمر پر کھینچتے ہوئے ادھر ادھر تاک رہا ہے۔ لڑکی نے ساڑی گھٹنوں سے نیچے کھینچ لی ہے اور اٹھ کر بیٹھ گئی ہے۔ اس نے بلاوز نیچے کھینچ کر سینے تلے پستان کو ڈھک لیا ہے۔ مرد زپ چڑھا کر بھاگتا ہوا جھاڑیوں کے درمیان غائب ہو جاتا ہے۔ لڑکی سر اپنے دونوں گھٹنوں پر رکھ کر ہنس رہی ہے۔ پھر وہ میری جھاڑی کی طرف اشارہ کرتی ہے۔

"تم وہاں چھپ کر کیا دیکھ رہے ہو؟"

میں جھاڑی کے پیچھے سے باہر نکل آتا ہوں۔ قریب پہنچ کر دیکھتا ہوں اس کی حلیہ اور

ہینڈ بیگ ترتیب سے اس کے سامنے رکھی ہیں۔ وہ میری طرف دیکھ کر اپنے منھ پر ہاتھ رکھ لیتی ہے۔

"تم نے تو اسے بالکل ڈرا دیا،" وہ کہتی ہے۔ مجھ سے نظریں ہٹ کر وہ اپنے بالوں سے سوکھے پتے الگ کر رہی ہے۔ وہ اپنی بیگ سے ایک کنگھی اور کچھ ہیئر پن نکالتی ہے۔ "بیچارہ کنڈوم پہنے ہی بھاگ نکلا!"

"تو تم پیشہ کرتی ہو؟"

"یہ میرا علاقہ ہے۔" وہ مجھ سے لاپروا، اپنے بالوں میں کنگھی کر رہی ہے۔ اس نے پن اپنے دانتوں سے پکڑ رکھے ہیں۔

"پڑھی لکھی لگتی ہو۔ تمھیں ڈر نہیں لگتا؟"

"کس بات کا ڈر؟"

"یہاں پولیس آتی ہوگی۔"

"کبھی نہیں۔"

"کیوں، کیا پولیس اپنا کام نہیں کرتی؟"

"تم اتنی تفتیش کیوں کر رہے ہو؟ سی آئی ڈی کے آدمی ہو، یا سماج کی نوک پلک درست کرنے والے لٹھیت؟"

"بالکل نہیں،" میں نے کہا۔ "میں دو ٹانگوں پر کھڑا ایک زمین زاد ہوں جسے کسی دوسرے سیارے کا پتا معلوم نہیں۔"

"انٹرسٹنگ!" اس نے کنگھی ہینڈ بیگ کے اندر ڈال کر اس کا مقناطیسی کلچ لگاتے ہوئے کہا۔ "عجیب دنیا ہے یہ۔ خوامخواہ دوسروں کا مزہ خراب کر دیا۔ تم واپس بھی لوٹ سکتے تھے۔"

"ایسا منظر بار بار ہاتھ نہیں آتا۔"

"کیا؟ تمھیں شرم آنی چاہیے۔"

"تم نے ہی تو اسے ڈرا دیا۔ میں تو اپنی جگہ خاموش کھڑا تھا۔"

"ایسا کرنا پڑتا ہے۔" اپنے سلیپر کے اندر پیر ڈال کر وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ "کچھ لوگ تو اتنا مبا کھینچتے ہیں کہ مت پوچھو۔"

Scanned with CamScanner

"وہ اپنے پیسے کا معاوضہ چاہتے ہیں۔"

"اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ میں اس کی جورو کی طرح اسے برداشت کروں،" وہ بولی۔ ہم دونوں وہاں سے ساتھ ساتھ باہر نکلے تھے۔ اسے گھنی جھاڑیوں کے بیچ ایک آسان راستے کا پتا تھا۔ کچھ آگے جا کر میں رک گیا۔

"کیا بات ہے؟" اس نے سر موڑ کر میری طرف دیکھا۔ "میرے ساتھ نظر نہیں آنا چاہتے؟"

"مجھے دریا دیکھنا ہے۔ میں دیوار کی طرف جا رہا ہوں۔"

"دریا میں کیا ہے؟ پتھر، بالو، شہروں سے کوڑا کرکٹ، جانوروں کے مردے یا مردار خور۔"

"اور پانی۔"

"کبھی اس دریا میں پانی ہوا کرتا تھا۔" وہ مجھے چھوڑ کر آگے بڑھنے لگی۔ "اب اس پر اوپر کی طرف اتنے سارے ڈیم بن چکے ہیں کہ یہ ریگستان بن چکا ہے۔ تمھیں دریا دیکھنا ہے تو برسات کا انتظار کرو۔"

وہ ٹھیک کہہ رہی تھی۔ چہار دیواری کے دوسری طرف واقعی ایک ریگستان تھا، خس و خاشاک سے ڈھکا ہوا جس میں ریت پر ایک آدھ جگہ مردوں کے جلائے جانے کے سیاہ نشان نظر آ رہے تھے۔ اس کا بچا کھچا پانی اوپر کی طرف یہ باغ بنی ان گنت نہروں کے ذریعے پی جاتا ہوگا۔ میں مایوس ہو کر واپس اپنے بنچ پر لوٹا، اس پر پڑے ہوئے پتے صاف کیے اور لیٹ کر آنکھیں بند کر لیں۔

سورج ڈوب رہا تھا جب میں باغ سے باہر آیا۔ پھاٹک کے باہر ٹکٹ گھر کے سامنے سائیکل کا لاک کھول کر میں اس کی کاٹھی پر بیٹھ رہا تھا کہ مجھے وہ لڑکی دکھائی دی۔

"تم ادھر ہی جا رہے ہو نا؟" اس نے اپنی انگلی سے مغرب کی طرف اشارہ کیا۔

"ہاں،" میں نے جھوٹ کہا۔ "تمھارا کام ختم ہو گیا؟"

"آج کا دن اچھا گزرا،" وہ ہنسی۔ "مجھے لفٹ دو گے؟ تم نے میرے ساتھ جو کیا ہے اس کے بعد یہ تمھارا فرض بنتا ہے۔"

"کیوں نہیں۔ میں ہر حال میں تمھاری خدمت کے لیے حاضر ہوں۔"

وہ اچک کر میری سائیکل کے پائپ پر بیٹھ گئی۔ وہ ہلکے پھلکے بدن کی مالک تھی اور اب، جبکہ

Scanned with CamScanner

اس کا بدن میرے بدن کو چھو رہا تھا، وہ کافی کمسن لگ رہی تھی۔ اس طرف سڑک دھیرے دھیرے اوپر کی طرف اٹھی جا رہی تھی۔ گرچہ اس کا وزن کچھ خاص نہ تھا مگر چڑھائی کے سبب مجھے پیڈل پر کافی محنت کرنی پڑ رہی تھی جو مجھے اچھا لگ رہا تھا۔ اور جب میں ایک جگہ بہت زیادہ اونچائی دیکھ کر یہ سوچ رہا تھا کہ سائیکل سے اتر جاؤں، اس نے ایک پگڈنڈی کی طرف اشارہ کیا۔

''تھینک یو!'' وہ کود کر سائیکل سے اتر گئی۔ ''یہاں سے آدھا کلومیٹر دور ایک بند کولیری ہے۔ وہیں میرا گھر ہے۔''

''شام اتر رہی ہے۔ تمھیں کھیتوں کے بیچ اکیلے جاتے ڈر نہیں لگے گا؟''

''کس بات کا ڈر؟ میری پیدائش اسی کولیری میں ہوئی ہے۔ بچپن میں اپنے دوستوں کے ساتھ میں نے ان کھیتوں میں ان گنت سانپوں کو مارا ہے۔''

''میں سانپوں کی بات نہیں کرتا۔ تم لڑکی ہو، بالکل اکیلی۔ شام اتر چکی ہے۔ اس وقت لوگ کل کارخانوں، شراب خانوں سے واپس لوٹ رہے ہوں گے۔''

''کل کارخانے بند پڑے ہیں۔ شراب پینے کے لیے لوگوں کے پاس فقط یہی وقت ہے۔ اور پھر مجھے اس ڈر کے ساتھ جینے کی عادت ہے۔ مرد اب میرے لیے مٹی کے کھلونے کی طرح ہیں جنھیں جب چاہے میں اپنی انگلیوں سے چپٹا کر سکتی ہوں۔'' وہ پرس ہلاتے ہوئے ڈھلان میں اتر گئی جہاں ایک گڈھے کے پاس پانی کے ایک بڑے سیاہ پائپ کے کنارے پگڈنڈی شروع ہوتی ہے۔ میں نے سائیکل کی گھنٹی بجا کر اس کی توجہ اپنی طرف کھینچنا چاہی۔

''سن رہی ہو؟''

کیا ہے؟'' اس نے سر موڑے بغیر مجھ سے پوچھا۔

''مجھے گڈ بائی نہیں کہو گی؟''

اس نے سر ہلا کر انکار کر دیا اور پگڈنڈی پر چلتے ہوئے کھیتوں میں اتر کر شام کے دھندلکے میں غائب ہو گئی۔

Scanned with CamScanner

4 دریا کتنا دریا

میں نے دریا پر دور تک نظر ڈالی اور سوچا، یہ دریا ایسا نہیں کہ اسے یوں ہی مرنے دیا جائے۔ مگر اس کے دونوں کنارے بچھی ہوئی کوئلے کی کانیں اندر اندر اس کا آدھے سے زیادہ پانی پی جاتی ہوں گی۔ باقی پانی پر کل کارخانے اور تھرمل پروجیکٹ کے ٹاکسک ویسٹ (toxic waste) کا قبضہ ہے۔ جو تھوڑا بہت صاف پانی بچتا ہے، اور وہ بالکل صاف بھی نہیں، وہ انسانوں اور جانوروں کے نہانے اور کپڑے دھونے کے کام آتا ہے۔ اس دریا کے کنارے لوگوں کو ننگا ہونے میں کوئی جھجک نہیں ہوتی اور اس کے پانی میں ٹخنوں تک غرق کھڑی عورتیں اپنے ننگے پستانوں پر سستے صابن ملتی رہتی ہیں۔ دست کرتے لوگوں کی شرمگاہیں تو یہاں ایک عام نظارہ ہے۔ اگر ہماری تہذیب ایک آئینہ ہے تو یہ دریا اس کا عقبی حصہ ہے، گھن اور دیمک زدہ لکڑیوں اور مکڑی کے جالوں سے ڈھکے ہوئے کاغذوں والا حصہ۔

اور اگر اس شہر میں یہ میرا آخری سال بلکہ آخری ہفتہ تھا تو اس کے لیے ذمہ دار میں ہی تھا۔ دراصل میں نے اس دریا کے حوالے سے اپنی زندگی کو جاننے کی کوشش میں اپنی ان ساری کمزوریوں کا پتا چلا لیا تھا جنھیں میں سالوں سال ان دیکھا کرتا آ رہا تھا۔ ہاں، اس دریا میں اپنی سائیکل کے سامنے کے پہیے کو پانی کے اندر ڈالے ہوئے، میں اس وقت یہی سوچ رہا تھا، اگر یہ دریا نہ ہوتا تو مجھے اس ریگستان کا پتا کیسے چلتا جو میرے اندر دور تک موجود تھا۔

برسات کے کچھ ہفتوں کو چھوڑ کر، باقی سارا سال تم بہتے بہتے ریت میں کھو جاتے ہو اور تمھیں کوئی سمندر نصیب نہیں ہوتا، اور یہ بالکل عام انسانوں کا سا معاملہ ہے۔ ہم ساری زندگی پانی کی طرح ریت پر بہتے رہتے ہیں اور اس دریا کی طرح ہمیں برسات کے کچھ گیلے لمحے بھی نصیب ہوتے ہیں۔ مگر بات یہیں پر ختم ہو جاتی ہے۔ ہمیں کبھی سمندر نصیب نہیں ہوتا۔ زیادہ سے زیادہ ہم چند سراب بنا کر جینے پر مجبور ہوتے ہیں۔

اور میں نے دریا پار جانے کی سوچی، وہاں جہاں دھوپ سے جلی ہوئی مٹی، بند کارخانوں کے زنگ خوردہ ڈھانچوں، تپتے ہوئے آسمان اور چند خودسر پودوں اور جھاڑیوں کے علاوہ کچھ بھی نہ تھا اور یہ وہ جنگل تھے جن کے اندر گرگٹ، گلہریاں، سانپ اور پرندے نیم مردہ پڑے پڑے سورج کے

ڈوبنے کا انتظار کیا کرتے۔

دریا میں پانی کہیں کہیں غیر متوقع طور پر گہرا تھا، کہیں بالکل پایاب، کہیں دریا سوکھ کر ایک ریگستان میں بدل گیا تھا جسے دیکھ کر حیرت ہوتی تھی کہ اس پر کھجور کے پیڑ کیوں اگے ہوئے نہیں تھے، جو کہ ایک آدھ جگہ واقعی اگے ہوئے تھے۔ یہاں اسے پیدل یا سائیکل یا بیل گاڑی پر پار کرنا اتنا ہی آسان تھا جتنا کہ مشکل۔ مگر انسان، اسے تو بہرحال کہیں نہ کہیں پہنچنا ہی پڑتا ہے، کبھی کسی خاص مقصد کے لیے اور کبھی بلا مقصد، جو اپنے آپ میں کسی بڑے مقصد سے کم نہیں ہوتا۔

میں دریا کے بالکل وسط میں سائیکل کا ہینڈل بار تھامے تپتی ریت پر کھڑا تھا۔ گرم ہوا میرے بالوں کو کسی ایک سمت رہنے نہیں دے رہی تھی اور میں سوچ رہا تھا، اتنی دور آ کر واپس لوٹ جانا اگر عقلمندی کا کام نہیں تو یہاں سے آگے جانا بھی کم بیوقوفی نہیں ہوگی۔ میں اس مخمصے میں تھا جب قدرت کو مجھ پر ترس آ گیا۔ ایک آواز آئی اور میری سائیکل کا پچھلا پہیہ ریت پر بیٹھ گیا۔

سخت گرمی صرف انسانوں کے لیے ہی ناقابلِ برداشت نہیں ہوتی۔

میں دیر تک چلچلاتی دھوپ میں ایک بیوقوف کی طرح کھڑا دونوں کناروں کی طرف تاکتے ہوئے ان کے فاصلوں کو ناپتا رہا کہ مجھے دوسری طرف سے ایک بیل گاڑی آتی نظر آئی۔ چوری کے کوئلوں سے لدی یہ بیل گاڑی ایک کچھوے کی طرح رینگ رہی تھی۔ اس پر بنی سائیکل چڑھا کر میں گاڑیبان کے پیچھے بیٹھ گیا جو اپنی دونوں ٹانگیں اس کے ڈانڈوں کے دونوں طرف لٹکائے بیٹھا بیلوں کو ہانک رہا تھا۔ وہاں بیٹھے بیٹھے مجھے گاڑیبان کی بیڑی کی تیز مہک آ رہی تھی۔

''آپ اس پار جا سکتے تھے۔ کوئی نہ کوئی سواری مل جاتی۔ وہاں سائیکل کی مرمت کی دکان بھی ہے۔''

''اور واپسی پر پھر ٹیوب بیٹھ جاتی تو؟ میری سائیکل دیکھ ہی رہے ہو۔ میں اس پر بھروسا نہیں کر سکتا۔''

''سو تو ہے۔ یہ سائیکل کتنی پرانی ہے؟ اب تو اتنی مضبوط سائیکل نظر نہیں آتی۔''

بیل گاڑی کے پہیے اب پانی میں اتر چکے تھے۔ گاڑیبان نے بیڑی کا آخری حصہ نیا لے پانی پر پھینک دیا جہاں وہ کسی ان دیکھے بھنور کی لپیٹ میں آ کر چکر کاٹنے لگا۔ گاڑی کے پہیے مٹی میں

Scanned with CamScanner

بار بار وحشی ہو رہے تھے اور گاڑیبان کو بیلوں پر لگاتار چابک برسانا پڑ رہا تھا۔ زیادہ تر بیل مار کھا کر پہیے نکال لیتے۔ مگر کبھی کبھی یہ ان کے بس سے باہر ہوتی۔ اس وقت گاڑیبان کود کر پانی میں اتر جاتا اور اپنے ہاتھوں سے پانی میں غرق پہیے کو تھام کر باہر لاتا۔ ایک بار تو مجھے ایسا لگا جیسے بیل گاڑی اب پانی سے کبھی باہر نہیں آ سکے گی۔ مگر وہ باہر آ گئی۔ پانی کے بعد ایک بار پھر سوکھی ریت کا ایک بے آب و گیاہ حصہ تھا۔ چند اونچی نیچی چٹانوں سے بچنے کے لیے بیل گاڑی کو کافی گھوم گھوم کر اپنا راستہ نکالنا پڑتا۔ پانی کی ایک آخری، قدرے گہری پٹی تھی جس کے دوسری طرف چٹانوں پر دھوبی کسی اسپتال کے بستر پڑے سکھا رہے تھے۔ مگر یہاں پانی کے اندر کی زمین بالکل ہموار تھی جس سے گزرنے میں گاڑی کو زیادہ دقت پیش نہیں آئی۔

"تم کب سے یہ کام کر رہے ہو؟" میں نے خاموشی توڑی، کیونکہ اب پانی کے اندر بیل گاڑی دھیرے دھیرے ایک بے فکر سی ناؤ کی طرح چل رہی تھی۔

"مجھے یاد نہیں،" گاڑیبان نے کہا۔ اس نے ایک اور بیڑی سلگا لی تھی۔ "میں بہت چھوٹا تھا اور اپنے باپ کے ساتھ اس گاڑی پر بیٹھا کرتا تھا۔"

"یہ دنیا تھوڑا سا بھی نہیں بدلی ہے،" میں نے دبے ہونٹوں سے کہا۔ شاید اس نے میری بات سن لی تھی۔

"بہت کچھ بدل گیا ہے۔ آپ نہیں دیکھتے، اب بیل گاڑی کے پہیے لکڑی کی بجائے لوہے کے بننے لگے ہیں۔"

"مگر آج بھی تم چوری کے کوئلے کا کاروبار کرتے ہو۔"

"آپ نے شاید ان غیر قانونی کھدائی کرنے والوں کو نہیں دیکھا ہے،" اس نے جواب دیا۔

"وہ زمین کے اندر کئی کئی میل تک جا کر کوئلہ کاٹ کر لاتے ہیں۔"

"مرتے بھی ہوں گے۔"

"ان میں لاشیں پھنسی رہتی ہیں۔"

"یہ دنیا تھوڑا سا بھی نہیں بدلی ہے،" میں نے بڑبڑاتے ہوئے کہا۔ "ایک آدھ لوہے کے پہیے تبدیلی نہیں لاتے۔"

Scanned with CamScanner

کنارے پہنچ کر میں نے سائیکل کی ٹیوب مرمت کروائی۔ آخری بار دریا کی طرف دیکھا۔ اس پر غیر قانونی کھدائی میں مصروف لوگوں کے بارے میں سوچا۔ اپنی المناک موت کے باوجود وہ قانون کے مجرم ہیں۔ وہ اس موت کے حقدار ہیں جو زمین کے دھنس جانے کے سبب انھیں نصیب ہوتی ہے۔ اور ہم جو زمین کی سطح کے اوپر گناہ کرتے ہیں، ہمارا حساب حشر کے دن ہوگا۔ تب تک یہ دریا بہتا رہے گا، اپنے خس و خاشاک، اپنی گندگی، اپنی خوبصورتی، اپنی بھوک، اپنی پیاس کے ساتھ، اسی طرح اپنے دونوں کناروں کو کھاتا رہے گا۔ اس کے کنارے اذانیں گونجتی رہیں گی، سنکھ بجتے رہیں گے، لوگ دست کرتے رہیں گے، اس کی جھاڑیوں میں جنسی خواہشات کی تکمیل ہوتی رہے گی اور میں سائیکل پر سوار خالی ہاتھ گھر کی طرف جاتا رہوں گا، کیونکہ اس کے علاوہ مجھے اور کچھ نہیں آتا۔

❀

بختاور، میں اور چند بے تکے واقعات

1 بے موسم کی چھتری

وہ لڑکی ڈرائی کلینرز کی دکان سے باہر آرہی تھی جب میں نے اسے پہلی اور آخری بار دیکھا۔ وہ سانولے رنگ اور لانبے قد کی ایک صحت مند مدراسی لڑکی تھی، کم قیمت کی ساڑی پہنے ہوئے جس پر سرخ رنگ کا سویٹر چڑھے ہونے کے سبب اس کے پستان کافی ابھر آئے تھے۔ اس نے مجھے دیکھا نہیں تھا۔ باہر سڑک پر کوئی خاص بھیڑ نہیں تھی۔ دن بس شروع ہی ہوا چاہتا تھا۔

یہ لانڈری میرے دوست بختاور کی تھی۔ یہ گاتھک طرز کے ستونو ں والی ایک چھوٹی پرانی عمارت تھی جس کے بڑے سے دروازے پر ”چپ ینگ ڈائرز اینڈ ڈرائی کلینرز“ کا بورڈ لگا ہوا تھا۔ اسے یہ لانڈری اپنے باپ سے ورثے میں ملی تھی۔ پہلے اسے ایک چینی چلاتا تھا جس کی لڑکیاں کاؤنٹر پر بیٹھتی تھیں۔

وہ بوڑھا چینی، ین لنایا، ماؤ کے خوف سے بھاگ کر ہندوستان آیا تھا اور چائنا ٹاؤن میں بس

گیا تھا۔ اس نے ڈرائی کلینر کی دکان کھولی، جس نے کاروبار میں اچھا منافع کمایا اور اپنا سب کچھ
بیچ کر اپنے بیٹے کے ساتھ کناڈا ہجرت کر گیا۔ شنودر کا باپ اس دکان میں کیشیئر تھا اور شروع سے ہی
اس کی نظر اس پر تھی۔ اسے اس دکان کو حاصل کرنے میں کچھ زیادہ دقت پیش نہیں آئی۔

"انھوں نے دولت کے لیے میری ماں سے شادی کی جس کے ایک پاؤں میں لنگ تھا،"
شنودر نے مجھے ایک دن بتایا تھا۔ "ایک لالچی انسان کا خون میری رگوں میں دوڑ رہا ہے۔"

"وہ ساری زندگی تمھاری ماں کے وفادار رہے۔"

"وہ مذہبی رہے تھے اور اسی لیے اس سے وہ اچھے انسان بنے رہے۔" شنودر ہنسا۔ "اور مجھ
سے لوگ ان چینیوں کے بغیر یہ لانڈری چلانا بہت مشکل کام ہے۔ ہم اپنی دکان کی وجہ سے بندھے رہا
ہوں۔ میں اپنے باپ کی بیوقوفی کی سزا بھگت رہا ہوں۔"

"تم یہاں کیوں کوئی بزنس نہیں کرنا چاہتے ہو؟" میں نے مشورہ دیا۔ "کاش پہاڑی یہ کام
بھی کرتے نہیں۔ لوگوں سے پیار سے بات نہیں کرتے۔"

"تم جانتے ہو، صرف یہ دشواری ہے کہ میں نیپالی زبان پسند نہیں کرتا۔" شنودر مجھ سے
ہاتھ ملاتے ہوئے بتانے لگا۔ "مجھے چائے کی طلب ہو رہی ہے۔ میں بات کرتے کرتے پہاڑوں میں سیٹوں کے
ساتھ بیٹھا ہوں۔ جس کے پاس سے ایک خاص طرح کی بو آتی ہے، جو پہاڑوں کی وجہ سے ہو سکتی۔ ایسا
ہمیشہ ہی ہوتا ہے، جب موسم میں تبدیلی ہو۔"

اس وقت اس عالی خاندان کی تاجر ہیں وہ ہمالیہ کی طرف تاکتے ہوئے، جو دور تک سے
اور دونوں طرف سے فٹ پاتھ پر اپنا سامان کھول چکی تھی۔ میں نے خود سے سوال کیا: یہ لڑکی
اتنی عمدہ جانے کے بعد بھی چھتری کا استعمال کیوں کر رہی ہے؟

اندر سے ایک بوڑھی پنجابی عورت اپنے کتے کے ساتھ کھڑی تھی۔ اس کے والے اتنے
لمبے تھے کہ وہ ... رکے بیچ کی جگہ بھر گئی تھی۔ کتے کے انتہائی بدصورت چہرے کے اندر ایک
عجیب سی بد صورتی تھی۔ اس کی دونوں آنکھیں دو مختلف سمت تاک رہی تھیں۔ شاید وہ بہت دیر سے
یہاں گھوم رہا تھا، شنودر مجھے کچھ خوش ہو گیا۔ کاؤنٹر پر گاہک سے بیٹے کے کپڑوں کا تھیلہ
لے کر ہاتھ بھی تھے، دیکھ کر مسکرائی۔ دوسری لڑکی ایک لاٹھی اسٹک کے سہارے ماری کے

Scanned with CamScanner

اوپر کے خانوں میں ہینگر سے ٹنگے کپڑوں میں کوئی خاص سوٹ تلاش کر رہی تھی۔

''آؤ، آؤ۔'' بختاور نے کاؤنٹر کی تختی اٹھاتے ہوئے کہا۔ ''ہاں، تم تو آج کل نظر ہی نہیں آتے۔ کوئی نیا چکر چل رہا ہے؟ مجھے ڈر ہے، تم شادی کی تو نہیں سوچ رہے ہو۔''

''کوئی لڑکی ہے نظر میں؟''

''یہ اندرانی کیا بری ہے!'' بختاور نے سیلز گرل کو مخاطب کیا جو میری طرف تاک کر مسکرا رہی تھی۔ ''اندرانی، تم میرے دوست کے ساتھ شادی کرنا چاہو گی؟ وہ ایک رائٹر ہے، خالی جیب فقنوس۔ تم اپنی تنخواہ سے اس کا پیٹ بھر سکتی ہو۔''

''وہ تو، مسٹر بختاور!'' اندرانی نے کاؤنٹر سے سر اٹھا کر ہنستے ہوئے کہا۔ ''میں اپنی بہت ساری سہیلیوں کو شادی کے حال میں پھنس کر تباہ ہوتے دیکھ چکی ہوں۔ میں لنڈوری ہی بھلی۔''

''دیکھ رہے ہو؟'' میں نے کہا۔ ''آجکل کی لڑکیوں کی آنکھیں کھل چکی ہیں۔ وہ جان چکی ہیں کہ شادی سے کسی کا بھلا نہیں ہوتا۔ اب تم شادی کا خواب دکھا کر اسے بیوقوف نہیں بنا سکتے۔ اور اندرانی، وہ لڑکی کون تھی جو ابھی ابھی دکان سے نکلی ہے؟''

''کون سی لڑکی سر؟'' اندرانی کے ہونٹوں پر اب بھی مسکان قائم ہے۔ اسے لڑکیوں کے سلسلے میں ہمارے بے ضرر مذاق کا علم تھا۔

''وہ جس کے ہاتھ میں بے موسم کی چھتری تھی۔''

''آپ اس لڑکی کے بارے میں جاننا چاہتے ہیں یا چھتری کے بارے میں؟''

''چھتری کے بارے میں،'' میں نے جواب دیا۔ ''جاڑے کی اتنی خوشگوار دھوپ میں اس چھتری کا کیا کام۔ تو ظاہر ہے، یہ معاملہ اس لڑکی تک بھی جاتا ہے۔''

''لوگوں کے بھی عجیب سنک ہوتے ہیں سر،'' اندرانی بولی۔ ''شاید اس کی اپنی کوئی وجہ ہو۔ ہوسکتا ہے اس کی جلد پر دھوپ کا اثر برا پڑتا ہو اور اسے ڈاکٹر نے ہدایت کی ہو، یا ہوسکتا ہے اسے چھتری کی نمائش پسند ہو۔''

''وکے، میں تمھاری مدد کرتا ہوں،'' بختاور نے میری طرف تاکتے ہوئے کہا۔ ''وہ لڑکی سرینا دہار سے آتی ہے۔ ایک بڑے کنبے میں شاید نوکرانی ہے، یا اس کے اوپر کا کوئی رتبہ ہے اس کے پاس۔

Scanned with CamScanner

مثلاً دور کی کوئی غریب رشتے دار، یا ناتھ آشرم سے لائی گئی کوئی لڑکی۔ سونالو چا، ہاں، شاید یہی نام ہے اس کا، ہے نا اندرانی؟"

"یس سر۔" اندرانی کو وہ نام رسید بک میں مل گیا تھا۔ "سونالو چا، سریتا وہار۔"

"فون نمبر ہے؟"

"نہیں سر۔"

"چاہیے؟" بخت ور میری طرف مڑا۔

"نہیں نہیں، اب رہنے بھی دو۔" میں نے انکار کیا۔ "وہ تو میں نے صرف چھتری کے سبب پوچھ لیا تھا۔ یار، اسے اتنا لمبا مت کھینچو۔"

شاید میں نے جھوٹ کہا تھا، کیونکہ اسی شام میں سریتا وہار جا دھمکا۔ یہ رہائشی کمپلیکس کئی میل کے رقبے پر پھیلا ہوا تھا۔ میں عمارتوں کے بیچ کی کھلی جگہوں پر سے گزرتے ہوئے سایہ دار درختوں کے نیچے چہل قدمی کرتا رہا۔ یہاں کی دنیا عجیب نہ تھی۔ تمام عمارتیں تین منزلہ تھیں اور ان تمام عمارتوں کی سیڑھیاں کسی آثار قدیمہ سے کھود کر نکالی گئی عمارتوں کی طرح باہر کی طرف بنی ہوئی تھیں جس کے سبب زمین تا آسمان لوگ ہی لوگ حرکت کرتے نظر آ رہے تھے۔ آخرکار میں تھک گیا اور ایک جگہ رک کر میں نے خود سے وہاں آنے کا مقصد دریافت کیا۔

مجھے پتا چلا، میرا وہاں آنے کا کوئی مقصد سرے سے تھا ہی نہیں: وہ لڑکی تو بالکل نہ تھی۔

چند بچے رنگین سائیکلیں دوڑاتے ہوئے میرے پاس سے گزرے، جن میں سے ایک نے میری طرف سر موڑ کر کہا:

"ہیلو روبوٹ، کیسے ہو؟"

میں نے مسکرا کر اپنے دونوں ہاتھ کہنی سے نیچے گرا لیے اور انھیں روبوٹ کی طرح ہلاتے ہوئے چلنے لگا۔ سارے بچے سائیکلیں روک کر میری طرف دلچسپی سے تاک رہے تھے اور تالیاں بجا رہے تھے۔

دوسرے دن جب بخت ور کو میں نے بتایا کہ میں سریتا وہار گیا تھا تو اسے یقین نہیں آیا۔

"اور مجھے وہاں پتا چلا، میں ایک روبوٹ ہوں۔"

"جانے کیا بک رہے ہو۔" بخت ور نے بے یقینی سے کہا۔ وہ ایک تنکے سے اپنے دانت کھود رہا

Scanned with CamScanner

تھا۔ ''یقیناً تم مجھے ہنسانے کی کوشش کر رہے ہو۔''

''تمھیں یقین نہیں آتا؟''

''نہیں۔''

میں ایک ٹک اس کی آنکھوں میں دیکھا کیا۔

''جانتے ہو بختاور . . . '' میں نے کہا، ''کبھی کبھی مجھے تم پر ترس آتا ہے۔ اتنے برسوں سے میں تمھیں دیکھ رہا ہوں، تم ذرا بھی نہیں بدلے۔ کبھی کبھار کسی بات پر جھوٹ یا سچ کے لفڑے میں پڑے بغیر یقین کر لیا کرو یار۔ اس سے دماغی توازن درست رہتا ہے، زندگی آسان ہو جاتی ہے۔''

2 بغیر کنڈکٹر کی ٹرام اور ایک بغیر سر پیر کا مکالمہ

اس بوڑھی ٹرام کے اندر، جو اپنی پٹریوں پر بڑے ہی بے ڈھنگے انداز سے کمر لچکاتی چلی جا رہی تھی، حیرت انگیز طور پر کوئی کنڈکٹر نہ تھا جب بختاور نے ایک بلند و بالا زیرِ تعمیر عمارت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا:

''کبھی یہاں پر ایک چرچ کا پچھواڑا ہوا کرتا تھا جس کے فٹ پاتھ پر کوڑھ کے فقیر کڑوفر کے ساتھ دیوار سے پیٹھ لگا کر قطار میں بیٹھا کرتے کیونکہ ان کے زخموں کو صاف کرنے یورپ اور امریکہ سے گورے صاحب اور میم لوگ آتے۔ وہ ننگے ہاتھوں سے ان کوڑھ کے مریضوں کے زخم صاف کرتے، ان پر مرہم پٹیاں باندھتے، انھیں کھانے کے پیکٹ دیتے۔ یہ مدر ٹریسا کا زمانہ تھا۔''

''اب کوڑھ کے مرض کا علاج ڈھونڈ لیا گیا ہے،'' میں نے کہا۔ ''اب گورے کسی دوسری طرح کے مرض کی طرف راغب ہو گئے ہیں۔ اس سے بڑھ کر یہ کہ انھوں نے گلوبل وارمنگ دریافت کر لی ہے۔''

''ہم مسلمان اس طرح کے کام کیوں نہیں کرتے؟''

''کیونکہ ہماری فلانتھروپی کی حدیں مقرر کر دی گئی ہیں، فطرہ اور زکوۃ، اور ان کی مقدار بھی طے ہے۔''

''تو جس دن ساری دنیا امیر ہو جائے گی اس دن ہم کیا کریں گے؟''

''ایسا دن کبھی نہیں آئے گا۔'' میں نے کہا۔ ''خدا کو اپنا کارخانہ چلانا ہے، اپنے نیک بندوں کو جنت پہنچانا ہے جس کا انھوں نے وعدہ کر رکھا ہے۔''

''کون سا خدا؟''

''وہ جو آسمان پر بیٹھا ہے۔ وہ ہم ایمان والوں کا خاص خیال رکھتا ہے۔ وہ یہ کبھی نہ ہونے دیں گے۔ فقرا اور مساکین، انھیں کے کاندھوں پر بیٹھ کر تو ہمیں جنت جانا ہے، ہندوؤں کی طرح نہیں کہ گائے کی پونچھ پکڑی اور سورگ پہنچ گئے۔''

''تمھاری باتوں سے لگتا ہے، تمھیں جنت میں یقین نہیں۔''

''تو میں جمعے کے روز نماز کیوں پڑھتا ہوں؟''

''وہ تمھارا ڈھونگ ہے۔ دراصل تم کنفیوزڈ ہو۔''

''اور تمام روزے جو ہر سال رکھتا ہوں؟''

''وہ تمھارا دکھاوا ہے۔ شاید تم دوسرے بیوقوفوں کی طرح سوچتے ہوگے، یہ صحت کے لیے مفید ہے۔ تمھارا روزہ اور کچھ نہیں، چوری چھپے ڈائٹنگ کا بہانہ ہے۔''

''اور جو فطرہ زکوۃ نکالتا ہوں؟''

''کیونکہ تم گھر کے لوگوں کے دباؤ میں ہو۔''

''اور جو ہر بقرعید کو میں قربانی دیتا ہوں؟''

''کیونکہ تم گوشت خور ہو۔''

''اور جو تم رنڈیوں کے محلے جاتے ہو؟''

''کیونکہ عورتیں مجھے پسند ہیں۔''

''اور جو شراب پیتے ہو؟''

''اس سے مجھے اچھی نیند آتی ہے۔''

''اور جو تم اپنے دوستوں کے ساتھ جوا کھیلتے ہو؟''

''کیونکہ مجھے ہارنا پسند ہے۔''

Scanned with CamScanner

ہماری بحث اور ٹرام اپنی متوازی لکیروں پر چل رہی تھی کہ اچانک ٹرام ایک دھچکے کے ساتھ رک گئی، جیسے اسے یہ بحث پسند نہ ہو۔ ہم پرندوں کی بیٹ سے مہکتے درختوں کے گھنے سائے میں ڈپو کے اندر آ چکے تھے۔ ٹرام کے اندر ہمارے علاوہ صرف ایک تین آنکھوں والا مسافر بچا تھا۔ فرق صرف یہ تھا کہ اس کی تیسری آنکھ وقت کے ساتھ دھندلی پڑ گئی تھی۔ اس نے اپنی بیساکھی بغل میں دبائی اور نیچے اتر کر پٹری کے کنارے کنارے چل پڑا۔

''اگر میں یہ برے کام کرتا ہوں تو ان کے لیے شرمندہ بھی ہوں۔'' بختاور منمنا رہا تھا۔ وہ شاید ہمارے بیچ ہونے والے مکالمے سے جل گیا تھا۔ ''کم از کم خدا اور رسول میں میرا ایمان تو پختہ ہے۔ تم تو اللہ کے ساتھ ساتھ دنیا والوں کو بھی دھوکا دیتے ہو۔''

''مجھے یقین کامل ہے، تم جنت جاؤ گے۔'' میں نے اس کا داہنا کندھا تھپتھپاتے ہوئے کہا۔ ''تمھارے جیسوں کے ساتھ اس کے علاوہ اور کچھ ہو ہی نہیں سکتا۔''

ڈپو کے باہر کھلا آسمان تھا۔ گاڑیاں دندناتے ہوئے گزر رہی تھیں۔ کبوتر ٹرام کے اوور ہیڈ تاروں پر نٹ بولٹ کی طرح چپکے ہوئے تھے اور ایک واحد کتا ٹریفک کانسٹبل کے بکس کے سائے میں سرزمین پر ڈالے غنودگی کے مزے لے رہا تھا۔ اس کا سرخ مرچی نما آلۂ تناسل اپنے میان سے باہر نکلا ہوا تھا۔ شاید وہ کسی کتیا کو خواب میں دیکھ رہا تھا۔ ہماری جنتیں!

''اس کتے کو دیکھ رہے ہو؟'' میں نے کہا۔ ''اس کا بھی ایک خدا ہے۔''

''تم کہنا کیا چاہتے ہو؟''

''میں کہنا چاہتا ہوں کہ یہ خود سے وجود میں نہیں آیا، نہ اس نے اس کی اجازت دی تھی کہ اسے کتا بنایا جائے۔'' میں نے اس ہوٹل کی طرف اشارہ کیا جہاں ایک مخصوص میز پر بیٹھ کر ہم بیف رول کے ساتھ چائے یا کوک کے مزے لیا کرتے۔ یہاں ہم زیادہ تر ایسے وقت میں نمودار ہوتے جو نہ کھانے کا وقت ہوتا نہ ناشتے کا، اس لیے اور دوسری میزوں کے مقابلے وہ میز زیادہ تر خالی ملتی۔ آج تمام میزیں خالی تھیں، سوائے اس مخصوص میز کے، جس پر ایک جوڑا بیٹھا رومانس لڑا رہا تھا۔ لڑکا جینز اور ٹی شرٹ پہنے ہوئے تھا۔ لڑکی سیاہ برقعے میں تھی۔ اس نے چہرے سے نقاب الٹ رکھا تھا اور اپنی مہین مونچھوں سے مسکرا رہی تھی۔ کیش کاؤنٹر پر بیٹھے شخص نے ہماری طرف لاچارگی سے دیکھا۔

Scanned with CamScanner

انھیں پتا تھا، یہ ہماری محبوب جگہ تھی۔ کبھی کبھی، جب ہماری بحث حد سے تجاوز کر جاتی، تو وہ اپنا ایک کان ہمارے لیے وقف کر دیتا۔

"کوئی بات نہیں۔ ہم کسی دوسری میز پر بیٹھ جاتے ہیں۔" ہم دوسرے کونے میں چلے گئے۔

"اس کتے سے تمھارا مطلب کیا ہے؟" شاید بختاور کو میری بات سے تشفی نہیں ہوئی تھی۔ میں نے ویٹر کو بیف رول لانے کے لیے کہا۔

"ہم انسان بن کر پیدا ہوئے اور وہ کتا بن کر،" میں نے کہا۔ "اس کی کوئی تو وجہ رہی ہوگی۔"

"وہ رب الاسرار ہے۔ آخری بات کا علم صرف اس کو ہے۔"

"چلو بات ختم ہوئی،" میں نے کہا۔ "جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ہماری بحث کی شروعات ہی غلط تھی۔"

رول کیے ہوئے پراٹھوں کے اندر کباب میں کوئلے کا ذائقہ شامل تھا۔ ہمارے تینوں اطراف کی میزوں پر مکھیاں بھنبھنا رہی تھیں۔ ہوٹل کے باہر ڈپو کے داخلے سے بدرنگ ٹرام کاریں نکل نکل کر شور مچاتے ہوئے شاہراہ کی ٹریفک میں ضم ہو رہی تھیں۔ ہمیں لگ رہا تھا، ہمارے پاس بحث کے لیے اب کچھ بھی نہیں بچا تھا اور ہم نے یکسر اس میز کو اپنے تصرف میں لے رکھا تھا۔ رومانک جوڑے کے اندر ایک دوسرے کے لیے چپکنے میں کافی اضافہ ہو گیا تھا۔ دونوں آپس میں چپک کر سیامی جوڑے میں ڈھل گئے تھے۔

"عورت کے بغیر یہ دنیا کتنی ویران ہوتی؟" بختاور جوڑے کی طرف تاکتے ہوئے احترام سے تاک رہا تھا۔

"عورت نہ ہوتی تو یہ جاننے کے لیے ہم موجود کہاں ہوتے!" میں نے چائے کی آخری چسکی لی۔

"کیا یہ اچھا ہوتا؟" بختاور ایک بار پھر بحث کے موڈ میں دکھائی دے رہا تھا۔

"اس بات کا پتا اس رب الاسرار کو ہوتا۔ آخری بات کا علم صرف اس کو ہے،" میں نے اس کی گرمجوشی پر ٹھنڈا پانی انڈیلتے ہوئے کہا اور پیالی کے پیندے میں جمی چائے کی پتیوں کی طرف تاکنے لگا۔

اس ہوٹل کو بھی چائے کی پتی بدلنی چاہیے، میں نے سوچا۔

Scanned with CamScanner

3 لاک اپ کے اندر بیٹھا ہوا آدمی

وہ بختاور کی بالکل ہی تازہ، اور بقول بختاور ایک حیرت انگیز دریافت تھا۔

''میں اپنے موبائل کی گمشدگی درج کرانے تھانے گیا ہوا تھا۔۔۔'' بختاور نے بتایا۔''جب میں نے اسے لاک اپ کی سلاخوں کے اندر بیٹھا پایا۔ وہ اپنی بہت ہی حیرت انگیز آنکھوں سے میری طرف تاک رہا تھا۔''

''وہ تمھارے خواب میں بھی آیا ہوگا۔'' میں نے رائے دی۔

''میں اپنے خوابوں کے دروازے اتنی آسانی سے نہیں کھولتا۔'' بختاور نے قدرے خفگی کے ساتھ کہا۔''مگر تم نے ٹھیک کہا، میں نے ایک دن خواب میں دیکھا کہ ہم دونوں ایک دوسرے کو برسوں سے جانتے ہیں اور وہ میرا ہم شکل ہوتا جارہا ہے۔''

''تم نے دوسری ملاقات پر اس کے اسرار کو سلجھانے کی کوشش کی؟''

''میری اس سے پھر کبھی ملاقات نہیں ہوئی۔''

ہم دونوں تھوڑی دیر تک خاموش رہے۔ سامنے سڑک سے سائیکل سواروں کی ایک ریلی گزر رہی تھی۔ آسمان طیاروں سے خالی تھا اور کوئی مولانا دور کسی لاؤڈ اسپیکر پر چنگھاڑتے ہوئے دنیا کے فانی ہونے کا اعلان کر رہا تھا۔

''تمھیں نہیں لگتا، اگر اس سے دوبارہ تمھاری ملاقات نہ ہوئی تو وہ ایک ٹیومر کی طرح تمھارے دماغ میں بس جائے گا؟ ایک ٹیومر بن کر اس کے خلیوں کو تباہ کر ڈالے گا؟'' میں نے اسے پیشگی ہوشیار کرتے ہوئے کہا۔''اس سے چھٹکارا پانے کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ تم اسے ڈھونڈ نکالو اور اس کا معما حل کرو۔''

''اور کوئی دوسرا طریقہ؟'' بختاور امید بھری نظروں سے میری طرف تاک رہا تھا۔''اتنے بڑے شہر میں اگر اسے ڈھونڈ نکالنا ممکن نہ ہوا تو؟ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ وہ لمبے عرصے کے لیے جیل چلا گیا ہو۔ پھر جیسا کہ تم کہتے ہو، میں اس ٹیومر کا کیا کروں گا؟''

''اس سے بھی زیادہ طاقتور ایک دوسرا ٹیومر دریافت کرلو جو تمھارے ذہن کو پوری طرح اپنے

Scanned with CamScanner

قبضے میں لے لے، اس رسولی کے لیے کوئی جگہ نہ چھوڑے۔"

بختاور نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور ریلی میں آخری سائیکل سواروں کو دیکھنے لگا جنھوں نے اپنے ہینڈل بار سے چھوٹی چھوٹی جھنڈیاں لگا رکھی تھیں۔

"کوئی اسے چپ کرائے" اس دوران وہ مقرر سے اکتا کر اس نے کہا۔ "الفاظ، الفاظ، الفاظ... جسے دیکھو وہ الفاظ کے کوڑے بکھیرنے میں لگا ہوا ہے۔ مجھے تو شک ہے کہ کچھ لوگوں کے پاس منھ کے علاوہ اور کچھ ہوتا ہی نہیں۔ مقصد بھی نہیں ہوتا۔ کوئی انھیں سمجھائے۔ ہمارے دونوں کان ان کی خاندانی جائیداد نہیں ہیں۔"

"جتنا بڑا احمق اتنا بڑا مقرر!" میں نے اس کی تائید کی۔ "مگر ہمیں اس آدمی کے بارے میں سنجیدگی سے سوچنا چاہیے جسے ہم ٹاپ اپ میں چھوڑ آئے۔"

ہم لوگ فٹ پاتھ کے اس مصروف حصے پر کیوں رک گئے تھے؟ کہاں جا رہے تھے ہم لوگ؟ ہم دونوں نے ایک دوسرے کی طرف حیرت سے دیکھا۔ واقعی ہم دونوں یہ باتیں بھول چکے تھے۔ یہ سیاسی ریلی اور دوران وہ اسٹیج پر چیختا مقرر، آخر ان کا کچھ تو نتیجہ نکلنا تھا۔ تو پھر اب ہم کیا کریں؟

"اب ہم کیا کریں؟" میں نے اپنا متفکر چہرہ بختاور کے سامنے پیش کیا۔

"یہ ضروری نہیں کہ ہماری زندگی یا مرنے کا کوئی مقصد ہو" اس نے کہا۔ "ہم بلاوجہ بھی بہت دیر تک زندہ رہ سکتے ہیں۔"

"بختاور، میرے دوست تم نے واقعی ایک عظیم بات کہہ دی ہے" میں نے احترام کے ساتھ اس کی انگلیوں کو چومتے ہوئے کہا۔ "بلاوجہ زندہ رہنا، یہ واقعی حیرت انگیز ہے۔ اتنے سامنے کی بات، اور میں آج تک اسے سمجھ نہ پایا۔ میں تمھارا احسان مند ہوں۔ اس ٹاپ اپ کے آدمی نے واقعی تمھیں بدل ڈالا ہے۔"

اور بلا مقصد چلتے چلتے ہم دونوں ایک اسی دقیانوسی عمارت کے حصے پر جا پہنچے جہاں نقل مکانی کا عمل جاری تھا۔ ایک دیہاتی اور اس کا ساتھی سامان عمارت سے باہر لا رہے تھے جہاں ایک دس پہیوں والی لاری کھڑی تھی۔ اندر عمارت کے برآمدے پر ایک چوبی لفٹ کا دروازہ کھلا ہوا تھا جس کے اندر ایک بوڑھی عورت ایک تابوت کا بکس تھامے لفٹ مین کا انتظار کر رہی تھی جو سڑک پر رکھے

Scanned with CamScanner

ساماتوں کی نگہداشت میں لگا ہوا تھا۔

''اور اس طرح شہر اپنا چہرہ بدلتا رہتا ہے،'' بختاور نے کہا۔ ''ہمیں پتا بھی نہیں چلتا اور ایک دن ہم دیکھتے ہیں، ہم ایک دوسری دنیا کے باشندے ہیں، یہی نہیں، بلکہ ہمارے آئینے کے اندر سے ایک دوسرا آدمی برآمد ہوتا دکھائی دیتا ہے۔''

''اف! تم بختاور نہیں ہو سکتے۔'' میں اپنی مرعوب آنکھوں سے اس کی طرف تاک رہا تھا۔ ''اتنے دنوں تک تم نے اپنے آپ کو کہاں چھپا رکھا تھا؟''

''یہ اس لاک اپ کے اندر بیٹھے ہوئے آدمی کا اثر ہے۔'' بختاور ہنسا۔ ''میں نے تم سے کہا تھا کہ میں نے خواب میں دیکھا تھا کہ وہ دن بدن میرا ہم شکل ہوتا جا رہا ہے۔ دراصل بات دوسری ہے۔ دراصل میں دن بدن اس کا ہم شکل ہوتا جا رہا ہوں۔''

''تو پھر ہوشیار رہنا میرے دوست۔ کہیں تم بھی ایک دن لاک اپ کے اندر نظر نہ آؤ۔ اور سقراط کے بعد لاک اپ میں نظر آنے والے تم دوسرے انسان نہیں ہو گے۔''

''تمھیں کیا لگتا ہے، ہم دونوں لاک اپ میں نہیں ہیں؟'' بختاور نے اپنا ہاتھ پھیلا کر سڑک کو دور تک اپنے احاطے میں لیتے ہوئے کہا۔ ''اگر نہیں ہیں تو تم کوئی دوسری زندگی جی کر دکھا دو۔''

''دوسری زندگی؟ اس کے لیے تو میں اپنا سب کچھ نچھاور کر سکتا ہوں،'' میں نے کہا۔ ''مگر شاید تم ٹھیک کہہ رہے ہو، یہ ممکن نہیں ہے۔ واقعی ہم تمھارے لاک اپ میں بیٹھے ہوئے آدمی سے کچھ الگ نہیں ہیں۔''

4 معصوم آنکھوں والا گھوڑا

پھر ایک دن وہ واقعہ پیش آیا جس کا خدشہ دھیرے دھیرے بڑھنے لگا تھا۔

بختاور نے داڑھی بڑھا لی، سر پر کروشیا سے بنی ہوئی جالی دار ٹوپی دائمی طور پر چپکا لی اور صوم و صلوٰۃ کا پابند ہو گیا۔

''بختاور، میرے دوست،'' میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''آخر کار تم

نے بھی ہتھیار ڈال دیا!"

"یہ واقعہ میری لانڈری کے اندر پیش آیا۔" بختاور نے اپنی داڑھی کھجاتے ہوئے کہا جس میں پکے ہوئے کچھ بال اس کی صحیح عمر کی غمازی کر رہے تھے۔ "ایک دن ایک گھوڑا بھاگتا ہوا میری لانڈری کے اندر آ گھسا اور سامنے کی دونوں ٹانگیں کاؤنٹر پر رکھ کر اپنے خطرناک جبڑے کھول کر کھڑا ہو گیا۔ اس کا یہ نتیجہ نکلا کہ میری دونوں سیلز گرلز ایک ساتھ بے ہوش ہو گئیں۔"

"میرا خیال ہے، میں نے تمھاری دکان کے آس پاس کبھی کوئی اصطبل نہیں دیکھا۔"

"نہیں نا؟" بختاور ہنسا۔ "مگر تم اپنے شہر کو کتنا جانتے ہو؟ اس میں اب بھی کئی گھڑسوار زندہ ہیں۔ شاید تم سوچ رہے ہو گے کہ گھوڑوں کا دور جا چکا۔ مگر کوئی دور بھی پوری طرح ختم نہیں ہوتا۔"

"اب تم نے کہا ہے تو مجھے لگ رہا ہے، میں نے ایک آدھ گھڑسوار کہیں دیکھا ہے۔"

"دراصل وہ گھوڑا اپنے سوار کو الٹ کر بھاگا تھا جو ایک رسی اس کے جبڑوں کے درمیان ڈالے، بغیر زین کے اس کی پیٹھ پر بیٹھا ہوا تھا،" بختاور نے کہا۔ "کاش تم وہ نظارہ دیکھتے۔ میں کاؤنٹر کے پیچھے کھڑا تھا اور وہ آدھا جسم باہر رہنے پر، آدھا دکان کے اندر ڈالے، اپنا سر کاؤنٹر سے اندر کی طرف بڑھائے ہوئے، دونوں لڑکیوں کی طرف تاک رہا تھا۔ کاش تم اس کے رال ٹپکاتے دانتوں اور سرخ مسوڑھوں سے پیدا ہونے والی دہشت کو دیکھ پاتے، جو اتنے فحش نظر آ رہے تھے کہ تمھیں کسی اور شے کی یاد آ جاتی جس کا تم نام نہیں لے سکتے۔ مگر جب میں نے اس کی آنکھوں کے اندر نظر ڈالی تو مجھے وہاں ایک عجیب قسم کی معصومیت اور پاکیزگی دکھائی دی۔"

"تم اس سے خوفزدہ نہیں ہوئے؟"

"میں خوفزدہ تھا، مگر بہت جلد میرا خوف کافور ہو گیا جب میں نے اس سے نظریں ملائیں۔"

"اب یہ مت کہو کہ ایک گھوڑے نے تمھیں راہ راست پر لگا دیا!" میں نے بے یقینی کے ساتھ کہا۔

"ایسا کچھ بھی نہیں ہے۔" بختاور کو شاید میری بات راس نہیں آئی تھی۔ "میں نے صرف اس کی آنکھوں کی پاکیزگی کی بات کہی ہے۔ وہ تو زیادہ دیر رکا بھی نہیں، واپس پلٹ کر سڑک پر پھر سے بھاگنے لگا۔"

Scanned with CamScanner

''تب تو اس سڑک پر کافی ہنگامہ ہو گیا ہوگا۔''

''ہاں۔'' بختاور ہنسا۔ ''تھوڑی دیر بعد اس کا سوار بھی نظر آیا۔ وہ کمر پر ہاتھ رکھے لنگڑاتا ہوا اپنے گھوڑے کی تلاش میں جا رہا تھا۔''

''تو اس واقعے میں سوائے گھوڑے کی آنکھوں کے ایسی کیا بات ہوئی کہ تم اتنے بدل گئے؟''

''تم یقین نہیں کرو گے۔''

''میں یقین دلاتا ہوں۔''

''نہیں، تم یقین نہیں کرو گے۔'' بختاور بری طرح سنجیدہ ہو چکا تھا۔ ''مگر میں تمھیں ضرور بتاؤں گا، تم میرے اُن دنوں کے دوست ہو جب ہم طرح طرح کی خرافات میں یقین رکھتے تھے۔''

شاید میں کچھ کہتا مگر اسے خاموش ہوتے دیکھ کر میں نے بھی خاموش رہنے میں عافیت سمجھی۔

بختاور آسمان کی طرف تاک رہا تھا، آسمان جو وہاں تھا ہی نہیں۔

''تم وہاں کیا دیکھ رہے ہو؟'' میں نے اس کی نظروں کا تعاقب کرتے ہوئے کہا۔

''تمھیں نہیں لگتا، یہ آسمان اپنا کردار کھو چکا ہے؟''

''اس کے ساتھ کبھی کبھار یہ ہو جایا کرتا ہے،'' میں نے سائنسی توضیحات پیش کرنے کی کوشش کی۔ ''یہ موسم کا اثر ہے۔ کبھی کبھار یہ چیزوں کو بہت دھندلا کر دیتا ہے جیسے یہ کوئی مابعد الطبیعیاتی فلسفہ بگھار رہا ہو۔ کبھی روشنیاں عجیب ڈھنگ سے مناظر کی نفی کرتی نظر آتی ہیں۔''

''نہیں، ایسا کچھ بھی نہیں ہے۔'' وہ ایک ٹک آسمان کی طرف تاکے جا رہا تھا۔ ''دراصل وقت بے وقت ہماری آنکھیں بدل جاتی ہیں۔ چیزیں تو اپنی جگہ وہی رہتی ہیں، صرف ہماری آنکھیں بدل جاتی ہیں۔''

''میں دیکھ رہا ہوں، تم پر اب بھی اس گھوڑے کا اثر ہے۔''

''میں بتا رہا ہوں نا!'' اس نے واپس میری طرف تاکتے ہوئے کہا۔ ''تم میری دونوں سیلر گرلز کو دیکھتے جب وہ ہوش میں آئیں۔''

''آہ، میں انھیں بھول چکا تھا!''

''تم یقین نہیں کرو گے... تم یقین نہیں کرو گے...''

''میں یقین دلاتا ہوں۔''

Scanned with CamScanner

''نہیں، تم یقین نہیں کرو گے۔'' اس نے بے یقینی سے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''مگر میں تمہیں ضرور بتاؤں گا۔ تم میرے ان دنوں کے دوست ہو جب ہم نے ابھی زندگی جینا شروع بھی نہیں کیا تھا۔''

''بختاور، میرے دوست!'' میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ ''اب اگل بھی ڈالو۔ اگر تم نے وہ بات مجھے نہیں بتائی تو یہ خود تمہیں مار ڈالے گی۔''

''ان دونوں لڑکیوں کے چہروں کا تبادلہ ہو گیا تھا۔''

میں بختاور کی طرف تاک رہا تھا۔ میں کوشش کر رہا تھا کہ میرے چہرے پر ایسا کوئی تاثر پیدا نہ ہو جس سے اسے یہ شبہ ہو جائے کہ میں نے اس کی بات کا یقین نہیں کیا

''اور یہ تم نے کیسے اندازہ لگایا، بختاور؟''

''کیا میں اپنی لڑکیوں کو، ان کے پس منظر کو نہیں جانتا؟''

''کیا میں ان سے مل سکتا ہوں؟''

''وہ دونوں نوکریاں چھوڑ کر جا چکی ہیں۔'' بختاور نے میری طرف شبہے کے ساتھ تاکتے ہوئے کہا۔ ''اس کے جانے کے بعد میری دکان کو ایک سناٹے نے نگل لیا۔ میں اس کے اندر کئی دن تک پتھر کی ایک مورت کی طرح بیٹھا رہا۔ نہ گاہک آئے، نہ گئے۔ ایک معاملہ تو پولیس اسٹیشن تک پہنچ گیا۔ مجھے علم ہی نہیں تھا کہ ڈرائی کلین کے لیے دیے گئے اس گاہک کے کپڑے کون سے تھے، کہاں رکھے تھے۔ میرے دوست، تم نہیں سمجھ سکتے، میں کتنے بڑے امتحان سے گزر رہا تھا۔ اس واقعے نے مجھے میری جڑوں تک ہلا کر رکھ دیا۔ پھر ایک صبح دکان کھول کر میں اپنی کرسی پر بیٹھا ہوا تھا کہ نیم اندھیرے میں گھوڑے کی معصوم آنکھیں ہوا میں تیرتی ہوئی میرے پاس آئیں اور میری آنکھیں بھیگ گئیں۔ میں دکان کے اندر گیا جہاں گندے کپڑوں کے ڈھیر پڑے تھے۔ میں نے ایک دھلا دھلایا بستر لنولیم کے فرش پر بچھایا اور سجدہ ریز ہو گیا۔ جانے میں کتنی دیر تک اسی طرح گرا رہا۔ پھر میں نے سر سجدے سے اٹھا کر ہاتھ پھیلائے اور اللہ پاک سے دعا مانگی کہ مجھے اس شکنجے سے باہر نکالے۔''

''اب یہ نہ کہنا کہ پھر ایک معجزہ ہو گیا!''

''بالکل!'' بختاور کا چہرہ دمک اٹھا تھا۔ ''وہ ایک معجزہ ہی تھا۔ میں واپس کاؤنٹر پر لوٹا ہی تھا کہ مجھے دو چینی لڑکیاں نظر آئیں۔ وہ کام کی تلاش میں اپنے سی وی کے ساتھ میری دکان پر آئی تھیں۔''

Scanned with CamScanner

"وہ واقعی چینی لڑکیاں تھیں؟"

"خالص النسل چینی!" بختاور ہنسا۔ "اور میرے دوست، تم یقین نہیں کرو گے، میں اس گھوڑے کا کس قدر ممنون ہوں۔ شاید تم نے ٹھیک کہا کہ اس نے مجھے راہ راست پر لگا دیا۔"

واقعی، مجھے تسلیم کرنا ہوگا کہ بختاور اب میری انگلیوں سے نکل چکا تھا۔ دوسرے دن اپنے تجسس سے مجبور ہو کر جب میں اس کی دکان پر گیا تو وہاں دونوں لڑکیاں کاؤنٹر پر گاہکوں سے نپٹ رہی تھیں۔ ایک نے سر پر گولف کیپ چڑھا رکھی تھی جس کا رخ پیچھے کی طرف تھا، جس کے سبب اس کی پیشانی کافی ابھری ہوئی نظر آ رہی تھی۔ دوسری کوئی ہندی فلمی گیت گنگنا رہی تھی۔ بختاور اس وقت وہاں پر نہیں تھا۔

"آپ کا کوئی کپڑا ہے سر؟" مجھے کونے میں چپ چاپ کھڑے دیکھ کر ایک [illegible] مجھ تک آئی۔ میں نے ایک لمبی سانس کھینچی۔ یہ کانچ کی گڑیاں میری سمجھ سے باہر تھیں۔

"نہیں،" میں نے جواب دیا۔ "مسٹر بختاور میرے دوست ہیں۔ تم دونوں نئی ہو اس لیے مجھے نہیں جانتیں۔"

چپ ینگ ڈائرز اینڈ ڈرائی کلینرز کے زینے سے سڑک پر واپس اترتے وقت میں نے ایک بار گھنے پیڑوں کے اوپر پھیلے ہوئے تانبے کے آسمان کی طرف دیکھا۔

اور مجھے یہ سوچنے پر مجبور ہونا پڑا کہ واقعی یہ کیا کم ہے کہ اتنی کثافت کے باوجود یہ آسمان ہمیشہ واپس لوٹ آتا ہے۔

میرا آخری دوست، میں اور چند بے تکے واقعات

1 ایک سبزی خور کے گوشت خور بننے کا واقعہ

کچھ دنوں سے میں محسوس کر رہا ہوں کہ دھیرے دھیرے میرے دوست کم ہوتے جا رہے ہیں۔ کہ میں اس کے لیے ذمہ دار نہیں، میں یہ بھی نہیں کہتا۔ مجھے اس کا احساس ہے کہ حالات کے دباؤ میں آ کر

میں نے اپنے آپ کو تھوڑا سا بدلنے پر مجبور پایا ہے۔

نور گل، میرا آخری دوست، جو اب بھی میرے ساتھ چپکا ہوا ہے اور میں نے جسے پہلی بار چلچلاتی دھوپ میں ایک پارک کے اندر مالی سے ہاتھا پائی کرتے دیکھا تھا، اس کا بھی یہی کہنا ہے کہ میرے ساتھ جو کچھ ہو رہا ہے، اس کے لیے ذمہ دار میں ہی ہوں۔

''اوّل یہ کہ تم اپنے بالوں پر دھیان نہیں دیتے۔'' اس نے مجھ سے کہا۔ ''وہ ہر وقت اتنے بکھرے ہوتے ہیں کہ تم ہمیشہ پریشان دکھائی دیتے ہو، اور یاد رکھو، آج کی دنیا میں لوگوں کی خود کی اپنی پریشانیاں اتنی ہیں کہ وہ دوسروں کی پریشانیوں کا حصہ دار بننے کے روادار نہیں ہیں۔''

''ایسا نہیں ہے۔ میری پریشانی کی کیا وجہ ہو سکتی ہے؟ دراصل یہ اس موسم کا، اس کی گرم ہوا کا اثر ہے۔'' میں نے عذر پیش کیا۔ ''مجھے چاہیے کہ میں آئینہ اور کنگھی ہمیشہ اپنے ساتھ رکھا کروں۔''

''بالکل'' نور گل نے تائید میں سر ہلایا۔ ''اور یہ بھی ہے کہ تھوڑا مسکرایا کرو، یار۔ تم مسکرا تو لیتے ہو مگر اس مسکراہٹ کو زیادہ دیر تک چہرے پر رکھ نہیں پاتے۔ ایسا کیوں ہوتا ہے؟ یہ مسکراہٹ اتنی جلد کیسے مُر جاتی ہے؟ آخر معاملہ کیا ہے؟''

''یہی کا تو رونا ہے۔'' میں نے ارغوانی آسمان کی طرف دیکھا جس سے ایسا لگ رہا تھا جیسے سارے چیل کوّے کسی سازش کے تحت ایک ساتھ غائب ہو گئے ہوں۔ ''شاید یہ راز اب وہاں پر جا کر ہی کھلے۔''

''تم میرے دوست ہو اور تمھارے کھلے پن کی وجہ سے میں تمھاری قدر کرتا ہوں۔'' نور گل نے اپنا بھاری ہاتھ میرے کندھے پر رکھتے ہوئے پرندوں سے خالی آسمان کی طرف دیکھا۔ ''مگر یہ تو حد ہے۔ تم اس طرح کی بے تکی باتیں کر کیسے لیتے ہو؟ تمھاری پریشانیاں کیا ہیں؟ تمھیں ماہر نفسیات سے رجوع کرنا چاہیے۔''

''تم ایسے کسی ڈاکٹر کو جانتے ہو؟''

''ایک شخص ہے جو اپنے مطب میں بیٹھا مکھیاں مارا کرتا تھا، اب پیٹ چلانے کے لیے لوگوں کو ہومیوپیتھی کی دوائیں دیا کرتا ہے جس کی ڈگری اس نے حال ہی میں حاصل کی ہے۔''

''کیا اس ملک میں لوگوں کی ساری نفسیاتی الجھنیں دور ہو چکی ہیں؟'' میں نے حیرت کا اظہار

Scanned with CamScanner

کیا۔" ویسے ایک ہومیو پیتھ کو سائیکو پیتھ میں بدلتے دیکھنا اچھا تجربہ رہے گا۔"

"تو تم اپنے نفسیاتی علاج کے لیے تیار ہو؟"

"میرے بال تو پھر بھی بکھرے ہی رہیں گے۔" میرا جواب تھا۔" اور میری فوری طور پر اتر جانے والی مسکراہٹ، اس کا کیا کروں؟"

"تم نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔"

میں نے اثبات میں سر ہلا تو دیا مگر دوسرے ہی پل مجھے احساس ہوا کہ میرا یہ قدم بجائے خود ہو سکتا ہے کسی بڑی نفسیاتی الجھن کا پیش خیمہ ہو۔ مگر اب کیا کیا جا سکتا تھا۔ تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ دوسرے دن چکنی فار برکس پر بچھی لوہے کی پٹریوں پر ٹرام کے پہیے ڈگمگا رہے تھے جب ہم دونوں اس سنسان گلی نما سڑک پر اترے جہاں پر ہر مہینے ایک آدھ خون ہو جایا کرتا تھا۔

"دن کے وقت اس سے محفوظ جگہ اس سیارے پر تمہیں دوسری نہیں ملے گی۔" نور گل نے میری ہمت بڑھائی۔

"تم اس کی سند دے رہے ہو؟"

"بالکل!" نور گل کا سر فخر سے بلند تھا۔" میں اس علاقے کو اپنی ہتھیلی کی لکیروں کی طرح پہچانتا ہوں۔ میں اس جگہ کو ان دنوں سے جانتا ہوں جب افیم خور یہاں بھیڑ لگاتے تھے۔ اس جگہ کی ویرانی نہیں کھینچ لاتی تھی۔ تم اس افیم کے سنہرے دور کے بعد پیدا ہوئے۔"

"واقعی ہم تو چھپے رستم نکلے! اور میں سمجھ رہا تھا تم دیہات سے آئی ہوئی چڑیا ہو جس کی آنکھیں ابھی ٹھیک طرح سے کھلی نہ ہوں۔"

"دیہات کا نام مت لو۔" نور گل چلتے چلتے ٹھہر گیا، جیسے میری بات سے اسے تکلیف پہنچی ہو۔ "میں نے بڑی مشکل سے اس سے پیچھا چھڑایا ہے۔"

"اور تمہارے لوگ... وہ تمہیں یاد نہیں آتے؟"

"میں ان پر مٹی ڈال چکا ہوں۔" وہ پھر سے چلنے لگا۔" اگر مجھے چننے کا حق ہوتا تو میں کبھی دیہات میں جنم نہ لیتا۔"

"شاید ہم اپنی منزل پر آگئے ہیں۔" میں نے اس کھپریل کے چھپر کی طرف اشارہ کیا جس

Scanned with CamScanner

کے نیچے برآمدے پر ایک ڈاکٹر کی تختی لٹک رہی تھی۔ مطب کا نیلے رنگ کا لکڑی کا دروازہ بند تھا جب کہ تختی پر لکھا ہوا وقت بتا رہا تھا کہ یہ وقت ڈاکٹر کے آنے سے آدھے گھنٹے بعد کا ہے۔

"وہ جلد آ جائے گا۔ میں نے موبائل پر اس سے رابطہ کر لیا تھا۔ دیر سے آنا ڈاکٹروں کی ایک تجارتی مصلحت ہے۔ ہمیں اس کے ساتھ تعاون کرنا چاہیے۔" نور گل نے کہا۔ "اسی درمیان کیوں نہ ہم سامنے کے ہوٹل میں ایک انڈا رول کھائیں۔"

"اور ایک وقت تھا کہ میں پوری طرح سبزی خور تھا۔" نور گل نے ٹیبل پر بیٹھے بیٹھے رول پر منہ مارتے ہوئے بتایا جو ایک اخبار میں لپٹا ہوا تھا۔ بار بار گیلے کپڑے سے صاف کیے جانے کے سبب میز کی سن مائیکا کی چمک ماند پڑ گئی تھی اور ایسا لگ رہا تھا جیسے اس سے کسی آدمی کا [illegible] ابھر آیا ہو۔ پلاسٹک کے کٹوروں میں پڑی ہوئی ہری مرچیاں خود پلاسٹک کی لگ رہی تھیں۔ میں نور گل کی آنکھوں سے ڈرتا ہے گا۔ نور گل۔ میں سوچ رہا تھا۔ میرے آخری دوست نور گل، دیہات سے ہار کر تمہیں اس شہر میں آنا پڑا، ایک وہاں بھی تم نہ رہی ہوگی مگر تم نے تو پورے شہر کو اپنے اندر سمو لیا ہے۔ "تم سبزی خور کیسے بنے؟" "کوئی ماں کے پیٹ سے سبزی خور یا گوشت خور بن کر پیدا نہیں ہوتا۔"

"یہی تو بتا رہا ہوں۔ میں بالکل چھوٹا تھا جب اپنے گاؤں کے باہر کھیت کی منڈیر پر چلتے چلتے میں نے ایک دن ایک منظر دیکھا جو ایک حامد گائے کا پیٹ چاک کر رہا تھا۔ وہ منظر میں آج بھی بھلا نہیں پاتا۔"

"اور تم دوبارہ گوشت خور کیسے بنے؟"

"بہت جلد مجھے پتا چل گیا کہ محض کھانے کی عادت کی بنیاد پر تم انسان کا کردار طے نہیں کر سکتے، اسے اچھا یا برا نہیں بنا سکتے۔ اور یہ دنیا ہپوکریٹس سے بھری پڑی ہے جن میں میرا بھی شمار ہوتا ہے۔"

اس کے بعد ہم نے بہت کم گفتگو کی۔ کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ گفتگو کے سارے جواز بغیر کسی کوشش کے از خود ختم ہو جاتے ہیں۔ شاید وہ ایسا ہی کوئی لمحہ تھا جس سے ابھر کر ہم ہوٹل کے داخلے سے باہر آ گئے۔

ڈاکٹر دبلا پتلا، گنجا اور عینک پوش تھا۔ اس کی ناک طوطے کی چونچ کی طرح نوکیلی مگر دوہری تھی۔ اس نے نیلے پردوں سے دونوں قد آدم سے کچھ چھوٹے دریچوں کو ڈھک رکھا تھا۔ اس تاریک

Scanned with CamScanner

کر دیے گئے۔ جوتوں سمیت ایک اونچی مستطیل میز پر لٹا دیا گیا۔ اب میرے اوپر کھپریل کے سوراخوں میں دھوپ کی کنیاں چمک رہی تھیں جن پر مکڑیوں کے جالے کسی آسیب کے بال کی طرح نظر آرہے تھے۔ میں سوچ رہا تھا، شاید اب میں لیٹے لیٹے اوپر اٹھ کر ہوا میں معلق ہو جاؤں گا۔ سائیکیاٹرسٹ میرے سامنے ایک اونچی اسٹول پر بیٹھا مسکرا رہا تھا۔ اس کے دانت اتنے سفید تھے کہ نقلی لگ رہے تھے۔ شاید وہ نقلی ہی تھے۔

''ہاں، اب ہم اپنی بات شروع کر سکتے ہیں۔''

''میں کہاں سے شروع کروں؟''

''کہیں سے بھی۔ ایسا کوئی واقعہ جس کے بعد تمھیں لگا ہو کہ زمین اور آسمان کے بیچ کی تمام چیزیں اپنی اہمیت کھو چکی ہوں اور تمھارا مسکرانا کسی جوکر یا فلم اسٹار یا سیاست دان یا ماڈل کے مسکرانے کی طرح نقلی ہو اور تمھاری گفتگو بغیر سر پیر کی بحث کی طرح لمبی کھنچتی چلی جا رہی ہو۔''

2 ایک چوہیا اور اس کے بچوں کا قتلِ عام

''1960 کے اپریل میں، جب سورج ہمیشہ کی طرح بے رحم تھا، میں نے اس سے اکتا کر ایک بڑی توند والی چوہیا کا پیچھا کیا اور لوہے کے راڈ سے اس کا پیٹ کچل ڈالا۔

''ایسا نہیں تھا کہ یہ مجھ سے پہلی بار ہوا تھا مگر وہ چوہیا حاملہ تھی اور میں نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا، اس کے پیٹ کے پھٹے ہوئے حصے سے ان گنت چھوٹے چھوٹے چوہے اندر کی رطوبت کے ساتھ بہہ بہہ کر باہر آرہے تھے جن میں کئی کلبلا بھی رہے تھے۔ ان بچوں کی آنکھیں ابھی بنی نہیں تھیں کیونکہ وہ وقت سے پہلے ہی دنیا میں آ گئے تھے۔ مجھ سے ان کا مرنا دیکھا نہیں گیا۔ میں نے تنکے کے جھاڑو کی مدد سے اس ماں چوہیا کو اس کے اجنمے بچوں کے ساتھ، جن میں اب بھی کچھ پیٹ کے اندر تھے اور میری اس کوشش کے سبب پھسل پھسل کر باہر آرہے تھے، کارڈ بورڈ کے ایک ٹکڑے پر جمع کیا اور انھیں باہر لے جا کر کھلے نالے کے اندر پھینک دیا۔ میں پلٹ کر دو چار قدم ہی چل پایا تھا جب میں نے چیلوں اور کوؤں کو اس نالے کے اندر اترتے دیکھا۔''

Scanned with CamScanner

''اور اس کے بعد کیا ہوا؟ کیا تم اپنی معمول کی زندگی جیتے رہے؟'' سابیکیا ٹرسٹ کی آنکھیں اس کی عینک کے غلیظ شیشوں کے اندر سے جھانک رہی تھیں۔

''یہ میں یقین سے نہیں کہہ سکتا۔'' میں نے دوبارہ آنکھیں بند کر لیں اور ان دنوں کو یاد کرنے کی کوشش کی۔ ''بظاہر میں نے روز کی طرح باقی کا وقت گزارا، اپنے متھ اور مقصد کا روایتی استعمال کیا، کتابیں پڑھیں، رسمی طور پر ایک آدمی سے ہاتھ ملایا۔ مجھے یاد ہے میں نے اس رات سینما ہال میں ایک فلم بھی دیکھی جس نے میرے اندر گدگدی پیدا کی۔ مگر وہ چوہے کے چھوٹے چھوٹے ریشم کی طرح لجلجے جسموں والے مردہ، نیم مردہ، تقریباً زندہ بچے، اپنی آنکھوں سے محروم میرے آس پاس رینگتے رہے۔ میں دیر رات تک انھیں اپنے بستر پر محسوس کرتا رہا۔ انھیں اٹھا اٹھا کر باہر پھینکنے کی کوشش میں وہ بار بار ریشم کی طرح میری انگلیوں سے پھسل رہے تھے۔''

''اور اس کے بعد بھی تم نے کئی چوہے مارے؟''

''ظاہر ہے، کئی بار۔''

''کوئی حاملہ چوہیا؟''

''وہ آخری تھی۔ یا شاید کوئی حاملہ بھی رہی ہو۔ اس کی تصدیق آسان نہ تھی۔''

سابیکیا ٹرسٹ اپنے اونچے اسٹول پر چپ چاپ بیٹھا تھا۔ پھر اس نے اپنی دونوں ہاتھوں کی سیل میز کے کنارے رکھ کر اپنا نچلے کا جبڑا نکالا۔ ''اس واقعے سے کچھ بھی ثابت نہیں ہوتا۔ اور پھر اس وقت تمھاری عمر بھی کم تھی۔ کوئی ایسا واقعہ جسے تم کسی کو بتانے سے گریز کرو گے؟''

''یہ آپ کوئی پادری ہو، یا یہ عیسائیوں کی طرح کوئی کنفیشن روم ہے؟''

''نہیں نہیں، مگر ایک ڈاکٹر سے تم کچھ چھپا نہیں سکتے۔ اس معاملے میں وہ ایک پادری سے بھی بڑا انسان ہوتا ہے۔''

''ان دنوں میں ہائر سیکنڈری کے امتحان کی تیاری کر رہا تھا جب میں نے ایک آٹھ سالہ بچی کی شرمگاہ کو چھونے کی کوشش کی۔''

Scanned with CamScanner

3 ایک سائیکیاٹرسٹ کا زوال

''میسل گڑھ میں وہ ہمارے آخری سال تھے۔ میرے ابا کی ریٹائرمنٹ کو صرف دو سال رہ گئے تھے اور ہم، جو شہر سے کبھی کبھار اس اجاڑ سے ریلوے اسٹیشن کے کوارٹر میں ماں کے ساتھ جایا کرتے، حیرت سے اس بغیر بنیان والے، چرکٹ جھبو دھری کی طرف تاکا کرتے جو اس دریا کا مالک تھا جو ہمارے کوارٹر کی پشت پر بہتا تھا۔ دریا میں پانی سے زیادہ کوڑے کرکٹ جمع تھے جن کے بیچ انسان، بیل گاڑیاں اور کشتیاں چلتی تھیں۔ دریا کا مالک میرے والد کو جانتا تھا جس سے ہمیں بھی بلندی کا احساس ہوتا۔ وہ دن بھر گھاٹ پر کھڑا مال ڈھونے والی کشتیوں، ریت اٹھانے والی بیل گاڑیوں، ٹریکٹروں اور ٹرکوں سے پیسے وصولتا۔ کچھ فاصلے پر شمشان گھاٹ تھا جہاں مردے جلانے والوں کو اسی سے لکڑیاں خریدنی پڑتیں اور مونڈن کرنے والا حجام اس کا اپنا آدمی تھا جو اس کا مخبر بھی تھا۔ اس نے دریا کنارے رام اوتار کا ایک مندر بھی بنا رکھا تھا جس سے اس کو اچھی خاصی آمدنی ہو جاتی۔ اسے میرے باپ کے مسلمان ہونے پر کوئی اعتراض نہ تھا بلکہ ہم لوگوں کے تیوہاروں کے موقعے پر وہ شیرینی خرید کر اپنا سے فاتحہ پڑھوانے ہمارے گھر آتا۔ اسے اس کائنات کے تمام دیوی دیوتاؤں، تمام خداؤں، تمام ان دیکھے آقاؤں میں یقین تھا۔ وہ ان تمام لوگوں سے خائف رہا کرتا اور ان کی خوشنودی حاصل کرنے کے مواقع تلاش کرتا۔

''اس کی بیوی کو مرے بیس برس ہو گئے تھے جب اس نے دو جڑواں بچیوں کو گود لیا جس میں ایک گونگی ثابت ہوئی۔ اس بار ہم ایک ہفتے کے لیے وہاں پہنچے تو میری زندگی کا سب سے اہم واقعہ میرے ساتھ پیش آیا۔ ایک دوپہر میں لکڑی کے ننگے تخت پوش پر گہری نیند سو رہا تھا جب مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میرے سارے جسم میں لطف اور مٹھاس کی ایک لہر دوڑ گئی ہو۔ یہ ایک ایسا ذائقہ تھا جسے انسان ساری زندگی میں صرف یک بار محسوس کرتا ہے اور پھر تمام زندگی اس کی تلاش میں اسے دہراتے رہنے کے باوجود کبھی اس پہلی بار کی شدت اور لطف تک پہنچ نہیں پاتا۔ تو میں اس لطف کی معراج پر تھا جب اچانک میری آنکھیں کھل گئیں اور میں نے دیکھا میری ہاف پینٹ کے اندر دونوں رانیں گیلی ہو رہی تھیں۔

''وہ میرا اسلاٹائٹ فال تھا جو دن دہاڑے پیش آیا۔

''اور وہ میری مشت زنی کی شروعات بھی تھی۔''

''اور وہ آٹھ سالہ بچی؟'' اندھیرے میں سائیکیاٹرسٹ کی آواز کانپتی ہوئی ابھری جیسے اسے اپنے کسی خدشے کے سچ ہونے کا امکان نظر آرہا ہو۔

''وہ ان دونوں میں ایک تھی۔ میں نہیں بتا سکتا کون۔''

میں نے آنکھیں کھول کر سائیکیاٹرسٹ کی طرف دیکھا۔ وہ اپنے اسٹول پر بیٹھا کافی بوڑھا نظر آرہا تھا۔ اس کے بال بکھرے ہوئے تھے اور اس کی آنکھیں گیلی ہو گئی تھیں۔ اس کی انگلیاں لرز رہی تھیں۔ میں میز پر اٹھ کر بیٹھ گیا اور پہلی بار میں نے محسوس کیا کہ بحیثیت ایک سائیکیاٹرسٹ کے وہ ناکامیاب کیوں تھا۔

''اور کوئی سوال؟''

''نہیں نہیں، تم اتنی آسانی سے یہ بات نہیں کہہ سکتے۔'' سائیکیاٹرسٹ نے اپنا سر دونوں ہاتھوں سے تھام لیا تھا۔ ''یہ اتنا آسان نہیں ہے۔''

''کیا آپ مجھے پولیس کو دینے کے بارے میں سوچ رہے ہیں؟''

''میں تمھارے واقعے کو بھلانا چاہتا ہوں۔'' اس نے جواب دیا۔ ''مگر تم میری مدد نہیں کرنا چاہتے۔ تم ایک جھوٹا واقعہ بیان کرنے پر تلے ہوئے ہو۔ تم مجھے توڑنا چاہتے ہو۔ یہ تمھاری پرانی عادت ہے، ہے نا؟''

''مجھے آپ کا رویہ ایک سائیکیاٹرسٹ سے زیادہ ایک مولوی کا لگ رہا ہے۔'' میں نے شدت سے کہا۔ ''جب ایک ڈاکٹر کسی جنسی مرض کا علاج کرتا ہے تو وہ اپنے آپ کو اس علاج تک محدود رکھتا ہے، جبکہ آپ کسی روحانی یا اخلاقی نقطۂ نظر سے میرے واقعے کو دیکھ رہے ہیں، ایک سائیکیاٹرسٹ کی طرح نہیں۔''

''میں نہیں جانتا۔'' اس نے کھڑا ہوتے ہوئے کہا۔ مگر اس کے کندھے جھکے ہوئے تھے۔ وہ لاشعوری طور پر اپنے ہاتھ مل رہا تھا۔ ''میں تمھیں ہومیوپیتھی کی کچھ خوراک دے رہا ہوں۔''

''کیا آپ کے ساتھ میرا یہ پہلا اور آخری سیشن ہے؟''

Scanned with CamScanner

''مجھے نہیں معلوم۔''

''اور یہ دوا کس لیے؟''

''میری تشفی کے لیے۔''

میں جب باہر آیا تو پلاسٹک کی پرانی گندی کرسیوں پر کئی مریض بیٹھے ہوئے تھے جبکہ نور گل لکڑی کے واحد بنچ پر اکیلا بیٹھا، پرانے مرجھائے ہوئے رسالوں کے اوراق پلٹتے ہوئے مسکرا رہا تھا۔ مگر میرے پیچھے پیچھے سائیکیاٹرسٹ کو نمودار ہوتے دیکھ کر اس کی مسکراہٹ بجھ گئی۔

''اتنی جلد وہ اس قدر کیسے بدل گیا؟ کتنا بوڑھا لگ رہا تھا'' واپسی پر اس نے حیرت اور شبہے کے ساتھ دوا کی چھوٹی شیشی کی طرف دیکھا جسے میں نے انگلیوں کے بیچ تھام رکھا تھا۔ ''تم نے اس کے ساتھ کیا کیا؟''

''میں نے اپنی لاعلمی میں اس کے فوطوں پر جوتے رکھ دیے تھے۔''

''مذاق نہیں۔''

''میں نے اس پر بیچ کا استعمال کیا۔''

''کیسا بیچ؟''

''یہ صرف ایک ڈاکٹر کے لیے ہے۔''

''پھر میں نہیں پوچھوں گا۔''

اس واقعے کے ایک ہفتے کے بعد میں نے نور گل کو دیکھا۔ وہ اپنے گھر کے باہر ایک ہائیڈرنٹ پر ٹیپ کے نیچے پانی کی دھار میں سر ڈالے جھکا ہوا تھا۔

''یہ شہر مجھے پاگل کر دے گا'' اس نے ترچھی آنکھوں سے میری طرف تاکتے ہوئے کہا۔ ''مجھے اپنے سر کو قابو میں رکھنے میں کتنی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے، تمھیں کیا معلوم۔''

''تم اس سائیکیاٹرسٹ سے رجوع کیوں نہیں کرتے؟''

''وہ سائیکیاٹرسٹ؟'' میری طرف تاکتے ہوئے اس کی آنکھیں بڑی بڑی ہو گئیں۔ ''ارے ہاں، مجھے یاد آیا۔ تم اخبار نہیں پڑھتے۔ پرسوں اس نے اپنی پانچوں بچیوں کو زہر دینے کی کوشش کی تھی۔ وہ تو پڑوسیوں کا بھلا ہو جن کی کوششوں سے وہ ساری بچا لی گئیں۔''

Scanned with CamScanner

''اور وہ سائیکیاٹرسٹ؟''

''وہ جیل کے پاگل خانے میں بند ہے۔''

4 شیشہ گلی کا ایڈونچر

ان دنوں شہر میں ایک افواہ بری طرح گشت کر رہی ہے۔ کبھی ایک آدمی تھا جس کی شیشے کی دکان تھی، مگر اسے اس گلی میں جانا پسند تھا جس میں شیشوں کی دکانیں نہ ہوں۔ وہ دکان کا مالک ہوتے ہوئے بھی نوکر کی طرح تنخواہ پاتا۔ یہ اس کے باپ کا آزمودہ نسخہ تھا جس کے ذریعے وہ اپنے بچوں کو ان کے پیروں پر کھڑا کیا کرتا۔

پھر ایک دن ایسا آیا جب اس شخص نے اپنی دکان کے تمام شیشے چکنا چور کر ڈالے۔ وہ رات رات بھر آوارہ گردی کرنے لگا۔ اس کی بیوی کسی دوسرے کے ساتھ بھاگ گئی اور اس کے دونوں بچوں کو رشتے دار اٹھا لے گئے۔ آخر کار اس کا باپ، جو چوبیسوں گھنٹے نشے میں ڈوبا رہتا، اس سے تنگ آ گیا۔ اس نے اسے اپنے روبرو پیش ہونے کا حکم دیا۔ مگر اسے صرف تین سوال کی اجازت تھی۔ اس شخص نے کئی ہفتے سوچ بچار کیا اور آخر کار اپنے باپ کے حضور پیش ہو کر درج ذیل تین سوال پیش کیے:

(الف) میرا پیدا ہونا کس کے لیے ضروری تھا؟

(ب) اتنی بڑی کائنات میں میرے نہ ہونے سے کیا فرق پڑ جاتا؟

(ج) کیا یہ ضروری ہے کہ انسان بوتل کی طرح ہمیشہ اپنے پیندے کی طرف گدا ہونے پر مجبور ہو؟

افواہ یہ ہے کہ اس کے باپ کے پاس ان تینوں بے تکے سوالوں کا کوئی تشفی بخش جواب نہ تھا۔ وہ دیر تک اپنے لڑکے کی طرف دیکھا کیا۔ بوڑھے نے شراب نوشی ترک کی اور ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ایک خانقاہ میں پناہ لی۔

اس افواہ کی تصدیق کے لیے میں نے نور گل کو صلاح دی کہ ہم دونوں اس گلی میں جائیں جہاں بشمول دوسری دکانوں کے وہ شیشے کی دکان تھی۔

Scanned with CamScanner

''اگر تم سچ تک پہنچ جاؤ گے تو پھر افواہ کی قیمت کیا رہ جائے گی؟'' نور گل نے رائے دی۔
''اس عمل سے باز آؤ۔''

''اگر وہ واقعی ہے تو میں اس آدمی سے ملنا چاہوں گا۔'' میں نے کہا۔ ''میں اس سے جاننا چاہوں گا کہ کیا وہ سچ مچ ان سوالوں سے پریشان تھا یا وہ بوڑھے سے اپنا پیچھا چھڑانا چاہتا تھا۔''

''پھر تو تمھیں اس آدمی کی تلاش ہونی چاہیے۔''

''''میرا دل کہتا ہے، وہ اپنی دکان کے آس پاس ہی کہیں پر موجود ہوگا۔''

میرا اندازہ صحیح تھا۔ ہم جب اس گلی میں پہنچے جس میں شیشوں کی دورویہ دکانیں تھیں، تو لوگوں کی بھیڑ میں چلتے چلتے ہمیں ایسا لگ رہا تھا جیسے اس آدمی کی مہک چاروں اور ہوا میں بسی ہوئی ہو۔ ہم نے ایک دکاندار سے اس دکان کا پتا پوچھا تو ہمیں یک گونہ حیرت کا سامنا کرنا پڑا، کیونکہ وہاں ہر شیشے کی دکان کی خود کی اپنی کہانی تھی۔ ہم نے اندازہ لگایا کہ چونکہ لوگ اس خاص شیشے کی دکان کی تلاش میں آنے لگے تھے، ہر دکان کو اپنی کہانی خود بنانی پڑی۔ ہمیں اس واقعے کو اتنے سارے جھوٹے واقعات میں ضم ہوتے دیکھ کر کافی افسوس ہوا، بلکہ نور گل کی آنکھوں سے تو آنسو نکل آئے۔

''مجھے پتا نہ تھا تم اتنے جذباتی انسان ہو۔'' میں نے اسے رومال پیش کرتے ہوئے کہا۔ اس وقت چونکہ سورج سوا نیزے پر آ چکا تھا، گلی کی دکانوں کے باہر رکھے تمام شیشے چمک اٹھے تھے اور ہمیں ایسا لگ رہا تھا جیسے ہم روشنیوں کے کولاژ میں تیر رہے ہوں۔

''میں جذباتی نہیں ہوں۔'' اس نے اپنا رومال نکالتے ہوئے کہا۔ ''مگر جانے کیوں اس آدمی کے خط و خال میرے سامنے ابھرنے لگے ہیں۔ وہ کیسا بدنصیب انسان ہوگا جس کی نوکری چلی گئی ہو، جس کی بیوی بھاگ گئی ہو، جس کے بچے رشتے دار اٹھا لے گئے ہوں اور جس کے باپ کو ایک خانقاہ میں پناہ لینے کے علاوہ کوئی دوسرا راستہ نظر نہ آیا ہو۔''

''ایسے ہی مقہور لوگوں سے یہ دنیا آباد ہے۔'' میں نے اپنی عالمانہ رائے دی۔ ''فرق صرف یہ ہے کہ ان میں سے ننانوے فیصد لوگ اسے تسلیم نہیں کرتے اور چپ چاپ اپنی غلامانہ ذہنیت کے ساتھ جینے پر مجبور ہیں۔''

اس گلی میں ہم دیر تک گھومتے رہے۔ ہمیں کئی بند دکانیں نظر آئیں۔ ہم نے ایک بجے کے

Scanned with CamScanner

ہجڑے کو دیکھا جس نے کافی بھاری بھرکم میک اپ کر رکھا تھا، سونے چاندی کے زیورات سے لدا ہوا تھا اور ایک قدیم طرز کا قد آدم آئینہ خرید رہا تھا۔ ہم نے ایک کتے کو دیکھا جو ایک ٹوٹا ہوا شیشہ چاٹ رہا تھا، ایک ٹریفک سرجنٹ جس کے دونوں کولھے کافی بھاری بھرکم تھے جیسے وہ تمام سرجنٹوں کی نمائندگی کر رہا ہو۔ ہمیں مرے ہوئے کیڑوں کے کیپ پہنے ہوئے دو جاپانی بھی نظر آئے جو منحنی کیمروں سے ہر اس چیز کی تصویریں لے رہے تھے جو ہمیں بالکل ہی معمولی لگ رہی تھیں۔ غرض ہم جدھر بھی نظریں دوڑا رہے تھے، یہ گلی متنوع لوگوں کی آماجگاہ نظر آ رہی تھی، صرف اس بدنصیب انسان کا دور دور تک پتا نہ تھا جس کی تلاش میں ہم نکلے تھے۔

''شاید وہ واقعی افواہ ہو،'' نور گل نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''ہم خواہ مخواہ بیوقوف بنائے گئے۔''

''لگتا ہے، تم اپنے آنسوؤں کے لیے شرمندہ ہو۔''

''بالکل بھی نہیں۔'' وہ میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر چل رہا تھا۔ ''جب جب جو کچھ ہوتا ہے اسے اس وقت کے تناظر میں دیکھنا چاہیے۔ اور ضروری نہیں کہ ہم اپنے ہر عمل کے لیے کسی دوسرے کے سامنے جواب دہ ہوں۔ اور میرے آنسو، تم ان کے بارے میں کتنا جانتے ہو؟''

اس کے بعد بھی میں اکیلا، اس گلی میں کئی بار گیا۔ مگر جانے کیوں، اس دن کی طرح، دکان کے باہر رکھے شیشوں پر سورج پھر اس طرح روشن نہیں ہوا۔

''آہ'' میں نے اس گلی سے آخری بار باہر جاتے ہوئے سوچا۔ ''کسی بھی چیز کا اسرار زیادہ دنوں تک قائم نہیں رہتا۔ جدیدیت ہر چیز کی قلعی اتار جاتی ہے۔''

5 گناہ اور ثواب کا محاکمہ

میں اور نور گل سمندر کے کنارے ریت پر ٹہل رہے تھے جب نور گل نے کہا:

''اپنے شہر سے سینکڑوں میل دور، اتنی گرمی میں، اس بے کیف ساحل پر جس کے سارے سیاح غلط ہیں، ہم لوگ کیا کر رہے ہیں؟''

''ایک شہر کی گندگی کو کھاڑی کے پانی میں ضم ہوتے دیکھ رہے ہیں۔'' میں نے آسمان کی

طرف دیکھا جو کسی وجہ سے اس دن ٹھیک سے بن نہیں پایا تھا۔

''ہمیں چاہیے تھا کہ کسی صنفِ نازک کو ساتھ لے لیتے۔'' اس نے اپنی تیوری پر بل چڑھاتے ہوئے کہا۔ ''تم نے چھٹی کا کباڑا کر دیا۔ سمندر میری جنسی خواہشات کو تیز کر دیتا ہے۔''

''اسے تم پورے معنوں میں سمندر بھی نہیں کہہ سکتے۔ یوں بھی، جہاں تک مجھے معلوم ہے، تم غیر شادی شدہ ہو اور تمھاری ایسی کوئی دوست نہیں جو تمھارے ساتھ اس طرح کی عیاشی کے لیے تیار ہو۔''

''تم کیا سمجھتے ہو، صرف تم ہی ایک برے انسان ہو؟'' نور گل نے دوبارہ تیوری چڑھاتے ہوئے کہا۔ ''اس آسمان کے نیچے اور بھی لوگ ہیں جو جہنم جانے کی تیاری کر رہے ہیں۔ اپنے آپ کو تیس مار خاں مت سمجھو۔''

''کیا جہنم جانا اتنا آسان ہے؟'' میں نے اپنے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ میرے بال دھوپ میں تپ کر سخت ہو گئے تھے۔ ''اس سے مجھے اپنے چچا کی یاد آ گئی جنھوں نے اپنے کالج کے دنوں کا ایک واقعہ سنایا تھا۔''

''اس چھتری کے نیچے بیٹھ کر ناریل پانی پیتے ہیں اور تمھاری بکواس سنتے ہیں۔''

حدِ نظر تک پھیلا ہوا پشتہ ایک خاص شکل کے پتھروں کا بنا ہوا تھا جن کے نیچے، جہاں سے ریت شروع ہوتی تھی، کئی پیراسول زمین میں گڑے تھے۔ دھوپ میں ان کا رنگ زائل ہو چکا تھا۔ ان کے نیچے پلاسٹک کی رنگین کرسیاں اور میزیں لگی تھیں۔ اس گرمی میں ساحل ویران پڑا تھا۔ ہم نے ناریل پانی اور پیپسی منگوائے۔ یہ وہ وقت تھا جب سمندر کنارے سے کافی دور چلا گیا تھا۔

''تم اپنے چچا کے کالج کے دنوں کا کوئی واقعہ سنانے والے تھے،'' نور گل نے اسٹرا سے ناریل پانی اپنے حلق کے اندر کھینچتے ہوئے کہا۔

''وہ تم نے جہنم کا ذکر کیا تھا تو مجھے یہ واقعہ یاد آ گیا۔ ان دنوں وہ علی گڑھ میں زیرِ تعلیم تھے۔ ایک دن کالج کے کینٹین میں وہ کچھ دوستوں کے ساتھ بیٹھے تھے جب اچانک جنت اور جہنم کا تذکرہ چل نکلا۔ تم تو جانتے ہو علی گڑھ میں بھانت بھانت کے جانور بستے ہیں: حد درجہ بنیاد پرست جو ساری دنیا پر اسلام کا غلبہ دیکھنا چاہتے ہیں، اس اتنی بڑی کائنات میں اپنی تنہائی پر آنسو بہانے والے ہارڈ کور ناستک، یا پھر تمھارے اور میری طرح کچھ نہ سوچنے والے گدھے۔ مگر جب مسلمان ایک جگہ

جمع ہو جائیں تو وہ کیا کریں اگر وہ مسلمان ہونے کی بھرپور نمائش نہ کریں! بلکہ اس معاملے میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے سے بھلا انھیں کوئی روک سکتا ہے۔ تو یوں ہوا کہ چچا کے کسی دوست نے کہا کہ اب کہ ان لوگوں کی بھرپور جوانی کا دور ہے تو کیوں نہ ہر فرد اب تک کی زندگی میں کیے گئے گناہ اور ثواب کا حساب کر لے۔ سبھوں نے کاغذ لیے، ان میں گناہ اور ثواب کے کالم بنائے گئے، ہر طرح کے گناہ اور ثواب کا ایک خاص نمبر طے کیا گیا۔ پہلے گناہوں کی فہرست تیار کی گئی۔ سن شعور سے کنپٹیوں کے اس لمحے تک سبھوں نے اپنی اپنی یادداشت کے کونے کھنگال کر گناہوں کی فہرست تیار کی تو وہ لاکھوں تک پہنچ گئے۔ سب کے چہروں پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔ صاف ظاہر تھا کہ انھیں جہنم سے کوئی بھی بچا نہیں سکتا تھا۔ وہ لوگ مایوس سے بیٹھے تھے جب کسی نے رائے دی کہ چونکہ مایوسی کفر ہے، کیوں نہ اپنے ثوابوں کے کالم بھی بھر لیے جائیں۔ تو سب نے فرداً فرداً یہ کام شروع کیا اور چونکہ گناہ کے مقابلے ثواب خاص خاص موقعوں پر (مثلاً شب قدر وغیرہ) سوگنا، ہزار گنا زیادہ ہو جاتے ہیں تو ان کے ثواب دیکھتے دیکھتے کروڑوں تک پہنچ گئے اور سب کے سب اچھل پڑے۔ انھیں پورا یقین ہو گیا کہ انھیں جنت جانے سے کوئی روک نہیں سکتا، کہ خدا نے سارا معاملہ ہی اس طرح بنایا ہے کہ اہل ایمان سیدھے جنت جانے پر مجبور ہو جائیں۔''

''پھر ان لوگوں نے کیا کیا؟''

''انھوں نے بھینس کے کباب کھائے اور سیدھے سینما ہال کا رخ کیا۔'' میں ہنسا۔ ''شاید اُن دنوں جوانوں کے یہ گناہ کا ارتکاب کچھ انھیں چیزوں تک محدود تھا۔''

''تمھارے چچا نے جھوٹ کہا ہوگا۔'' نور گل خود بھی ہنسا۔ ''انھوں نے کسی بار کا رخ کیا ہوگا یا کسی طوائف کے کوٹھے کی طرف گئے ہوں گے۔''

''میرا بھی یہی خیال ہے،'' میں نے جواب دیا۔ ''مگر میں صرف وہی بات کہہ سکتا ہوں جو میں نے ان سے سنی ہے۔ ورپھر مجھے اپنے چچا کے رتبے کا خیال بھی تو رکھنا ہے۔''

''اچھا تم مجھے ایک بات بتاؤ۔'' نور گل میری آنکھوں کے اندر تاک رہا تھا۔ ''اس دن سائیکیا ٹرسٹ کے ساتھ کیا معاملہ پیش آیا تھا؟''

''کچھ بھی نہیں،'' میں نے آنکھیں ہٹاتے ہوئے کہا۔ ''میں نے اپنے ایک گناہ کے ڈر سے

Scanned with CamScanner

میں اسے بتایا تھا۔ تم جاننا چاہو گے؟"

"نہیں، کبھی نہیں،" نور گل نے سر جھکا کر کہا۔ "میرے اپنے گناہ کیا کم ہیں کہ تمھارے بھی ڈھوتا پھروں۔"

"دراصل یہ اپنا جسم۔۔۔" میں نے گلاس سے پیپسی کا ایک لمبا گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔ "یہ اپنا جسم، یہ خاروخس سے بنا اپنا جسم، یہ نامراد جسم، اگر تم اس کی آواز سنتے ہو تو جہنم جاتے ہو، نہیں سنتے تو یہ تمھاری زندگی کو جہنم بنا دیتا ہے۔"

"تم نے ٹھیک کہا۔" نور گل کی آنکھوں میں پھر سے آنسو اُبل آئے۔ "ہم ساری زندگی ایک دلدل میں جینے پر مجبور ہیں۔ اب میری سمجھ میں آیا کہ وہ شیشہ گر کا ۱۰ اقعہ غلط تھا۔"

تھوڑی دیر بعد اس اتنے بڑے سمندر میں ہمیں ایک واحد کشتی دکھائی دی جسے بھاری بھرکم موجوں سے گزر کر کنارے تک پہنچنے میں عرصہ لگ گیا۔ کشتی بالکل کنارے آ گئی۔ جب وہ اب بھی ہم لوگوں سے کچھ دور تھی، تو مچھیرے گھٹنوں تک گہرے پانی میں کود کر گیلی ریت پر اسے ڈھکیلنے لگے۔ کچھ اسے سامنے کی طرف سے پکڑ کر کھینچ رہے تھے، اس کا رُخ ساحل کی طرف کر رہے تھے۔ کشتی کے استقبال کے لیے کچھ مرگھلے کتے اپنے بھوکے جبڑوں اور اتنے ہی مرگھلے بچے اپنے المونیم کے کٹوروں کے ساتھ ساحل پر جمع ہو گئے تھے۔

"یہاں ہمارا آنا بالکل بیکار گیا۔" نور گل نے ایک ٹھنڈی سانس بھری اور ناریل کو سمندر کی طرف اچھال دیا۔

"ہمارا تو آنا بھی بیکار ہی جاتا۔" میں نے جواب دیا۔

Scanned with CamScanner

شمس الرحمٰن فاروقی کی کتابیں

لغات روزمرہ
(اردو میں رائج غیر معیاری
استعمالات کی فہرست)
قیمت:250روپے

سوار اور دوسرے افسانے
(ہندوستانی ایڈیشن)
قیمت 350 روپے

ساحری، شاہی، صاحب قرانی
(داستان امیر حمزہ کا مطالعہ)
جلد اول تا سوم
قیمت 1110 روپے

آسماں محراب
(شاعری)
۱۹۷۱ سے ۱۹۹۶ تک کے کلام کا انتخاب
قیمت:315روپے

کئی چاند تھے سرِ آسماں
(ناول)
قیمت:600روپے

تنقیدی افکار
(ہندوستانی ایڈیشن)
قیمت:250روپے

افسانے کی حمایت میں
(نظر ثانی اور اضافہ شدہ اشاعت)
قیمت:240روپے

The Colour of Black Flowers
(Selected Poems)
قیمت:250روپے

Scanned with CamScanner

ساؤلی ژنگ جوشی یانگ ژن

شُوکے لیواپیچنگ گی ہونگ

سات چینی حکایات

انتخاب اور انگریزی سے ترجمہ

افضال احمد سید

Scanned with CamScanner

اس شمارے کے آخر میں سات چینی حکایات کا ترجمہ پیش کیا جا رہا ہے جن کا ترجمہ افضال احمد سید نے کیا ہے۔
انھیں ماجیاجو (Ma Jiaju) کے مرتب کردہ انگریزی مجموعے Ancient Chinese Miniature Stories سے منتخب کیا گیا ہے جو 2007 میں شائع ہوا۔ ان کی تصنیف کا عرصہ چن (Qin) شہنشاہوں کے دور (221-206 قبل مسیح) سے پہلے سے لے کر چنگ (Qing) شہنشاہوں کے دور (1644-1912) تک پھیلا ہے۔

یہ حکایتیں قدیم عالمی حکایات کی روایت سے تعلق رکھتی ہیں جن میں کوئی اخلاقی یا سیاسی سبق ہوتا ہے۔ جو بات انھیں دوسرے ملکوں کی قدیم حکایتوں سے ممیز کرتا ہے وہ یہ ہے کہ ان میں دانش و حکمت کے نکات پُرمزاح اور شگفتہ انداز میں پیش کیے گئے ہیں جس کے باعث ان کی دلپذیری بڑھ گئی ہے۔

Scanned with CamScanner

ساؤپی

ژونگ ڈنگبو بھوت کو بیچ دیتا ہے

نان یانگ کے ژونگ ڈنگبو کا، جن دنوں وہ نوجوان تھا، ایک بھوت سے واسطہ پڑا۔

''تم کون ہو؟'' ژونگ نے پوچھا۔

''بھوت ہوں۔'' بھوت بولا۔ ''اور تم؟''

''میں بھی بھوت ہوں۔'' ژونگ نے جھوٹ بولا۔

''تم کہاں جارہے ہو؟''

''وان کے بازار تک۔''

''میں بھی وہیں جارہا ہوں۔''

وہ دونوں کئی میل تک ساتھ ساتھ چلتے رہے۔

بھوت نے کہا، ''اس طرح پیدل چلتے رہنے میں بہت وقت لگ جائے گا۔ کیوں نہ ہم باری باری ایک دوسرے کو کاندھے پر اٹھا کرلے چلیں؟''

''بالکل ٹھیک!''

پہلے بھوت ژونگ کو اٹھا کر چند میل تک لے گیا۔

''تم بہت بھاری ہو۔ سچ مچ بھوت ہی تو ہو؟'' بھوت نے پوچھا۔

''میں نیا نیا بھوت بنا ہوں، اس لیے کچھ بھاری بھاری ہوں۔''

پھر ژونگ کی بھوت کو اٹھا کر چلنے کی باری آئی۔ بھوت کا تو کوئی وزن تھا ہی نہیں۔ وہ دونوں

Scanned with CamScanner

اسی طرح ایک دوسرے کو کاندھے پر باری باری اٹھائے سفر کرتے رہے۔

''کیونکہ میں تازہ تازہ مرا ہوں'' ژونگ نے کچھ سوچ کر کہا،'' مجھے نہیں معلوم کہ بھوتوں کو سب سے زیادہ کس چیز سے ڈر لگتا ہے؟''

''ہمیں جس چیز سے سب سے زیادہ خوف آتا ہے وہ انسان کا تھوک ہے۔''

وہ دونوں ساتھ ساتھ چلتے ہوئے ایک نالے کے پاس پہنچے۔ ژونگ نے بھوت کو پہلے پار اترنے کی دعوت دی۔ بھوت خاموشی سے پار کر گیا۔ ژونگ نے مگر، چھپ چھپ کر کے پار کیا۔

''تم نے کیسے اتنا شور مچایا؟'' بھوت نے استفسار کیا۔

''میں نیا نیا بھوت ہوں، ابھی پانی سے گزرنے کا زیادہ تجربہ نہیں ہے، اس لیے مجھے معاف کر دو۔''

وان کے بازار کے نزدیک آ کر ژونگ نے بھوت کو اپنے کاندھے پر اٹھا لیا اور مضبوطی سے جکڑے رکھا۔ بھوت نے نیچے اتارے جانے کے لیے بہت چیخ پکار کی، مگر ژونگ نے بالکل توجہ نہیں دی اور سیدھا بازار میں داخل ہو گیا۔ جب اس نے بھوت کو نیچے اتارا، بھوت نے ایک بھیڑ کی جون اختیار کر لی۔ ژونگ نے بلا تاخیر اسے بیچ دیا۔ وہ پہلے ہی بھوت پر تھوک چکا تھا تاکہ وہ اب کوئی اور شکل نہ اختیار کر سکے۔

اس طرح ایک ہزار پانچ سو سکے کما کر ژونگ بازار سے واپس آیا۔

بدخط تحریر

وزیراعظم ژنگ کو لکھنے میں بہت مزہ آتا تھا، مگر اس کی تحریر کو بدخطی کی وجہ سے پڑھنا مشکل تھا۔ اس کے تمام دوست اس کی تحریر کا مذاق اڑاتے تھے، مگر اسے ان کی کوئی پروا نہیں تھی۔

ایک دن اسے ایک خیال آیا۔ اس نے اسے تحریر کرنے کے لیے فوراً قلم گھسیٹا۔ کاغذ طرح طرح کے حروف سے بھر گیا۔ پھر اس نے وہ کاغذ اپنے بھتیجے کو صاف صاف نقل کر کے لانے کے لیے دیا۔

نقل کرتے وقت بھتیجا ایک بدخط لفظ تک پہنچا اور پریشان ہو کر اس نے لکھنا بند کر دیا۔ پھر وہ کاغذ اٹھا کر اپنے چچا کے پاس لایا اور اس سے پوچھا:

''یہ کون سا لفظ ہے؟''

وزیراعظم نے کافی دیر تک کاغذ کو غور سے دیکھا، مگر وہ بھی اسے پڑھنے میں کامیاب نہیں ہوا۔ اس نے بھتیجے کو ڈانٹتے ہوئے کہا:

''بدمعاش! تم نے میرے بھول جانے سے پہلے اس لفظ کو کیوں نہیں پوچھا؟''

Scanned with CamScanner

قحط کی خبر

ایک شخص نے ایک حاکم کو قحط کی خبر پہنچائی۔

حاکم نے پوچھا: "تمھاری گندم کی فصل کتنی تھی؟"

"عام پیداوار کا تیس فیصد،" اس شخص نے جواب دیا۔

"کپاس کی؟"

"بیس فیصد۔"

"چاول کی؟"

"بیس فیصد۔"

حاکم طیش میں آ گیا۔

"تمھارے پاس اب بھی ستر فیصد فصل موجود ہے، پھر بھی تم قحط کی بات کر رہے ہو!"

اس شخص نے کہا، "جناب عالی، میں نے اپنی سو سال اور کئی بیسیوں کی عمر میں ایسا شدید قحط نہیں دیکھا ہے۔"

"تمھاری عمر کس طرح اتنی لمبی ہو سکتی ہے؟" حاکم نے پوچھا۔

"دیکھیے، میں ستر سال سے زیادہ کا ہوں۔ میرا بڑا بیٹا چالیس سے زیادہ کا ہے، اور میرا دوسرا بیٹا تیس سے اوپر۔ ان سب کو جوڑ کر سو اور کئی بیسی سال بنتے ہیں۔"

تمام حاضرین یہ سنتے ہی بے اختیار ہنسنے لگے۔

❁❁

Scanned with CamScanner

یہ سب آپ کے وفادار ہیں

چنگ خاندان کے شہنشاہ گاؤ زونگ (1711-1799) نے شاہی بجرے پر دریا ے واہی کے ساتھ ساتھ جنوب کے علاقوں کا دورہ کیا۔ کھڑکی سے وہ کسانوں کو کھیتوں میں کام کرتے دیکھ دیکھ کر خوش ہو رہا تھا۔ اس نے پہلے کبھی کھیت اور کسان نہیں دیکھے تھے۔

شان دونگ صوبے کے ایک قصبے میں پہنچ کر اس نے ایک کسان کو اپنی کشتی میں طلب کیا تا کہ اس سے سوال کر کے لوگوں کی خوش حالی اور بد حالی کا اندازہ لگا سکے۔

اس نے اس سال کی فصل، اسے حاصل کرنے میں لگی محنت اور مقامی حکام کے رویے کے بارے میں سوالات کیے۔ کسان کے جوابوں نے اسے بہت حد تک مطمئن کر دیا۔

پھر شہنشاہ نے کسان کو اپنی خدمت میں حاضر حکام کا جائزہ لینے اور ان سے ان کے نام دریافت کرنے کو کہا۔

حکام، یہ جانتے ہوئے کہ کسان جہاں پناہ کے حکم پر ان سے سوال کر رہا ہے، اپنے اصلی نام چھپانے کی جرأت نہ کر سکے۔ کئی حاکم اس خوف سے بری طرح لرز رہے تھے کہ شاید کسان عوامی آرا شہنشاہ تک پہنچا دے گا جس کے بعد شہنشاہ ان سے سختی سے پیش آئے گا۔

ان حکام کے چہروں کو غور سے دیکھنے کے بعد کسان نے شہنشاہ سے کہا، "یہ سب آپ کے وفادار ہیں۔"

جہاں پناہ نے پوچھا، اسے کیسے اندازہ ہوا۔ اور اس کا جواب تھا:

Scanned with CamScanner

''میں نے زونگیوں میں غدّار درباری حاکموں کو دیکھا ہے، جیسے ساؤ ساؤ اور ہین گوئی، جن کے چہروں پر برف جیسا سفید لیپ ہوتا ہے۔ اب چونکہ آپ کا کوئی حاضرِ خدمت حاکم اس طرح نہیں نظر آ رہا ہے، میں کہہ سکتا ہوں کہ یہ سب آپ کے وفادار ہیں۔''

شہنشاہ پر ہنسی کا دورہ پڑ گیا۔

❀❀

وانگ رونگ: ایک ذہین لڑکا

جب وانگ رونگ (234-305) سات سال کی عمر کا تھا، ایک بار وہ دوسرے بچوں کے ساتھ کھیل رہا تھا کہ انھیں ایک آلو بخارے کا درخت سڑک کے پاس نظر آیا جو پھلوں سے اتنا زیادہ لدا ہوا تھا کہ اس کی شاخیں جھک کر زمین کو چھو رہی تھیں۔ تمام بچے اس کے گرد جمع ہو گئے کہ آلو بخارے توڑیں، سوائے وانگ رونگ کے۔

اس سے پوچھا گیا کہ وہ کیوں نہیں درخت کے پاس آتا۔ اس نے جواب دیا:

"یہ درخت بالکل سڑک کے کنارے ہے۔ یہ کیسے ممکن ہوا کہ یہ پھلوں سے اس قدر بھرا ہوا رہ گیا؟ اس کے پھل ضرور کڑوے ہوں گے۔"

لڑکوں نے اسے بے اعتباری سے دیکھا۔ مگر پھل کو چکھنے کے بعد وہ سب قائل ہو گئے۔

❁❁

گی ہونگ

صوبیدار ما اور عطائی

جن دنوں ژنگو کا صوبیدار ما اپنے عہدے پر برقرار تھا، اس کا ایک رشتے دار اس کے پاس آیا اور مدد کا طلبگار ہوا۔ ما نے کہیں پر اس کے ٹھہرنے کا بندوبست کیا اور لوگوں کو بتایا کہ یہ شخص ایک تاؤ بھکشو ہے جو بیماریوں کا فوری علاج کرنے کی روحانی استطاعت رکھتا ہے۔ پھر ما نے ایک چرب زبان شخص کو بازار میں افواہ پھیلانے کا کام سونپ کر بھکشو اندھوں کو بینائی عطا کرسکتا ہے اور لنگڑوں کو دوڑا سکتا ہے۔ پھر کیا تھا، ہر طرف سے لوگ ٹوٹنے پڑنے لگے۔ بھکشو کے ہاتھ لگنے والی رقم زیادہ سے زیادہ ہوتی گئی۔

بھکشو نے اپنے سادہ لوح مریضوں کو پابند کیا کہ اگر وہ صحت یاب نہ بھی ہوئے ہوں، انھیں خود کو صحت یاب ظاہر کرنا ہوگا، کیونکہ اس طرح وہ کچھ عرصے کے بعد خود بخود صحت مند ہو جائیں گے۔ اور اگر انھوں نے خود کو صحت مند ظاہر نہیں کیا، وہ کبھی ٹھیک نہیں ہوں گے۔ اس نے انھیں یقین دلایا کہ یہ بھی معالجے کے اصولوں میں سے ایک ہے جس پر انھیں لازمی طور پر اعتبار کرنا ہوگا۔

اس طرح، جب ایک مریض سے دوسرا مریض اس کی حالت کے بارے میں پوچھتا، پہلا یہی جتلاتا کہ وہ ٹھیک ہے، کیونکہ سچ بتانے کی ہمت کسی میں نہ ہوتی۔

کچھ ہی دنوں میں اس عطائی نے خوب دولت جمع کرلی۔

❁❁

Scanned with CamScanner

ایک حسینہ کا المیہ

ہان خاندان کے شہنشاہ یوان (48-33 قبل مسیح) کے حرم میں اتنی زیادہ داشتائیں اور خواصیں تھیں کہ وہ ان سب کو یاد نہیں رکھ پاتا تھا۔ اس لیے اس نے مصوروں کو ان کی شبیہیں بنانے کا حکم دیا، اور وہ ان تصویروں سے انتخاب کر کے انھیں اپنی خوابگاہ میں طلب کرنے لگا۔

تمام داشتاؤں اور خواصوں نے مصوروں کو رشوتیں دی تھیں کہ جہاں تک ممکن ہو، ان کی تصویریں خوب سے خوب تر بنائیں۔ سب سے بڑی پیشکش ایک لاکھ تانبے کے سکّے اور کم ترین بھی پچاس ہزار سے کم نہیں تھی۔ لیکن وانگ چیانگ (زھاؤجن) ایسا کرنے پر آمادہ نہیں ہوئی، اور اس طرح وہ کبھی بھی شہنشاہ کی خوابگاہ کے لیے طلب نہیں کی گئی۔

ایک دن ملک ہُن کے بادشاہ کا ایلچی دربار میں حاضر ہوا اور شہنشاہ سے درخواست کی کہ اس کے حرم سے کسی حسینہ کو ہُن کی ملکہ بنانے کے لیے لے جانے کی اجازت دی جائے۔ تصویروں کو دیکھ کر شہنشاہ یوان نے زھاؤجن کو دیے جانے کا فیصلہ کیا۔ جب وہ رخصت ہو رہی تھی تو شہنشاہ کی اس پر نظر پڑی اور وہ اسے حسن و جمال میں اپنی کسی بھی داشتہ اور خواص سے بڑھ کر نظر آئی۔ اس نے اس سے کچھ سوال کیے اور اسے حاضر جواب بھی پایا۔

شہنشاہ نے اس کو دیے جانے کے فیصلے پر بہت تاسف کیا۔ مگر ہُن کے بادشاہ کے ساتھ معاہدہ تکمیل پا چکا تھا اور شہنشاہ غیر ملکیوں کے ساتھ ہمیشہ اپنے وعدے کا پابند تھا۔ اس نے اپنا فیصلہ تبدیل نہیں کیا، مگر اس نے معاملے کی تحقیق کرائی اور تمام مصوروں کا سر اڑا دیا گیا۔ ان کے گھروں کی تلاش

Scanned with CamScanner

کے بعد کثیر دولت بھی دستیاب ہوئی۔

مارے جانے والوں میں وو لنگ کا ماؤ یانشو بھی شامل تھا، جو خصوصی طور پر ایسی شبیہیں بنانے میں مہارت رکھتا تھا جن میں اصل شخص سے حیرت انگیز مماثلت ہوتی تھی، چاہے وہ خوبصورت ہو یا بدصورت، جوان یا عمر رسیدہ۔ دوسرے مصور، جیسے اَنلنگ کا چن چانگ، لیو بائی اور شن فنگ کا گونگ کوان، جو مویشیوں، گھوڑوں اور پرندوں کی ہر انداز میں، اور ساتھ ساتھ انسانوں کی تصویروں بنانے میں اچھی دسترس رکھتے تھے، اگرچہ وہ ماؤ کے ہم پلہ نہیں تھے۔ یشادو کا یان وانگ بھی ایک شاندار مصور تھا، خاص طور پر رنگین تصاویر بنانے میں بے مثال، اسی طرح فان یو بھی۔

چونکہ وہ سب ایک ہی وقت میں مارے گئے تھے، اس کے بعد دارالحکومت میں اچھے مصور کا ملنا مشکل ہو گیا تھا۔

❁❁

Scanned with CamScanner

آج کی کتابیں

کہانیاں

آئینۂ حیرت اور دوسری تحریریں	سید رفیق حسین	375.Rs
عطرِ کافور	نیر مسعود	80.Rs
نربدا اور دوسری کہانیاں	اسد محمد خان	Rs.180
خطِ مرموز	فہمیدہ ریاض	Rs.100
ایک اور آدمی	حسن منظر	Rs.85
عاقبت کا توشہ	نکہت حسن	Rs.85
دور کی آواز	فیروز مکرجی	Rs.150
صحرا کی شہزادی	سکینہ جلوانہ	Rs.120

کہانیوں کے ترجمے

ایرانی کہانیاں	انتخاب اور ترجمہ: نیر مسعود	Rs.90
عربی کہانیاں	ترتیب: اجمل کمال	Rs.180
ہندی کہانیاں (جلد 1)	ترتیب اجمل کمال	Rs.180
ہندی کہانیاں (جلد 2)	ترتیب: اجمل کمال	Rs.180
ہندی کہانیاں (جلد 3)	ترتیب: اجمل کمال	Rs.180
کارل اور اینا	(منتخب ترجمے) محمد سلیم الرحمن	Rs.80
گم شدہ خطوط	(منتخب ترجمے) محمد عمر میمن	Rs.90
مہرِ سکوت	(منتخب ترجمے) زینت حسام	Rs.120
کلی منجارو کی برفیں	(منتخب ترجمے) محمد خالد اختر	Rs.120

Scanned with CamScanner

انتخاب

منتخب تحریریں	نرمل ورما	ترتیب: اجمل کمال	Rs.280
منتخب کہانیاں	ویکوم محمد بشیر	ترتیب: مسعود الحق	Rs.180
پریم وانی	میرابائی	ترتیب: سردار جعفری	Rs.395
کبیر بانی	کبیر	ترتیب: سردار جعفری	Rs.395

ناول

بیس سو گیارہ	محمد خالد اختر	70.Rs
گنگا جمنی میدان	اختر حامد خاں	Rs.120
دائرہ	محمد عاصم بٹ	Rs.100
نمبردار کا نیلا	سید محمد اشرف	Rs.60

ناولوں کے ترجمے

تمس	بھیشم ساہنی	ترجمہ: شہلا نقوی	Rs.180
قلبِ ظلمات	جوزف کونریڈ	ترجمہ: محمد سلیم الرحمٰن	Rs.80
بوف کور	صادق ہدایت	ترجمہ: اجمل کمال	(زیرِ طبع)
خیمہ	میرال طحاوی	ترجمہ: اجمل کمال	Rs.75
نوکر کی قمیض	ونود کمار شکل	ترجمہ: عامر انصاری، اجمل کمال	Rs.100
پہلی بارش	خولیو لیاماز اریس	ترجمہ: اجمل کمال	Rs.95
سرزمینِ مصر میں جنگ	یوسف القعید	ترجمہ: اجمل کمال	Rs.125
درخت نشین	اتالو کلوینو	ترجمہ: راشد مفتی	Rs.175
شہزادہ احتجاب	ہوشنگ گلشیری	ترجمہ: اجمل کمال	Rs.70
آگ کے دیس میں	دلاس سارنگ	ترجمہ: گوری پٹوردھن، اجمل کمال	Rs.150
امید اور دوسرے خطرناک مشاغل	لیلیٰ العثمٰی	ترجمہ: محمد عمر میمن	Rs.100
تبادلہ	وبھوتی نارائن رائے	ترجمہ: ثریا علوی	Rs.200

Scanned with CamScanner

شاعری

پریم وانی	میرابائی	ترتیب: سردار جعفری	Rs.395
کبیر بانی	کبیر	ترتیب: سردار جعفری	Rs.395
کلیات اختر الایمان	اختر الایمان	ترتیب: سلطانہ ایمان، بیدار بخت	Rs.350
مٹی کی کان	افضال احمد سید	(کلیات)	Rs.500
روکوکو اور دوسری دنیائیں	افضال احمد سید		Rs.50
آدمی کی زندگی	فہمیدہ ریاض		Rs.70
ساری نظمیں	ذی شان ساحل	(کلیات)	(زیر طبع)
جنگ کے دنوں میں	ذی شان ساحل		Rs.125
ای میل اور دوسری نظمیں	ذی شان ساحل		Rs.150
نیم تاریک محبت	ذی شان ساحل		Rs.100
رات	سعید الدین		Rs.50
سائے چراغ کے	احمد عظیم		Rs.150
مٹی کا مضمون	فرخ یار		Rs.150
سویرے کا سیاہ دودھ	پاؤل سیلان	ترجمہ: آفتاب حسین	Rs.150
بارہ ہندوستانی شاعر	(انتخاب)	ترتیب: اجمل کمال	(زیر طبع)
خودکشی کے موسم	زاہد امروز		Rs.120
ریت پہ بہتا پانی	قاسم یعقوب		Rs.160
زندگی میرے پیروں سے لپٹ جائے گی	تنویر انجم		Rs.350
بے یقین بستیوں میں	علی اکبر ناطق		Rs.150

Scanned with CamScanner

سہ ماہی ادبی کتابی سلسلے ''آج'' کی اشاعت ستمبر 1989 میں کراچی سے شروع ہوئی اور اب تک اس کے 69 شمارے شائع ہو چکے ہیں۔ ''آج'' کے اب تک شائع ہونے والے خصوصی شماروں میں گابریئل گارسیا مارکیز، ''سرائیوو سرائیوو'' (بوسنیا)، نرمل ورما، اور ''کراچی کی کہانی'' کے علاوہ عربی، فارسی اور ہندی کہانیوں کے انتخاب پر مشتمل شمارے بھی شامل ہیں۔

''آج'' کی مستقل خریداری حاصل کر کے آپ اس کا ہر شمارہ گھر بیٹھے وصول کر سکتے ہیں اور ''آج کی کتابیں'' اور ''سٹی پریس'' کی شائع کردہ کتابیں 50 فیصد رعایت پر خرید سکتے ہیں۔
(یہ رعایت فی الحال صرف پاکستانی سالانہ خریداروں کے لیے دستیاب ہے۔)

چار شماروں کے لیے شرح خریداری (بشمول رجسٹرڈ ڈاک خرچ)
پاکستان میں: 700 روپے
بیرون ملک: 70 امریکی ڈالر

آج کے کچھ پچھلے شمارے محدود تعداد میں دستیاب ہیں

اس کے علاوہ ماہنامہ ''شب خون'' الٰہ آباد
کے بھی کچھ پچھلے شمارے محدود تعداد میں دستیاب ہیں

Scanned with CamScanner

مجموعہ فرحت اللہ بیگ

(جلد اول تا پنجم)

مرتب: اجمل کمال

قیمت فی جلد: 495 روپے

افسانے کی تلاش

یر مسعود

بمت:240 روپے

ندیدی

حسن منظر

قیمت:200 روپے

ضورِ خدا

رشد محمود

ست:200 روپے

تعلیم اور ہماری قومی انجمنیں

ارشد محمود

قیمت:300 روپے

یلاب ڈائری

عت اللہ خان

ت:400 روپے

تہذیبی نرگسیت

مبارک حیدر

قیمت:150 روپے

یہ تمام مطبوعات سٹی پریس بک شاپ سے دستیاب ہیں۔

Scanned with CamScanner

۱۷

قیمت

۲۸۰ روپے

آج کی کتابیں

۳۱۶ مدینہ سٹی مال، عبداللہ ہارون روڈ،
صدر، کراچی ۷۴۴۰۰

Scanned with CamScanner